شکار بیتی

قمر نقوی

مقبول اکیڈمی
۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

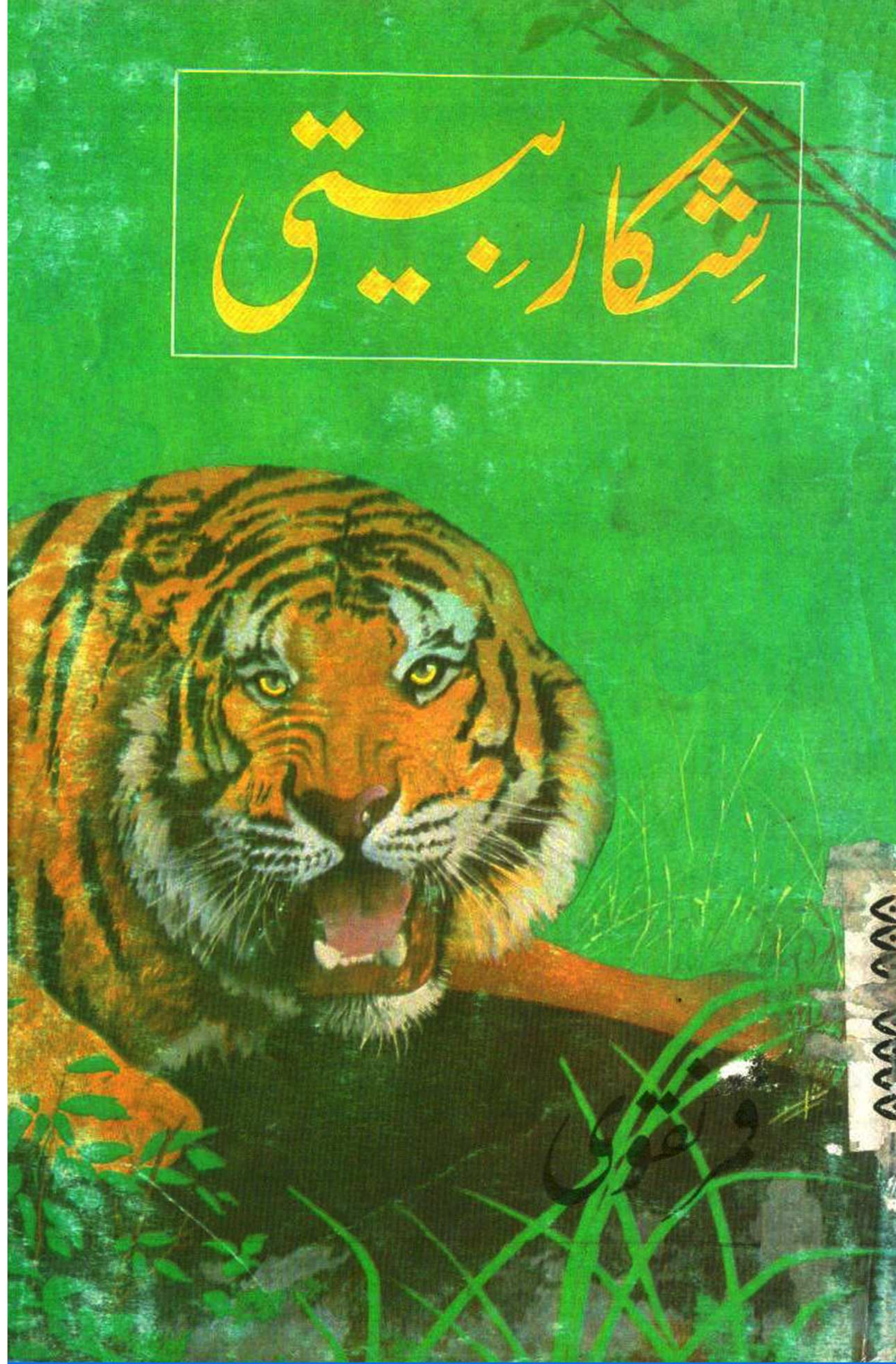

http://updf.weebly.com

شکار بیتی

زرافہ

افریقہ کا عجیب الخلقت جانور

جملہ حقوق محفوظ

اہتمام ــــــ ملک مقبول احمد
مطبع ــــــ احمد سجاد آرٹ پریس موہنی روڈ لاہور
قیمت ــــــ ۹۰/- روپے

مقبول اکیڈمی، لاہور

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ترتیب

شکاریات
اچھاور کا آدم خور
نلگنڈے کا آدم خور
مادھوپور کا آدم خور

شکاریات

جب بھی بات شروع ہوتی ہے اسی طرح ہوتی ہے۔ اور یہی بہترین اصل آغاز ہے جو عمل اللہ جل جلالہ اور رحمۃ اللعالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے شروع نہ کیا جائے اس کا بہ احسن وجوہ اختتام کو پہونچنا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کی عنایت رحم اور مدد کے طفیل ہی میں بہ حفاظت ان مشکل اور خطرناک مراحل سے گذرا جن پر پہنچ کر حیات و موت کے مابین فاصلہ صرف ایک سیسے کی گولی کے برابر رہ جاتا ہے۔

یہ قصے، ماضی کی لامحدود وسعتوں میں گم ہو چکے ہیں — اب نہ شکار کی وہ کثرت اور فرصت کے وہ اوقات میسر ہیں جو تیس چالیس سال پہلے تک ہوا کرتے تھے، نہ دورِ جدید میں جانوروں کو ہلاک کرنے کی وہ ضرورت موجود ہے جس کے تحت شیر اور چیتے کا بعض حالات میں مارنا ضروری ہو جاتا تھا حتیٰ کہ خود حکومت ان درندوں کی ہلاکت کے لیے بیش قرار انعامات مقرر کرتی تھی۔

http://updf.weebly.com

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

یہ کتاب شیروں کے بارے میں ہے۔

لیکن اگر صرف شیر تک محدود رکھی جائے تو یہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتا کہ آخر شیروں کی تعداد کا اتنا کثیر ہونا کس وجہ سے تھا۔

شیر — اور چیتا — گوشت خور درندے ہیں — اور ان کی بقا گوشت کی فراوانی پر منحصر — تیس سال قبل جنگلوں کی قطع برید اس وسیع پیمانے پر نہیں ہوتی تھی جتنی اب ہے — اگرچہ اس زمانے میں، ہر قسم کی پخت و پز کے لیے لکڑی ہی ایندھن کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ عمارتی ضروریات کے لیے بھی لکڑی لازم تھی — فرنیچر کے لیے بھی لکڑی کی ضرورت ہوتی تھی۔

لیکن —

آبادی کم تھی — آج کی طرح جنگلوں کو کاٹ کر فیکٹریاں، بند اور زراعتی فارم قائم نہیں کیے جا رہے تھے۔

اب جنگلوں کا رقبہ بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ جن جنگلوں میں چرندے اور درندے رہا کرتے تھے اب وہاں آبادیاں، اور فارم وجود میں آ گئے ہیں۔

اب تو کسی وسیع میدان میں سو دو سو ہرن یکجا نظر نہیں آتے۔ کسی درخت کے سائے میں بیس پچیس چیتل آرام نہیں کرتے۔ کسی گھاس کے خطے میں

سانبھروں کے منڈ نظر نہیں پڑتے۔ کسی دلدل میں بارہ سنگھوں کے غول نہیں دیکھے جا سکتے۔ کسی جھاڑی میں دو چار چکارے نہیں ملتے۔

جب چرندوں کی تعداد میں کمی آ گئی ہو تو درندے قدرتاً کم ہوتے جائیں گے۔

تیس چالیس سال پہلے بھوپال کے اطراف میں جنگلوں اور ان جنگلوں میں جانوروں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ میں نے شہر سے صرف دو تین میل کے فاصلے پر شملہ پہاڑی کے نیچے ہرن اور چیتل شکار کیے ہیں۔ اب وہاں سے میلوں دور تک شکار کا نام و نشان نہیں ہے۔ بھد بھدے کے پیچھے جنگل ہی جنگل تھے اور چیتے تک آ جاتے تھے، اب وہاں کچھ بھی نہیں — جہلم میں ترڑ کی کے ریلوے اسٹیشن سے صرف ایک میل کے فاصلے پر میں نے ہڑیال شکار کیے ہیں۔ اب وہاں شکار کے قابل جانوروں کا قحط ہے۔

غریب وال، ٹیلا جوگیاں، ہرن پور، مظفر گڈھ، بہاولپور شکار کی بہترین جگھیں ہوا کرتی تھیں اب کچھ بھی نہیں۔

وہ زمانہ گذر گیا — اب تو دنیا کے عظیم ترین شکار گڈھ — سرنگٹی کے جانور بھی مفقود ہو جانے کو ہیں — مسایا قبیلے کے افراد کی تعداد روز افزوں ہے اور یہ لوگ جنگلی زندگی ترک کر کے آبادیوں کے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ اور اپنے مویشی کے لیے نئی نئی بہتر چراگاہیں چاہتے ہیں، نتیجتاً جنگلی جانوروں پہ زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے — وہ علاقہ جو سرنگٹی کے لیے مخصوص کیا گیا تھا اس میں سے ایک بڑا ٹکڑا مسائی قبیلے کو دیا گیا ہے جہاں انہوں نے اپنے مویشیوں کیلئے چراگاہیں بنا لیں۔

میرے شکار کا زمانہ صحیح معنوں میں تو ۱۹۴۰ء میں شروع ہوا۔ اس وقت میں بارہ تیرہ سال کا تھا — اور اپنے ان بزرگ اعزا کے ساتھ شکار پہ جاتا تھا جو اپنا بیشتر وقت جاگیروں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ شیر و شکار میں گذارتے تھے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ان بزرگوں میں میرے خالو — رحیم الدین حسن صاحب۔ وہ مشہور و معروف ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے جنھوں نے ممالک متوسط کے کئی خطرناک ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے انعامات حاصل کیے تھے۔ وہ اپنے وقت کے بڑے شکاری بھی تھے — میرے شکار کے ابتدائی دور میں وہ کلیا کھیڑی تعینات تھے۔ اور میں ہر چھٹی کے موقع پر وہیں جا کر ان کے ساتھ شکار میں شامل رہتا۔

جعفر چچا — حافظ علی خاں — سردار خان — قاضی جلیل — عبدالحلیم خاں۔ اور سب سے بڑھ کر میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی عظیم الدین جو دیہہ گانوں کے تھانیدار تھے۔

اب وہ لوگ کہاں —!

البتہ رحیم الدین خالو مجھے نشانے بازی ضرور سکھا گئے۔

پہلے تیتر کا نشانہ — کھیتوں میں رستا پھیرا جاتا۔ تیتر اُڑتے اور مجھے حکم یہ تھا کہ دو نالوں کے فائر سے کم از کم دو تیتر تو ضرور گریں۔ اور گرتے تھے — اکثر گرتے تھے۔ ادھر تیتر پھڑ پھڑا کر اُڑے اُدھر میں نے نشانہ لیا۔ تیتر اوپر آ کر ٹھہرا اور فائر ہوا — پھر دوسرا فائر ہوا — اور دو تیتر گرے —

پھر خرگوش کا شکار ہوا — خرگوش جھاڑی سے نکلتے ہی ایسی تیزی سے رخ بدلتا ہے کہ نشانہ لینا مشکل ہو جاتا ہے — مجھے حکم ملتا کہ پانچ گز کے اندر فائر ہونا ہے۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خرگوش اپنی جگہ پر پلٹ نہ گیا ہو۔

اور آگے بڑھ کر — عظیم بھائی — اور سردار خان — شملہ پہاڑی کے نیچے کوئی میل بھر آگے۔ جہاں بڑے تالاب کا آخری سرا دلدل اور گھاس کے گیلے میدان میں بدل جاتا تھا — اس ترائی میں اسنائپ پر فائر کراتے — سنائپ کا شکار بڑا مشکل کام ہے۔ یہ پرندے جسامت کے اعتبار سے مختصر — سرعت کے اعتبار سے برق رفتار — اور پھر سرعت بھی وہ جو ہر لمحہ رخ بدلتی ہو — سیدھی پرواز تو اس کی فطرت میں شامل ہی نہیں — اس پر نشانہ لینے کے لیے بندوق کو بھی ساتھ ساتھ حرکت

دے کر زاویے نگاہ میں رکھنے اور چشم زدن سے بھی کم عرصے میں فائر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے — میرا اسکور پچھتر فیصد تھا — اور کچھ ایسا ہی رہا —

ایسا بھی ہوا — ایک بار رائسین کے شکار میں ہم لوگ بیل گاڑیوں پر گاؤں جا رہے تھے۔ ایک جگہ ٹھہر کر چائے پینے لگے — کوئی دو سو ڈھائی سو گز پر ہرنوں کا ایک منڈا بھاگتا ہوا گذرا — چھوٹے بھائی نے مجھے پکارا — اور بولے اس میں کا اگلا ہرن گرا دو تو سمجھیں کہ نشانہ پختہ ہو گیا — حال یہ کہ رائفل گاڑی میں رکھی تھی جو مجھ سے دس بارہ گز پر تھی — میں نے لپک کر رائفل اُٹھائی اور وہیں کھڑے کھڑے نشانہ لیا — اب ہرن ممکن ہے تین سو گز تک پہنچ گئے ہوں — میں نے فائر کیا اور — الحمد للہ — ہرن اپنی جگہ ہی گر گیا — اس "کارنامے" پر مجھے ایک عدد تھرٹی اسپرنگفیلڈ رائفل نذر دی گئی۔

مرحوم نہیم بھائی جس سال میرے ساتھ دیہہ گانوں گئے اس سال وہاں نیل گائے بکثرت تھے اور میں نے عظیم بھائی کے اصرار پر وہاں ایک ہفتے میں تین نیل گائے مار کر تھانے کے سپاہیوں اور گاؤں کے مسلمان دیہاتیوں کی ضیافت کی۔

شکار میں جو میرے احباب وقتاً فوقتاً ساتھ رہے ہیں۔ ان میں سے کسی سے اب میرا رابطہ نہیں رہا اور نہیں معلوم وہ سب کدھر گئے — نوشاہ، اختر، امیر خاں نسو، حبیب، ذوالفقار، سلیم وہ دوست ہیں جو کئی بار بڑے شکاروں میں ساتھ رہے۔ ان میں صرف حبیب خاں شیر کے شکاری تھے لیکن مچان پر بیٹھنے اور ہانکہ کرانے کی حد تک — یہ ضمیر کے ساتھ بھی شکار کھیلتے رہے۔

صلاح الدین میاں — جن سے العین میں ملاقات ہو گئی — بتاتے تھے کہ ضمیر میاں مرحوم، جو منصب علی کے نواسے اور قاضی جلیل کے بیٹے تھے، بھوپال میں شکار بڑے کر و فر کے ساتھ کھیلتے تھے۔ حبیب خان ان کے بھی دوست تھے — ضمیر میاں جنگل میں جاتے تو بڑی شان و شوکت کے کیمپ لگائے جاتے تھے اور ان کے خود غرض احباب کے غول ساتھ ہوتے — ان احباب نے ہی ضمیر میاں کو کھا لیا۔ صلاح الدین نے ہی بتایا کہ ضمیر میاں — جو بھوپال کے ایک رئیس خاندان کے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

فرد تھے، آخر وقت میں بڑی بے بسی اور بیچارگی کے ساتھ ختم ہوئے۔ گو ان کی عمر زیادہ نہ تھی۔

منصب علی صاحب کے خاندان سے اور ہمارے خاندان سے کافی قریبی اور مخلصانہ مراسم رہے۔ البتہ وہ مراسم ان کی زندگی تک ہی محدود تھے۔ مگر ان کے پوتے جعفر میاں، جو لاہور میں مقیم اور میرے بھائیوں جیسے ہیں۔ انھوں نے پرانے مراسم کو اسی طرح قائم رکھا اور اسی خلوص سے ملتے ہیں جو ہونا چاہیئے۔

میرے پاس اس زمانے میں ایک کوڈک کا فولڈنگ کیمرہ تھا جو دو اعشاریہ آٹھ کی طاقت کے لینس کا تھا۔ کثرت استعمال اور گذران زمانہ سے اس کے lense کا پالش ہی غائب ہو گیا لہٰذا بعد میں ایک عرصے تک تصویریں خراب آتی رہیں۔ کسی موقعے پر ایک فوٹوگرافر کو دکھایا تو اس نے بہت عمیق معائنے کے بعد بتایا کہ اس کے لینس کی کوٹنگ ختم ہو گئی اور بیکار ہو گیا۔ چنانچہ وہ کیمرہ کباڑ میں ڈال دیا گیا تا آنکہ غائب ہو گیا۔

اس کتاب میں جو تصاویر شامل ہیں ان میں سے اکثر اسی کیمرے سے کھینچی ہوئی ہیں۔ میں جب ہندوستان جاتا تو یہ کیمرہ ساتھ لے جاتا۔ پاکستان میں بھی یہی ساتھ رہتا۔ جو لوگ پاکستان میں شکار میں میرے ساتھ رہے ہیں ان میں سر فہرست تو ابو خورشید حقانی کا نام ہے — اس کے بعد ڈاکٹر ذوالفقار — میں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ چار سال جب کہ میں شالامار ٹاؤن میں مقیم رہا، ڈاکٹر سیف اللہ ذوالفقار میرے ساتھ سنیچر اور اتوار کو شکار پر جاتے — یوں کبھی عام دنوں میں وہ بیچارے اپنی طبابت اور مطب چھوڑ کر اکثر شام کو میرے ساتھ لکھو ڈیرا اور داروغہ والا، یا جلو موڑ کے آگے ترائی میں، تیتر، مرغابی، بٹیر اور سارس کے شکار پر جاتے — ان کا نشانہ برا نہیں ہمت والے آدمی ہیں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

میں اس زمانے میں بھی یو ایس اے آئی ڈی میں ملازم تھا اور شکار کی بڑی آزادی میسر تھی — ایک بار تو میرے یو ایس ایڈ کے ساتھیوں نے چھانگا مانگا میں پک نک

اور شوٹنگ کا پروگرام بھی بنایا — ہم لوگ سنیچر کے دن صبح ہی صبح چھانگا مانگا کے ریسٹ ہاؤس میں جا کر مقیم ہو گئے — کیا زمانہ تھا اور کیسے بے فکر اور اچھے ساتھی تھے — مصطفیٰ، بیگ، چغتائی، اشرف، افضل، چھوٹا قریشی، اسلم، یوسف، کامران، شفیق جمیل اور نجانے کتنے لوگ جن کے نام بھی اب یاد نہیں رہے — دو روز ہم نے وہاں گذارے۔ دونوں دن سور کے شکار پر بھی نکلے مگر اتنے ہجوم میں سور آ کر کیا کرتا۔

پھر — شالامار ٹاؤن میں ہی ہماری ایک "ٹولی" بن گئی تھی — میں، شاہ جی، منیر، ذوالفقار — ہم تین پڑوسی ہی تھے — ذوالفقار باغبان پورے میں رہتے تھے۔ لیکن ان کا مطب ہمارے گھر سے قریب تھا — اور ہم چاروں نے مل کر گھروں کے سامنے میدان میں بیڈمنٹن کا کورٹ بنا لیا تھا — ہم لوگ وہاں کھیلتے اور بڑا اچھا وقت گذرتا۔

دو دفعہ شاہ صاحب اور ڈاکٹر میرے ساتھ ہڑپال کے شکار پر آڑا بھی گئے۔ مرغابی کے شکار میں اکثر منیر بھی ساتھ ہوتے — اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ منیر ایک نہایت مخلص، شریف اور قابل قدر دوست ہیں —

لطیف بھی ایک دو بار میرے ساتھ شکار پر گئے لیکن ان کا ساتھ اچھا نہیں رہا۔ عبدالرحمٰن خان کو ساتھ لیجا کر مجھے بعد میں افسوس ہوا — شکار میں ہمیشہ نہایت اچھے، خوش مزاج اور مخلص ساتھی ہونا چاہیئے ورنہ بڑی کوفت ہوتی ہے۔ خود غرض لوگوں سے احتراز ہی بہتر ہے۔

جیسے کاظمی — ہمہ وقت خوش مزاج، تعاون پر آمادہ، ہر کام میں برابر کے ساتھی — نظر شناس اور وضعدار — کئی بار مجھے اپنے ساتھ شکار پر لے گئے۔ اور کئی بار میرے ساتھ بھی گئے۔

یا جیسے توفیق کمال — مجھے ایک بار مظفر گڑھ ہرن کے شکار کے لیے لے گئے۔ ذوالفقار بھی ساتھ تھے — اس قدر مدارات اور خلوص سے پیش آتے رہے کہ مجھے اب تک یاد ہے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ایک دفعہ اور کاظمی اور توفیق کے ساتھ سلیمانکی ہیڈ ورکس بھی شکار کے لیے گئے۔ اور نیل گائے کے شکار کے خیال سے امروکا کے ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ وہاں کے گیم واچر نے ہم سے خفا ہو کر پولیس میں شکایت بھی کر دی کہ توفیق اور نقوی نے میرے ساتھ زیادتی کی۔ اگرچہ نہ توفیق نے اس کو کچھ کہا تھا نہ میں نے۔ پھر جب عدالت میں پیشی ہوئی تو مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا کہ تو نقوی صاحب کو پہچانتا ہے اس نے کہا ہاں۔ اس وقت وہاں میں تھا، لطیف تھے اور دو تین آدمی اور تھے گیم واچر چھوٹا تھا اس لیے کسی کو بھی نہ پہچان سکا۔ اور مقدمہ خارج ہو گیا۔

اتفاق کی بات ابوظفر اس زمانے میں آئی جی پولیس تھے اور میرے اچھے جاننے والے تھے لیکن بےفیض، میری کوئی مدد نہیں کی۔ اللہ کی مدد ہی سب سے بہتر مدد اور اسی کی عنایت قابل اعتماد اور اس پر بھروسہ ہی جزو ایمان ہے۔

شکار میں ساتھ لے جانے کے لیے احباب کا انتخاب نہایت اہم شئے ہے۔ ہر شخص ہر موقعے کے لیے مناسب نہیں ہوتا۔

نہ ہر زن، زن است و نہ ہر مرد، مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

ناگپور اور ہوشنگ آباد کے عظمت خان، نواب عصمت اللہ۔ نواب اُٹّے۔ حیدرآباد کے پیران حسینی، میر جہاں، غازی، شیرپال، بابے رامو، گلاب حسین قادری راجہ شبہ رلئے، اور اطہر میاں، الحمدللہ سب ہی ہوں گے۔ میری ملک سے باہر کی زندگی کا ایک یہ نقصان بھی ہے کہ ان سب سے رابطہ نہ رکھ سکا۔

میرے لیے بھوپال میں شکار کا انتظام ہمیشہ عظیم بھائی نے کیا۔ البتہ کبھی کبھی محسن خان، دولت حسین، ابوغزالی اور راحت علی بھی مہربان رہے، میں ان سب کی عنایات، محبت، اور شفقت کا معترف اور شکرگزار ہوں۔ اب خدا معلوم شکار اور ساتھ کا وہ وقت دوبارہ آئے کہ نہ آئے۔ جیسا شکار ہم کھیل چکے وہ تو اب صرف کتابوں میں تذکروں تک محدود رہ گیا۔ انسانیت کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانی

کی بنا پر قابل شکار جانوروں کی جان پر بن آئی۔ یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ شکاریوں کی وجہ سے جانوروں کا نقصان ہوا۔ شکار تو ہمیشہ سے جاری رہنے والا ایک عمل ہے۔ لوگ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی شکار کرتے تھے، اور زمانہ تاریخ میں بھی۔

نقصان پہنچایا بڑھتی ہوئی آبادی نے۔ روز افزوں ترقیاتی منصوبوں نے، بند، عمارتیں، نئے شہر۔ علاوہ ازیں نئے نئے زراعتی فارم۔ زراعتی منصوبے۔ ملیں، کانیں، گیس کے کنوئیں، تیل کے ذخائر کی تلاش، پہاڑوں کے پتھروں کی بڑھتی ہوئی مانگ، درختوں کی لکڑی کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور بکثرت استعمال۔ انسان نے جنگلی جانوروں کے لیے جگہ ہی نہیں چھوڑی جہاں ان کی پرورش اور افزائش ہو سکے، اور سارا الزام شکاری کے سر تھوپ دیا گیا۔

شکاری تو جانوروں کی افزائش، نگہداشت اور دوام میں معاونت کرتا ہے۔ رحمان جیسے نااہل اور کندۂ ناتراش شکاری البتہ جانوروں کے غیر ضروری زیاں کا باعث بن سکتے ہیں۔

جس زمانے میں نیاز محمد خان مغربی پاکستان کے گیم وارڈن ہوا کرتے تھے ان دنوں شکار کی خاص نگہداشت کی گئی، نیاز محمد خاں نہایت غیر شکاری لیکن لیکن بڑے شکار اور شکاری دوست آدمی تھے۔ اور میرے ساتھ بہت شرافت، محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ مجھے جو پرمٹ جاری کرتے وہ میں بہت تاخیر سے استعمال کرتا۔ جب تک مجھے میری مرضی کے مطابق جانور نہ ملتا میں شکار نہیں کرتا اور نیاز محمد میرے پرمٹ بخوشی تین تین بار تجدید کر دیتے تھے۔ ان کے ڈپٹی۔۔۔ رحیم۔ میرے چوبرجی پارک کے قیام کے دوران میرے پڑوسی ہو گئے اور اس کا انھوں نے خاصا حق ادا کیا، میرے گھر کے سامنے ہی چوہدری رفیع مقیم تھے، جو اپنے وقت کے اچھے فلم ڈائرکٹر رہ چکے تھے۔ اور کبھی کبھی فرصت کے وقت ان کیساتھ شطرنج کی بازی بھی جمتی تھی۔

شطرنج کا ذکر آیا تو ایسٹرن فیڈرل یونین کمپنی لاہور کے ریجنل منیجر قاضی صاحب

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بھی یاد آ گئے — یہ بھی شطرنج اچھی کھیلتے تھے اور کبھی کبھی دوپہر کے وقت دفتر سے اُٹھتے ۔ ان کا دفتر مال روڈ کی الفلاح بلڈنگ میں تھا — تو میرے گھر آ جاتے — میرے گھر کے سامنے خوب گھنے درخت پھول اور بیلیں تھیں جن کو میرے مالی نذیر نے خوب نگہداشت کر کے بڑا خوبصورت بنا رکھا تھا۔ میں اور قاضی صاحب کھانا کھا کر پھولوں کے اس کنج میں شطرنج لیکر بیٹھتے تو عصر کی نماز کے وقت تک لگے رہتے اور کبھی وہ ہارتے کبھی میں — نجانے اب قاضی صاحب کیا ہوئے ۔ ایک بار ان کے بیٹے کویت میں ملے تھے ۔ یہ بھی کئی سال پہلے کی بات ہے ۔

محمد اسلم — نہایت عمدہ مصور اور بہت اچھے آدمی تھے ۔ انھوں نے یو ایس ایڈ کی سروس کے دوران ملٹری کی ایک بہت وزنی موٹر سائیکل خریدلی ۔ بندوق بھی رکھتے تھے اور مرغابی کے شکار کا بڑا شوق تھا — اب میرے سر ہو گئے کہ ان کی موٹر سائیکل پہ بیٹھ کر شکار کو چلوں — میں بہت روز تک ٹالتا رہا — موٹر سائیکل پہ جانا بڑا تکلیف دہ کام ہے ۔ اور موٹر سائیکل بھی پرانی ملٹری کی — مگر اسلم بہت ہی مصر ہوئے تو ایک سنیچر کی صبح ان کی موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر میں بھی جم گیا وہ سیدھے شیخوپورہ گئے ۔ شیخوپورہ سے بھی کوئی سات آٹھ میل آگے سڑک کے دائیں جانب خوب پانی بھرا تھا جس میں بکثرت بیلا نکل آیا تھا ۔ بس یہ ان کی شکارگاہ تھی ۔

یہاں مرغابی تھی — سردی کا زمانہ تھا — تیتر تھے — خرگوش تھے — اور بڑی عجیب بات یہ کہ لومڑیاں تھیں — مرغابی کے شکار میں بھیگنا ضروری ہے جس طرح کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے ضرور ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ہم بھی کیچڑ اور پانی میں لت پت ہوئے ۔ خود اسلم اس جھیل میں ڈوبتے ڈوبتے بچے ۔ اور شام کو چند مرغابیاں ، دو خرگوش اور سات تیتر لے کر ہم اس ناہنجار موٹر سائیکل پر واپس ہوئے ۔ ابھی شیخوپورہ سے دور ہی تھے کہ بارش شروع ہوگئی — اور گویا سزا کے طور پر ہم کو راستہ بھر پانی میں بھیگنا پڑا ۔

اب نجانے اسلم کہاں ہیں — ؟ آخری بار ملاقات ہوئی تھی تقریباً اٹھارہ

سال پہلے اس وقت وہ مصری شاہ میں ایک جگہ رہتے تھے ۔

یو ایس ایڈ میں مصطفیٰ اسلم اور جمیل پر مشتمل ایک گروپ — آرٹ سیکشن ہوتا تھا ۔ جو نجانے کیوں بند کر دیا گیا ۔ جمیل یو ایس ایڈ کے ایگریکلچر ڈویژن میں لے لیے گئے اور مصطفیٰ و اسلم بیکار ہو گئے — لیکن پھر مصطفیٰ نے ایک فرم میں ملازمت کر لی ان کا دفتر واپڈا ہاؤس میں تھا ۔ اسلم کچھ اپنا کاروبار کرنے لگے تھے — آرٹ ورک ہی ان کا کاروبار تھا ۔

مصوری کے لیے غربت ، تنہائی اور سیاست سے ناواقفیت ، بالکل زہر قاتل ہے اگلے صفحے پر میں نے اسلم کے بنائے ایک مصوری کے نمونے کا فوٹو دیا ہے ۔ یہ اُنھوں نے میری فرمائش پہ میری موجودگی میں ہی چند لمحوں میں بنا دیا — اور مجھے اپنے ساتھ کھانا بھی کھلایا — میں مصوری وغیرہ سے زیادہ آشنا نہیں ہوں ۔ لیکن جس عجلت کے ساتھ انہوں نے یہ تصویر بنا دی اس کے پیش نظر یہ ایک نہایت عمدہ تصویر ہے ۔ اگر وہ اسی پہ زیادہ وقت صرف کرتے تو اور بہتر ہوتی — جو شخص رواروی میں اتنی عمدہ مصوری کر سکتا ہے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن افسوس ان کو ایسی کوئی پارٹی نہ ملی جو ان کو منظر عام پہ لاتی ۔ ان کی مصوری کے نمونوں کی تشہیر کرتی ۔

شہرت حاصل کرنے کے لیے ایک فعال حلقۂ احباب بنانا ضروری ہوتا ہے ۔ جو آغاز میں فنکار کی مدد کرتا ہے اور پروپیگنڈا بھی — بس کام چل نکلتا ہے ۔ یا اس کو کسی ایسے گروہ کا ممبر بننا ہوتا ہے جو اس کی تخلیقات کو لوگوں میں روشناس کرائے ۔

یہ بات صرف آرٹ تک ہی محدود نہیں — تصنیف و تالیف — شاعری — وغیرہ میں بھی یہی صورت حال ہے ۔ اور کوئی ایسا شخص جو ان میں سے کسی گروہ میں شامل نہ ہو اس کا صرف اپنی تخلیقات کے زور پہ مشاہیر کے زمرے میں آجانا ممکن نہیں ۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں جن دنوں شالامار ٹاؤن میں رہتا تھا۔ان دنوں وہیں نزدیک میرے ایک عزیز دوست رہتے تھے اور لینڈ کسٹمز میں کام کرتے تھے ۔۔ لینڈ کسٹمز میں "دستِ غیب" کا عمل سب کو ہی آتا ہے ۔اس عمل کے نتیجے میں فتوحات کے دروازے پاٹوں پاٹ کھل جاتے ہیں۔ اور کھلے ہی رہتے ہیں۔فتوحات کی شکل دنیا زمانے کی مختلف اجناس کی صورت میں ہوتی ہے ۔ اور ان عملیات کے مؤکل بھی عجیب بھیس بدلتے ہیں۔کبھی ہندوستان جانے والے یا آنے والوں کا بھیس بنا لیتے ہیں۔کبھی فیکٹریوں اور ملوں کے مالکوں اور منیجروں کی صورت بنا لیتے ہیں۔ غرض یوں ہی ۔۔مگر کسٹمز والوں کو بھی مؤکل شناخت کرنے میں کمال حاصل ہے ۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت را می شناسم

لیکن میرے وہ بھائی نہایت متوکل اور مومن آدمی تھے ۔۔ دستِ غیب کا عمل تو ان کو آتا ہی نہیں تھا ۔۔

البتہ ۔۔ان کے پاس کارتوسوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ بارہ بور کے کارتوس صندوق در صندوق ۔ ہزار ڈیڑھ ہزار کارتوس تو ضرور رہا ہو گا۔ بھابھی کو اس میگزین سے وحشت ہوتی تھی ۔۔ایک بار میں ان کے گھر گیا تو بولیں بھیا ان کی بندوق اور کارتوس لے جاؤ یہ بلا کسی طرح گھر سے نکلے۔ بھابھی نے بندوق اور کارتوس سب اُٹھا کر میرے سپرد کر دیئے ۔۔اور میں اس ذخیرے سے خوب مرغابیاں مارتا ۔۔ خود بھی کھاتا اور ان کو بھی کھلاتا رہا ۔جب کارتوس ختم ہوئے تو میں نے ان کی بندوق بھی واپس کر دی ۔

وہ ایک بار اسید مطلبی بھی مرغابی کے شکار میں میرے ساتھ گئے ۔ اور اپنی روایات و یاد چھوڑ گئے ۔۔ ایک بار ایک صاحب نے عجیب حرکت کی ۔ میں اس زمانے میں چوبرجی پارک میں رہتا تھا ۔میرے ایک پڑوسی مجھے خاص طور سے شکار کے لیے سیالکوٹ لے گئے ۔میں نے ان کو بھی ساتھ لے لیا ۔ وہاں گاؤں سے

دور ایک جگہ ان لوگوں کے بیان کے مطابق سرخاب آتے تھے اور ہمیں وہ لوگ صبح چار بجے سے وہاں لے گئے۔ان کے بیان کے عین مطابق سورج نکلتے نکلتے سرخاب کے بڑے بڑے غول اوپر سے گذرے ۔ اکثر بہت بلند تھے۔ہم سب زمین پہ ہی کسی نہ کسی آڑ میں دبک گئے اور فائرنگ شروع کی ،میرے فائر سے ایک سرخاب اس طرح گرا کہ بھاگ کر ان صاحب کی طرف گیا ۔۔بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایسی جگہ جو میرے اور ان کے درمیان تھی ۔میں نے اُٹھ کر سرخاب کو ذبح کر لیا اور بلیٹ میں لگا لیا ۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ سرخاب ان کے فائر سے گرا ہے۔میں نے کہا نہیں۔ ایسا تو نہیں ۔مگر وہ شخص میری جان کو آ گیا ۔سارا دن، وہ ایک ہی رٹ لگائے رہا ۔کہ سرخاب اس کے فائر سے گرا تھا ۔۔ اگرچہ میں نے اسی وقت سرخاب اسکو دے دیا تھا ۔لیکن اس کی ضد میں فرق نہ آیا ۔۔ یہ جہالت کی مثال ہے ۔

مجھے آج تک صرف اس بات کا قلق ہے کہ میں اس کو اپنے ساتھ شکار پہ لے ہی کیوں گیا ۔۔۔ دراصل ان لوگوں نے دعوت تو مجھے دی تھی ۔۔میں نے بلا وجہ اس شخص کو ساتھ لگا لیا۔

یہ صرف اس نصیحت کے لیے لکھنا ضروری تھا کہ شکار میں صرف نہایت آزمودہ، مخلص اور مہذب و روادار ساتھی کو لے جانا ہی مناسب ہے ، ورنہ بہتر ہے آدمی تنہا شکار کھیلے ،کسی کو لے جانا غیر ضروری بات ہے ۔

مجھے اس قسم کے کئی تجربات ہیں ۔ ایک بار اور میں نے نہایت ہی غلط قسم کے دو تین اشخاص کے ساتھ سور کے شکار کا پروگرام بنا لیا ۔۔ اتفاق کہ وہاں خرگوش بھی تھے ۔ہم لوگ ایک دوسرے سے پانچ سات فٹ کے فاصلے پر ایک خط میں ہی بیٹھے ۔۔طے یہ تھا کہ ہر شخص صرف سامنے فائر کرے گا ۔۔خرگوش نکلا اور میری بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے دائیں طرف اس طرح فائر کیا کہ نال میرے چہرے سے بمشکل فٹ بھر دور تھی ۔۔ اگر ذرا بھی ہل جاتی یا ہاتھ بہک جاتا تو میرا سر اُڑ گیا تھا۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ اسی شخص کی بے احتیاطی سے فائر کے نتیجے میں ایک

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

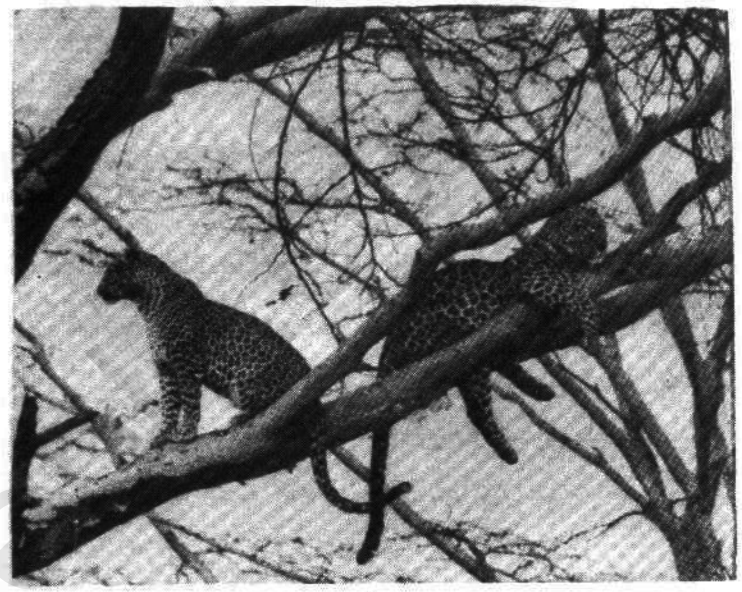

درخت پر بیٹھے ہوئے دو چیتے

آدمی گولی کا نشانہ بن گیا، مجھے اب اس کا نام یاد نہیں۔

شکار میں ساتھ ہونے والے شخص کا نہ صرف معقول آدمی ہونا ضروری ہے بلکہ تعلیم، تہذیب اور شرافت کے لحاظ سے بھی ہم معیار ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک بار بہت عرصہ گذرا میں ایک صاحب کے ساتھ مرغابی کے شکار پر چونیاں گیا۔ چونیاں گاؤں کے نیچے بہت پانی کھڑا تھا اور اس میں بکثرت مرغابی آتی تھی میں اور وہ صاحب کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھے۔ مرغابیوں کے ایک گذرتے ہوئے غول پر ہم دونوں نے فائر کیا۔ ایک مرغابی گری۔ وہ دوڑے مرغابی اُٹھائی۔ ذبح کی اور میری طرف لے کر آئے کہ یہ آپ کی ہے۔ میں نے پوچھا کیسے ممکن ہے ان کے فائر سے گری ہو۔ بولے کوئی نہیں۔ آپ کے فائر سے گری ہے۔ اس سے نہ ان کو کوئی فرق پڑا نہ میرے شکار پر کوئی تمغہ لگ گیا۔ صرف ذہنیت کی بات ہے۔ یہ تو غلط تجربات تھے۔ اچھے تجربات بھی بکثرت ہیں۔ غلط قسم کا تجربہ تو محض دو چار بار ہی ہوا۔ ہمیشہ میں اپنے ساتھیوں کے انتخاب

امریکہ کے مشہور ریچھ ۔ گرزلی

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں بہت محتاط رہا ہوں ۔ اور مجھے احباب بھی اچھے ہی ملتے رہے ۔

میں شیر کے شکار پر چلا تو میرے میزبان نے پوچھا ـــ

"آپ کے پاس رائفل کے کتنے کارتوس ہیں ـــ ؟"

"پانچ ـــ"

"کل ـــ ؟"

"ہاں ـــ"

انھوں نے مجھے بیس کارتوس دیئے اور بولے ۔

"میری رائے ہے کہ آپ رینج پر کم از کم بیس فائر کر کے نشانے کی کسی قدر مشق کر لیں اچھا ہے ۔"

میں نے ایک دو بار تکلف کیا ـــ انھوں نے اصرار کیا ۔ اور میں رضا مند ہو گیا ۔ خیال اچھا تھا ـــ میں نے دس کارتوس فائر کئے ۔ اور الحمد للہ صرف دو گولیاں غلط گئیں ـــ باقی ہدف پر لگیں ۔

پاکستانی شکاری حضرات میں سے جو لوگ میرے ہم شکار رہے ان میں سے کچھ کے نام میں نے اوپر لکھے اور وہ سب نہایت اچھے ساتھی تھے ۔

رائفلوں کے استعمال کے بارے میں بھی اپنے تجربات لکھنا ضروری ہے ـــ رائفل بنانے والے تو اپنے فائدے اور کاروبار کی توسیع کے لیے روز روز نئے نئے بورز کی رائفلیں بناتے رہتے ہیں اور ان کے بارے میں مبالغہ آرائیاں بھی بکثرت کرتے ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں ایک عام شکاری کتنی رائفلیں رکھے گا ۔ ایک ـــ یا دو ـ میرے پاس ہمیشہ تین رائفلیں رہی ہیں ـــ ایک دونالی چار سو پچاس ایکسپریس ۔ دوسری تین سو پچھتر میگنم اور تیسری بائیس بور کی ـــ اس کے علاوہ ایک شاٹ گن اور ایک ریوالور ۔

ان سب کے لائسنس میرے پاس اب بھی ہیں ۔ گو سب ایکسپائر ہو چکے ہیں ۔ کبھی کبھی تین سو پچھتر میگنم کے بجائے تھرٹی اسپرنگفیلڈ بھی استعمال کرتا تھا ۔

آخر زمانے میں بائیس بور کی رائفل میں نے فروخت کر دی اور اس کے لائسنس پر سیون ایم ایم ، پارکر ہیل کی رائفل لے لی تھی ـــ یہ بھی میرے پاس بڑے عرصے تک رہی ۔

شیر کے شکار کے لیے میں سمجھتا ہوں دونالی چار سو پچاس ، پانچسو ، چار سو ایک وغیرہ بور کی رائفلیں بہترین ہوتی ہیں ـــ لیکن اب شیر کا شکار کتنے لوگ کریں گے ـ !

شیر کے علاوہ دوسرے بڑے جانوروں کے لیے تین سو پچھتر میگنم ـــ میں نے تین سو پچھتر میگنم سے کئی شیر شکار کئے ۔

پاکستان میں اب جو شکار ملتا ہے اس کے لیے بہترین رائفل سیون ملی میٹر کی ہے ۔ ہلکی اور نہایت مناسب طاقت کی رائفل ہے ۔ ہرن ، ہرپال ، پاڑا ، چکارا ، سور ریچھ اور چیتا ، سب اس رائفل سے شکار کئے جا سکتے ہیں ۔ البتہ کارتوس نہایت توجہ چاہتے ہیں ۔ سیون ملی میٹر کے کارتوس دو قسم کے آتے ہیں ۔ ایک تو معمولی ۔ جو اچھے اور مناسب ہونے کی وجہ سے نسبتاً مہنگے ہوتے ہیں ۔ دوسرے ملٹری کے پرانے کارتوس جو ارزاں ملتے ہیں ۔ ان کی گولی سخت سیسے کی اور خراب ہوتی ہے جس سے رائفل کی نالی میں خراشیں آ جاتی ہیں ۔ بارود بھی اچھی نہیں ہوتی اور فائر کے بعد فوراً ہی نال صاف نہ کر لی جائے تو کناروں پر جمی ہوئی بارود سخت ہو کر رہ جاتی ہے ۔ یہ بارود رائفل کی کارکردگی کو متاثر کر سکتی ہے ۔

کارتوس ہمیشہ اچھے تازہ اور قیمتی خریدنا چاہیئے ۔ جس شئے کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اس کی کوئی علت بھی ہوتی ہے بے سبب زیادہ نہیں ہوتی ۔

اگر میں جانتا کہ اب بھی شیر کے شکار کے امکانات ہیں تو وہ تمام اصول و قواعد جن کا اس کام سے تعلق ، اور جن کا جاننا ضروری ہے ، قطعی طور سے بیان کرتا ، اور ان کی تفصیلات بتاتا ، جزئیات کا تذکرہ کرتا ، تدابیر ، احتیاط اقدامات کے بارے میں قیمتی ہدایات دیتا ، جو میرے پچیس تیس سالہ شکاری تجربات پر مبنی ہیں ۔ لیکن اب یہ سب غیر ضروری ہے ـــ شیر کے شکار کے واقعات پڑھنا اور سننا ہی کافی ہے ۔

شیروں کی تعداد کے بارے میں اب بھی صحیح آمار تو موجود نہیں ۔ جو آمار سرکاری

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

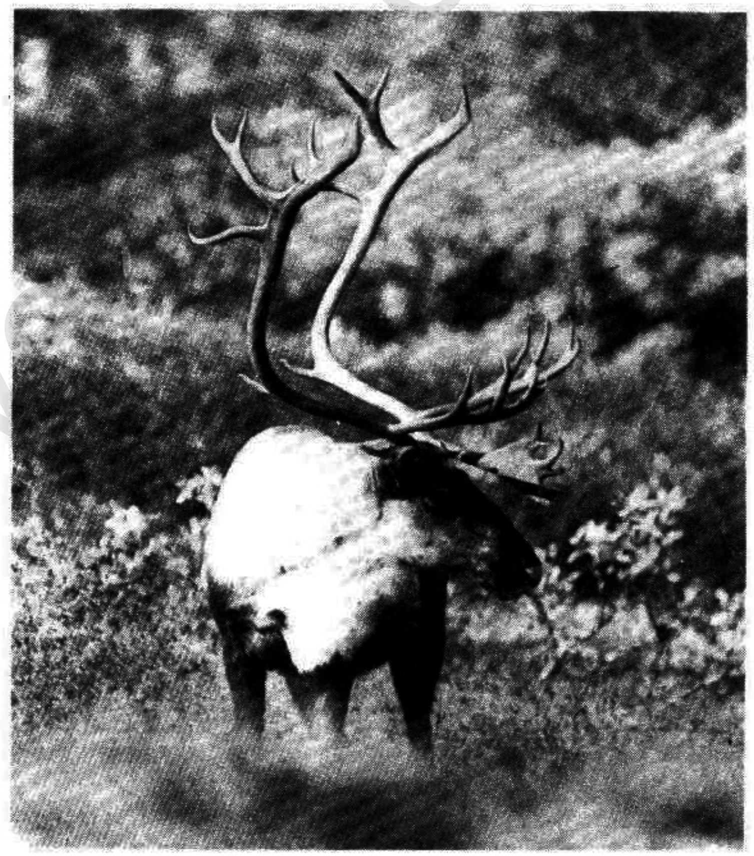

سانبھر، عموماً گھنی جھاڑیوں اور جنگلوں سے
بھرے پہاڑی ڈھلانوں پر رہتا ہے۔

طور سے بتائے جاتے ہیں ان پر اعتماد مشکل ہے۔

بھائی جعفر بتاتے تھے بھوپال میں ابھی چند سال پہلے شیروں کی یہ کثرت تھی کہ ایک رات وہ جیپ میں جنگل سے گذر رہے تھے — ایک بار روشنی سڑک کے کنارے پڑی تو ایک پتھر کے پیچھے شیروں کا ہوا نظر آیا — انھوں نے جیپ روکی — واپس کی۔ پھر لائٹ ڈالی — شیر اب بھی وہیں تھا — ان کی رائفل تسموں سے بندھی تھی — جب تک کھولی جائے تب تک وہ بھاگ لیا — اور ان کو دراصل اس کو مارنا بھی نہیں تھا صرف دیکھنے کے لیے واپس آئے تھے۔

اب بھی شیر اسی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

اگر میں چالیس سالہ شکاری زندگی کے سارے واقعات لکھنا چاہوں تو صرف ایک کتاب میں ان کا یکجا ہونا ممکن نہیں — ہر جانور کے شکار کا اپنا ایک علیحدہ واقعہ ہے — خواہ وہ آدم خور شیر ہو یا سانبھر، چیتل ہو یا چیتا — ہڑیال ہو یا ہرن، پاڑا ہو یا چیکارا۔

اب میرا ارادہ ہے کہ آدم خور شیروں اور چیتوں کے قصے ختم کیے جائیں — اور دوسرے جانوروں کے ساتھ جو دلچسپ تجربات ہوئے وہ بھی قلمبند کیے جائیں۔ میرے شیر کے شکار کے قصے اب ختم بھی ہو رہے ہیں کتنی ہی کتابیں چھپ چکی ہیں — مادھوپور کا آدم خور۔ گنڈولا کا آدم خور۔ بالم پور کا آدم خور۔ آٹھ آدم خور شیر — اور یہ شکار بیتی — میں نے کل ستائیس آدم خور شیر ہلاک کیے تھے — کئی قصے رسالوں میں بھی شائع ہوئے۔

میں ۱۹۷۶ء میں تہران میں تھا جب اخباروں میں خبریں آئیں کہ نینی تال کی زرعی دانشگاہ کے کیمپس پر کئی شیر آدم خور ہو گئے ہیں اور حکومت ہند نے شکاریوں کو دعوت دی کہ انھیں ہلاک کریں۔ میں بھی ہندی سفیر سے ملا اور درخواست دی کہ مجھے بھی اجازت دی جائے۔ لیکن میری درخواست خرد برد ہو گئی — اگر اجازت مل جاتی تو میرے شکار کی فہرست میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

مجھے بنگلا دیش میں شکار نہ کھیلنے کا افسوس ہے۔ جس زمانے میں وہ ملک پاکستان کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ یادش بخیر۔ ان دنوں کئی احباب نے دعوت دی کہ میں ڈھاکہ آجاؤں تو سندربن اور چٹا گانگ دونوں جگہ شیر اور چیتے کے شکار کا انتظام کرا دیں گے لیکن نجانے کس قسم کی مصروفیات نے مجھے نہ جانے دیا۔ تا آنکہ وہ حصہ ملک سے کٹ کر بنگلا دیش بن گیا۔

میں ساڑھے چار سال سے عرب متحدہ امارات میں برسرکار ہوں۔ یہاں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ سال بھر کے بعد چھٹی ملتی ہے۔ وہ بھی ایک ماہ۔ اس ایک ماہ میں شکار کیسے ہو۔ دراں حالیکہ اس ملک میں ہتھیار رکھنے کی قطعی اجازت نہیں۔ اگر اجازت ہوتی تو بھی ممکن تھا میں ایک ماہ چھٹی میں اپنے ہتھیار ساتھ لے کر جاتا اور شکار کھیلتا۔ اب تو ساڑھے چار سال سے شکار قطعی بند۔ بلکہ ہتھیار کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ بندوق کی ایک دکان دبئی میں ہے۔ کبھی کبھی میں وہاں جا کر بندوق نکلواتا ہوں۔ اس کو ہاتھوں میں تولتا ہوں۔ نشانہ لیتا ہوں اور حسرت بھری آہ بھر کر رہ جاتا ہوں۔ ساڑھے چار سال سے میں نے بندوق نہیں چلائی۔

سال ڈیڑھ سال بعد میرا پاکستان واپسی کا پختہ ارادہ ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور چاہتا ہوں واپسی میں اپنے ساتھ ایک بندوق اور ایک رائفل لیتا آؤں۔ سنا ہے ملک میں اب دو ہتھیار لانے کی اجازت نہیں۔ اللہ مالک ہے۔

اب میرے لیے جانوروں کو ہلاک کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جس قدر شکار کی تمنا مجھے تھی وہ میں کر چکا۔ اب تو صرف یہ ہے۔ رائفل ہاتھ میں لے کر جنگل جنگل گھومتے رہنا اور جانوروں کی حرکات کا مطالعہ کر کے مشاہدات تحریر کرتے رہنا۔ کبھی دل چاہے تو کوئی اچھا قابل شکار جانور شکار کر لینا۔ بس یہی خواہش ہے۔

میں امریکہ میں کئی سال شکار کھیلتا رہا ہوں۔ عنقریب پھر سے پروگرام بن رہا ہے۔ میرا بڑا لڑکا اشرف امریکہ میں ایروناٹیکل انجینیئرنگ پڑھ رہا ہے اور انشاءاللہ

چند ماہ میں اس کا کورس مکمل ہونے کو ہے۔ اس کے ایک امریکن دوست نے مجھے مدعو کیا ہے ادھر اس کا کورس ختم ہوا ادھر میں پہنچا اور اس کو ساتھ انشاءاللہ امریکہ کے مشہور ریچھ۔ گرزلی۔ اور پوما کا شکار کروں گا۔ اور اپنے تجربات پر مبنی باتصویر کتاب تحریر کروں گا۔ پوما امریکہ کا پہاڑی شیر ہوتا ہے۔ پوما کی تصویر کسی مقام پر دیکھی جا سکتی ہے۔ البتہ یہ تصویر میری کھینچی ہوئی نہیں ہے۔

یہ ضروری بھی نہیں کہ اس کتاب میں شامل ساری تصویریں میری کھینچی ہوئی ہوں زیادہ تر میری کھینچی ہوئی ہیں لیکن کچھ تصاویر میں سے مختلف ذرائع سے بھی حاصل کی ہیں۔ البتہ شیروں کی جتنی بھی سیاہ و سفید یا رنگین تصاویر ہیں وہ سب خود میری کھینچی ہوئی ہیں۔ اور جنگلوں میں کھینچی گئیں۔

میری آئندہ کتاب "شکار نامہ" بھی انشاء اللہ باتصویر ہو گی اور اس میں شامل تصاویر ساری کی ساری خود میری کھینچی ہوئی ہیں۔

سب سے بڑی دشواری یہ رہی کہ جو میرے شکار کے شباب کا دور تھا اس وقت مجھے تصاویر کھینچنے کا قطعی شوق نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک وقت مجھے اپنی صحرانوردی اور مہم جویانہ شکاری تجربات کو تحریر کرنا ہو گا اور اس وقت تصاویر کی ضرورت ہو گی۔ میں نے تو بیشتر شیروں کی تصاویریں بھی نہیں بنائیں۔ اگرچہ میں نے سترہ سال کے عرصے میں چونتیس شیر شکار کیے اور انیس چیتے۔ ان میں سے ستائیس شیر اور سات چیتے آدم خور تھے۔ اب تک صرف دو آدم خور چیتوں کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ پانچ قصے باقی ہیں۔ اور یہ پانچ ان تمام قصوں سے زیادہ دلچسپ جو میں اب تک لکھ چکا ہوں۔ ان کے بارے میں یادداشتیں میرے پاس موجود ہیں۔ کچھ تصویریں بھی لیکن میں نے ان چیتوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان کے ساتھ اپنی تصویر نہیں بنوائی لہٰذا اب چیتوں کے جو قصے میں ایک علیحدہ کتاب "آدم خور تیندوے" میں تحریر کروں گا، ان میں چیتوں کے ساتھ میری تصویر شامل نہیں ہو سکے گی۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

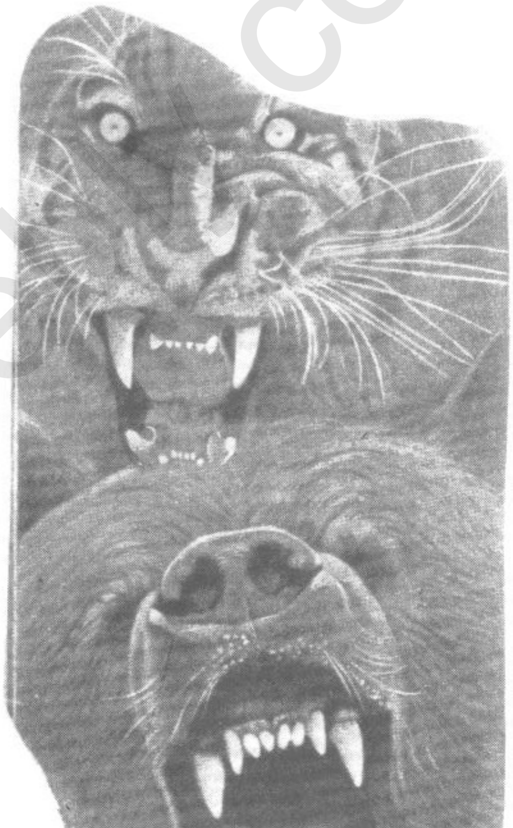

اِسی طرح شیروں کے بارے میں جو میری زیرِ تالیف "شکار نامہ" ہے، اس میں بھی سارے واقعات کے ساتھ تصاویر نہیں ہیں۔

جولائی ۱۹۸۴ء کی عید سے پہلے میں چند روز کے لیے راولپنڈی گیا تھا۔ صدر سے گذرتے ہوئے میں اسلحہ فروشی کی ایک دوکان پر چلا گیا — وہاں دو حضرات کارتوس خرید رہے تھے — میں نے دوکاندار سے دریافت کیا — میں باہر سے اپنے ساتھ اسلحہ لا سکتا ہوں یا نہیں — دوکاندار نے جواب دیا، نہیں لا سکتے۔ جو حضرات اسلحہ خرید رہے تھے ان میں سے ایک میری طرف متوجہ ہوئے اور میرے استفسار کی وجہ پوچھی — میں نے صحیح بات بتا دی اور ساتھ اپنا نام بھی بتایا — نام سنکر وہ لوگ بہت خوش ہوئے کہنے لگے وہ میرے لکھے ہوئے شکار کے قصّے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں — اور یہ کہ رمضان کا مہینہ ہے اس لیے وہ اُس وقت میری خاطر نہیں کر سکتے پھر انہوں نے تقاضا کیا کہ میں واپس پاکستان آجاؤں۔

اور واقعی اس وقت بھی میرا دل چاہا اب اپنے وطن واپس آہی جاؤں — بہت باہر رہ لیے حقیقت یہ ہے جو آرام، اطمینان، فرحت و آسائش اپنے ملک میں رہ کر ہے وہ نہ امریکہ میں ہے نہ دبئی میں —

اس ذوق برگردگی کو دبئی کے صحرائی اور موسمی حالات نے بھی مہمیز دی ہے۔ اب میں جہاں ہوں وہاں گرمی ہے، پانی کی قلت ہے، سایہ معدوم ہے، بارش کئی سال میں ایک دو انچ ہوتی ہے۔ سردی آتی ضرور ہے لیکن بس اتنی جیسے گرمی کم ہو گئی ہو۔

وہ بادلوں کا گھر کر آنا — گرجنا چمکنا — موسلا دھار بارش ہونا — سب خواب و خیال ہو گئے — ٹھنڈی ہوا تو صرف ایئر کنڈیشنز سے حاصل ہوتی ہے ورنہ بادِ سموم ہی ملتی ہے۔ نہ سبزہ نہ درخت — شہروں میں نہایت زبردست کوشش کے بعد پارک اور شاہراہوں کے کنارے کچھ سبزہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس میں نہ سبزی ہے نہ ٹھنڈک —

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

راولپنڈی — پوٹھوہار کا وہ خطۂ دلفریب، جہاں خاک کے ہر ذرے سے سبزہ قدرتاً پھوٹتا ہے — جہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ جہاں بادل خوب کالے کالے ہو کر گھرتے ہیں۔ اور سارے ماحول کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں — جہاں بارش ہوتی ہے — موسلادھار بارش — ایسی کہ سڑکوں پر ندیاں بہنے لگتی ہیں۔

کیا یہ سب خواب ہے۔ ؟!

قاضی صغیر عالم مرحوم نے بھی کئی بار میرے ساتھ شکار پر جانے کی فرمائش کی۔ لیکن ان کی کاروباری مصروفیات نے اجازت نہیں دی — اور ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے بہت شریف آدمی تھے، اور بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔

عظمت خان — جو کبھی ہوشنگ آباد کے رئیس ہوا کرتے تھے آج کل نیو جرسی۔ امریکہ میں مقیم اور خوشحال ہیں۔ میں پچھلی بار امریکہ گیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ میر صاحب، جو حیدر آباد میں میرے میزبان رہا کرتے تھے آج کنیڈا میں زراعت کرتے ہیں۔ اور مجھے شکار کے لیے آنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔

میں شکار ہمیشہ آرام اور سکون اور عیش کے ساتھ کھیلتا ہوں — مجھے ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے استطاعت دے رکھی کہ اپنے آرام کا کل سامان فراہم کر سکوں — اور میں جب بھی شکار پر گیا، آرام سے رہا — کھانے پینے کا وہ سامان جو تازہ فراہم کرنا ہوتا ہے مقامی طور سے خریدا گیا — جو ساتھ لے جایا جا سکا، وہ ہمیشہ ساتھ رہا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار ایسی چیزیں ساتھ رہیں جن سے تمام دن کی تھکن کا تدارک ہو سکے — تفریح کا باعث بن سکیں — اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت شاملِ حال ہو تو اس کی نعمتوں سے متمتع نہ ہونا گناہ ہے۔

یہ اس کتاب "شکار بیتی" کا پیش لفظ تھا۔

اس کے بعد میں جو کچھ تحریر کرنے والا ہوں، وہ صرف خیالی کہانیاں اور فرضی قصے نہیں ہیں — حقیقت اور واقعیت پر مبنی بیانات۔ اسی لیے اس کا نام

"شکار بیتی" ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو — اس دور میں جبکہ ایسے مہم جویانہ اور حوصلہ شکن شکار کا رواج نہیں رہا۔ یہ واقعات عجیب معلوم ہوں، لیکن اس سے واقعات کی حقیقت اور بیانات کی سچائی پر اثر نہیں پڑتا۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں جو بیانات ہیں وہ بھی سارے دوست اور من وعن ویسے ہی ہیں جیسے میرے ساتھ پیش آئے — اس کے بعد جو چند قصے بیان کئے گئے ہیں وہ بھی خالص حقیقت پر مبنی ہیں اور عین اسی طرح لکھے گئے ہیں جس طرح پیش آئے۔ اس سے پہلے جو کتابیں میں نے لکھی تھیں اور شائع ہو چکیں — مثلاً — آٹھ آدم خور شیر، بالم پور کا آدم خور، گنڈولا کا آدم خور، وغیرہ — ان میں شامل سارے قصے بالکل صحیح تھے۔ جس طرح اس شکار بیتی میں ہیں — ابھی چند قصے اور باقی ہیں جو آئندہ تحریر ہونے والی کتاب "شکار نامہ" کی زینت بنیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قمر نقوی

۱۹۸۴ء

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

اچھاور کا آدم خور

دھنیا جیسے دیوانہ ہو گیا تھا —

وہ چیخ چیخ کر اپنی رجی کو پکار رہا تھا — بس — چیخ رہا تھا —

اس بھاری سراسیمگی اور غم میں ڈوبی آواز رات کے پُر ہول سناٹے کو اور زیادہ ہیبتناک بناتی، گاؤں کی خاموش فضا کو درہم برہم کرتی — جنگلوں پہاڑوں میں گم ہوتی جارہی تھی۔

رجی کا کوئی پتہ نہ تھا۔!

اس کی چہیتی رجی —!

اسے وہ دو ہی سال پہلے بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لایا تھا — اور ان دو سالوں میں رجی نے کیسی خدمت کی تھی — وہ تو اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

کیا ہو گئی رجی —؟

گاؤں والوں کے بند گھروں کے دروازے کھلے — خواب میں کھوئے ہوئے لوگوں کو اس کی آوازوں نے جگا دیا تھا — اور وہ — لالٹینیں اور مشعلیں لے کر

نکل آئے —

"کیا بات ہے دھنیا —؟"

"کیا ہوا دھنیا —؟"

"دھنیا — کا ہے چیخت ہے —؟"

"کا ہوا دھنیا —؟"

کتنی ہی آوازیں تھیں — سب اس کی چیخم دھاڑ کے بارے میں سوالات کر رہے تھے —

اور دھنیا تو بس اپنی رجی کو ہی پکار رہا تھا —

چیخ چیخ کر اس کی آواز بھی بیٹھنے لگی تھی —

"ارے کچھ بتائے گا بھی کیا ہوا —؟"

کسی نے جھلا کر کہا۔

"رجی پتہ نہیں کب گھر سے نکلی — اس کی طبیعت خراب تھی — اس کا لوٹا ادھر پڑا ہے — اور وہ خود نجانے کہاں گئی — رجی —"

اور وہ سب رجی کو تلاش کرنے لگے۔

دھنیا کا گھر گاؤں کے کنارے پر تو نہیں تھا — لیکن دو گھر چھوڑ کر ہی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا — اور یہیں ایک کانٹے دار جھاڑی میں رجی کی چادر الجھی ہوئی تھی —

ایک تو بارش نے کام خراب کر رکھا تھا —

تین دن ہو گئے تھے نہ دھوپ نکلی تھی نہ جھڑی رکی تھی — بادل ایسے لدے کھڑے تھے جیسے ساری دنیا کو بہا دیں گے — نالے اور ندیاں بھر کر ابل پڑے تھے — کھیتوں میں تالاب بن گئے تھے — اور تالاب سمندر معلوم ہونے لگے تھے۔

اس وقت بھی بارش ہو رہی تھی۔

دھنیا تو بھیگ کر چوہا بن گیا تھا —

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

گاؤں والے بھی جو رجی کو ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہے تھے بھیگ کر شرابور ہو رہے تھے ۔ بارش ہی ایسی تھی ۔۔

چادر کو دیکھا گیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کانٹوں میں ہلک کر پھٹ گئی ہو ۔۔۔ بارش کی وجہ سے اور کوئی نشان تو باقی تھا نہیں ۔۔۔ لیکن ان لوگوں کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ رجی کسی درندے کا شکار ہو گئی ۔۔۔ مٹی پر کوئی نشان باقی نہیں رہ سکتا تھا ۔۔۔ وہاں تو کیچڑ ہی کیچڑ تھا ۔

ان سب کا خیال شیر کی طرف گیا ۔۔۔

اور اگر شیر نہ ہو گا تو چیتا ۔۔۔!

یہ کسی درندے کی حرکت تھی ۔۔۔ ایسی بارش میں شیر اور چیتے کا خوراک کی تلاش میں آبادی کے قریب آجانا بعید از قیاس نہیں تھا ۔

گاؤں کے کچھ منچلے مسلح ہو کر نکلے ضرور ۔۔۔ لیکن کدھر جاتے ۔۔۔ ذرا دیر میں ہی ان کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو گیا ۔۔۔ یا ۔۔۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے ، گھنے جنگل ، سردی اور بھاوٹ نے سرد کر دیا ۔۔۔ چنانچہ وہ لوگ بارش میں تھوڑی دیر بھیگ کر دھنیا کے گھر جمع ہو گئے ۔۔۔ اور پھر نیند اور سردی نے ستایا تو اپنے اپنے گھروں کی راہ لی ، دو ایک بوڑھے ہی رہ گئے جنھیں ویسے بھی نیند نہیں آتی تھی ۔

معلوم کیوں ۔۔۔ بڑھاپے میں نیند نہیں آتی ۔۔۔ جوانی میں جاگنے کی راتیں ہوتی ہیں تو نیند بھی بہت آتی ہے ۔ پیری میں سونے کی راتیں ہوتی ہیں تو نیند نہیں آتی ۔

خیر ۔۔۔

بارش برابر ہوتی رہی ۔۔۔

یہ تو سب کو یقین تھا کہ رجی ، رات کے اندھیرے اور سردی کی بارش میں رفع حاجت کی مجبوری کے تحت باہر نکلی تھی ۔۔۔ وہ بیمار سی تھی ۔ بخار بھی تھا ۔۔۔ غلطی یہ کہ اس نے دھنیا کو جگایا بھی نہیں ۔۔۔ وہ تو دھنیا کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے رجی کو لوٹے میں پانی لے کر باہر نکلتے دیکھا تھا اور بس ۔۔۔ سردی کے زمانے

میں نیند بھی خوب آتی ہے ۔۔۔ اور پھر جوانی کی نیند ، ۔۔۔ وہ پھر سو گیا تھا ۔۔۔ نجانے کب تک سوتا رہا کہ اچانک آنکھ کھلی اور ہاتھ بڑھا کر رجی کے بستر کو ٹٹولا تو بستر خالی تھا ۔

بس ۔۔۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا ۔۔۔

صبح منہ اندھیرے ہی گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے تھے ۔ کلہاڑیوں ، برچھیوں اور زنگ لگی تلواروں سے مسلح ہو کر یہ لوگ کیچڑ اور پانی میں گاؤں سے نکلے ، اور رجی کو ڈھونڈتے جنگل کی طرف چل دئیے ۔ نشان تو کوئی تھا نہیں کہ تلاش میں آسانی ہوتی ۔ صرف اندازے سے اس طرف گئے جدھر جنگل زیادہ گھنا ، ویران اور جانوروں کے لیے موزوں تھا ۔۔۔

ایک گروہ کو اچھاور پولیس اسٹیشن بھیجا گیا ۔۔۔ ایسے حالات میں پولیس کو اطلاع کرنا بھی ضروری ہوتا ہے ۔۔۔ اچھاور تک سولہ میل کا فاصلہ تھا ۔۔۔ اور فاصلہ بھی ایسا کہ بارش کی وجہ سے راستے کے سارے ہی ندیاں نالے لبالب ۔۔۔ بلکہ علاقائی زبان میں ۔ منھی ڈباؤ ۔۔۔ ہو رہے تھے ۔۔۔ کیچڑ بھی تھی ۔۔۔ اور پھر بارش کوئی بند تھوڑی ہو گئی تھی ۔۔۔

تلاش میں جانے والے گروہ نے دوپہر تک رجی کی ادھ کھائی ، بچی کھچی لاش ڈھونڈھ لی ، اور ایک چادر میں لپیٹ کر گاؤں لے آئے ۔ دھنیا کی آہ و زاری اور غم و اندوہ کا اندازہ مشکل نہیں ۔۔۔ وہ اس غم سے دیوانہ سا ہو گیا ، کبھی چلا چلا کر رونے لگتا ۔۔۔ کبھی لاش سے باتیں کرنے لگتا ۔۔۔ کبھی ایک دم ساکت ہو جاتا ۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو شیر نے پکڑا اور کھایا ۔۔۔

جو لوگ پولیس میں اطلاع کے لیے گئے تھے وہ سہ پہر کو اچھاور پہنچے اور سیدھے تھانے ہی گئے جہاں رپورٹ درج ہوتے ہوتے شام ہو گئی ۔۔۔ پولیس والے رپورٹ فوراً تو لکھ نہیں لیتے ۔۔۔ بہر حال تھانیدار نے نائب صاحب کو حکم دیا کہ اگلے دن جائے وقوعہ کا معائنہ کر کے تفتیش کریں ۔۔۔ یہ نائب صاحب اتفاق سے میرے دوست تھے اور تھانیدار صاحب میرے پھوپھی زاد بھائی ۔۔۔ میں ان دنوں

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

عظیم بھائی کے پاس گیا ہوا تھا — اور شام کو ہرن کے شکار سے واپس آیا تو چھوٹے بھائی نے سارا قصہ بیان کر کے مجھ سے تقاضا کیا کہ میں بھی نائب صاحب کے ساتھ گاؤں جا کر دیکھوں کہ کیا معاملہ ہے۔

"اس کے خیال میں کیا معاملہ ہو گا —؟"

میں نے پوچھا۔

"مجھے ان لوگوں کے بیان سے شک ہوتا ہے یہ کسی درندے کا کام ہے — شیر یا چیتا — اس کی گمشدگی میں انسانی ہاتھ نہیں ہے —"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا —

"میں جانتا ہوں —"

میں نے جواباً کہا۔

"کہ میرا جانا غیر ضروری ہے — کیونکہ بارش مسلسل ہو رہی ہے — ایسے میں شیر یا چیتے کو تلاش کرنا ممکن نہیں — اس کے علاوہ میرے پاس بڑی رائفل نہیں ہے۔ بھوپال جا کر طویل شکار کا انتظام کر کے آنا ہو گا — اور پھر ممکن ہے یہ واردات صرف شدید بارش کی وجہ سے انتہائی بھوک اور مجبوری کے تحت کی گئی ہو — یہ شیر یا چیتا مزید کوئی واردات نہیں کرے گا —"

چھوٹے بھائی ذرا دیر سوچتے رہے — پھر بولے۔

"عزیزم — انسانی خون ایک بار منہ کو لگ جائے تو درندہ اس کا ذائقہ نہیں بھولتا — یہ کام شیر کا ہو یا چیتے کا — آئندہ بھی ہو گا —"

اب میں سوچنے پر مجبور تھا — ایک تو چھوٹے بھائی کی بات بہ آسانی رد نہیں کی جا سکتی تھی — دوسرے یہ کہ ان کا تجربہ میرے تجربات سے بدرجہا وسیع تر تھا۔

"اچھی بات ہے —" آخر کار میں نے جواب دیا — "میں فی الحال واپس جا رہا ہوں لیکن تیار رہوں گا — صحیح بات معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور اطلاع کرا دیجئے گا — اس عرصے میں بارش بھی ختم ہو جائے گی —"

دوسرے روز میں بھوپال گیا — اور چھوٹے بھائی سے ہوئے وعدے کے مطابق تیاریاں کرتا رہا، دونوں رائفلیں — یعنی چار سو پچاس ایکسپریس اور تین سو چھتر ہالینڈ اینڈ ہالینڈ میگنم — صاف کر کے آمادہ رکھیں کہ اگر شیر کی اطلاع ملی تو چار سو پچاس ایکسپریس ساتھ لے جاؤں گا، اور چیتے کی خبر آئی تو تین سو چھتر میگنم اٹھا لوں گا — بارہ بور کی دونالی بندوق تو گویا ہمیشہ کی ساتھی ہے — اور میری ہر تصویر میں کمر میں بندھی ہوئی بارہ بور کے کارتوسوں کی پیٹی بھی ضرور نظر آتی ہے۔

جیسا میں پہلے کئی بار بیان کر چکا ہوں — بارہ بور کی دونالی بندوق میرا سب سے زیادہ پسندیدہ اور معتبر ہتھیار ہے — اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں ELEY کے جو کارتوس آتے تھے — جو پاکستان میں مشکل ہی ملتے ہیں اور بیش قیمت بھی ہو گئے ہوں گے — وہ بڑے ہی طاقتور ہوتے تھے — میں نے بارہا LG اور SG کارتوسوں سے نیل گائے، ہرن، چیتل، چکارے اور پاڑے شکار کیے ہیں، بلکہ اتفاق سے ایک ہڑیال بھی شاٹ گن سے ہی مار لیا — اور بہت بڑا ہڑیال —

یہ قصہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

میں اپنے معمول کے مطابق لاہور سے روانہ ہو کر جہلم ہوتا ہوا آڑا پہنچا — آڑے کا ریسٹ ہاؤس — جو خاصی بلندی پر پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے — مقفل ملا — آڑے کا سرکاری چوکیدار تو ایک بڈھا دیہاتی تھا جو نزدیک ہی ایک وادی کے نشیب میں کھیتی باڑی بھی کرتا تھا اور اس سے اس کی اچھی آمدنی تھی اسی لیے وہ کچھ مغرور سا تھا — لیکن ریسٹ ہاؤس کی دیکھ بھال اس کا بیٹا اسلم کرتا تھا۔

اسلم کو مجھ سے اُنس ہو گیا تھا — اور مجھے اس سے — وہ کوئی چھبیس سال کا دبلا پتلا جوان تھا اور بہت خوش اخلاق، سادہ اور خدمتگار — میرے قیام کے لیے ریسٹ ہاؤس صاف کرتا — بستر درست کرتا، گرم یا ٹھنڈا پانی نہانے یا منہ دھونے کے لیے تیار کرتا — کھانا پکاتا — اور پھر شکار میں میری بندوق اٹھا کر میرے ساتھ جنگل جنگل اور پہاڑ پہاڑ گھومتا رہتا۔ اس کے ساتھ ہونے سے مجھے یہ آسانی ہوتی کہ مقامی

http://updf.weebly.com

ہونے کی وجہ سے نہ تو راستوں اور پگڈنڈیوں پر راہ بھولنے کی زحمت ہوتی۔ نہ شکار تلاش کرنے میں۔ غالباً وہ میری آمد کے انتظار میں ہڑیالوں اور چکاروں کی قیامگاہوں، چراگاہوں اور گذرگاہوں کا پتا لگا رکھتا تھا۔

میں آڑے پہنچتا تو اسلم کو گھر سے بلوا تا تب ریسٹ ہاؤس کھولا جاتا اور میں اس قدیم ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہو جاتا تھا۔

ریسٹ ہاؤس ہمیشہ کی طرح مقفل ملا۔

میں نے کار کو لاک کیا، اور بندوق لے کر ریسٹ ہاؤس کے احاطے سے نکلا۔ سیدھا اس پہاڑی کے کنارے تک آ گیا، اور حسبِ معمول یہاں شاٹ گن سے دو فائر کئے — یہ گویا اسلم کے لیے مقررہ اشارہ تھا — فائر کرنے کے بعد میں بہ اطمینان ٹہلتا ہوا ریسٹ ہاؤس واپس آ گیا — زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ اسلم بھاگا ہوا نمودار ہوا۔ اور بہت خوشی اور اخلاق کے ساتھ جھک کر ہاتھ ملایا — خیریت پوچھی اور ریسٹ ہاؤس کھول دیا —

تھوڑی ہی دیر بعد میرے قیام کا سارا سامان مکمل تھا اور میں بہ اطمینان لباس تبدیل کر کے برآمدے میں بیٹھ گیا — اسلم نے چھوٹی میز سامنے رکھ کر اس پر گرم گرم کافی کی پیالی رکھ دی — کافی کی اشتہا انگیز خوشبو نے دل خوش کر دیا —

"تمھارا باپ خیریت سے ہے ---؟"

میں نے پوچھا

اور اس رسمی پوچھ گچھ کے بعد شکار کی بات شروع ہو گئی۔

"کوئی اچھا پُرانا ہڑیال نظر آیا —"

"جی ہاں جناب — نیچے ڈھڈیالی کے آگے پہاڑیوں میں ایک بہت بڑے سینگوں والا ہڑیال ہے وہیں چھپا رہتا ہے —"

"تم نے آخری بار کتنے دن پہلے دیکھا تھا — ؟"

"ہوں —"

دوسرے دن صبح ہم ریسٹ ہاؤس سے چل پڑے — میرے ہاتھ میں سیون ملی میٹر کی رائفل تھی، کمر میں حسبِ معمول بارہ بور کے کارتوسوں کی پیٹی لگی تھی گو بندوق اسلم کے ہاتھ میں تھی — پیٹی کے نیچے ہی راجرز کا وہ چھرا تھا جس سے میں نے بجانے کتنے جانور ذبح کئے — اور جو امارات متحدہ یعنی العین اور شارجہ میں بھی میرے ساتھ ہے — اگرچہ اب میری بیگم صاحبہ نے اس چھرے کو اپنے کچن میں رکھ چھوڑا ہے اور گوشت سے لیکر سبزی ترکاری اور پھل — سب اسی سے کاٹتی ہیں گو دوسری کئی چھریاں اس لئے لا کر انھیں پیش کی گئیں کہ میرے شکاری چھرے سے دستبردار ہو جائیں — لیکن یہ ساری چھریاں بیکار پڑی رہتی ہیں اور وہ چھرا ان کے استعمال میں رہتا ہے۔

ہم آڑا کی آبادی سے نہیں گذرے — میں غالباً کہیں لکھ چکا ہوں کہ آڑے کا ریسٹ ہاؤس، گاؤں سے کوئی ایک میل دور پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ یا اگر ان سترہ اٹھارہ سالوں کے دوران منہدم ہو چکا ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ واقع تھا۔ میری دعا ہے کہ وہ عمارت اب بھی قائم ہو —

ریسٹ ہاؤس کے سامنے والی پہاڑی سے ہی ایک پگڈنڈی گذرتی سیدھی ڈھڈیالی کی طرف جاتی ہے۔ میں ہمیشہ ریسٹ ہاؤس سے نکل کر اسی پگڈنڈی کی راہ لیتا تھا۔ گاؤں میں سے گذرنا میرے لئے قطعاً غیر ضروری بھی تھا اور کتوں کے شور و غل سے بھی خواہ مخواہ غصہ آتا تھا — اسلم کو یہ معلوم تھا اسی لیے وہ بھی مجھے گاؤں میں سے گذارنے کو غلط جانتا تھا۔

آڑا سے ڈھڈیالی جاتے ہوئے پہاڑی سے نیچے اُتریں تو فوراً ہی جنگل شروع ہو جاتا ہے اور پھر سارا راستہ خاصا گھنا جنگل ہے۔ بیچ میں ایک بڑا عمدہ اور شیریں پانی کا آبشار بھی پڑتا ہے جس کے قریب ہی پانی کا چھوٹا سا تالاب بن گیا ہے اور اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی نظر آتی ہیں۔ چھ سات میل کا فاصلہ ہے ہم لوگ نیچے اُتر رہے تھے اس لئے رفتار بھی تیز تھی۔ کوئی ڈیڑھ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

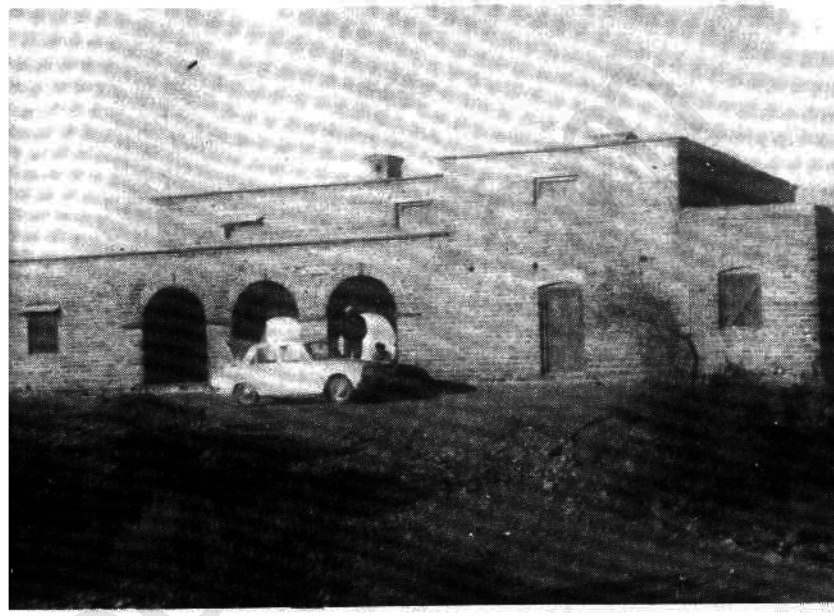

رلسیٹ ہاؤس۔ آڑا

گھنٹے میں ہی ڈھڈیالی پہنچ گئے۔

ڈھڈیالی پتھر کے بنے ہوئے دو مختصر گھروں کا نام تھا جو ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع تھے ۔ ہم ذرا دیر یہاں ٹھہرے ۔ لسّی کا ایک ایک گلاس پیا ۔ اور پھر اپنی راہ پر ہو لئے۔

وہ پہاڑیاں جن میں ہڑیال رہتے ہیں ڈھڈیالی سے بھی کافی نیچے ہیں اور اس روز ہم تمام دن گھاٹیوں، چھدرے جنگلوں، پہاڑی دامنوں اور نالوں میں گھومتے رہے۔ ہڑیال تو بہت نظر آئے لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کو شکار کیا جا سکے۔

شام ہوتے ہوتے ہم پوٹھا آ پہنچے۔ یہاں اکبر کے کوٹھے میں میرے قیام کا انتظام کر دیا گیا، اسلم نے ایک مرغ خرید کر ذبح کیا اور اس کا شوربہ پکا کر عشاء کی نماز کے وقت موٹی موٹی گندم کی روٹیوں کے ساتھ پیش کیا۔

دوسرے روز صبح پھر ہم صحرا نوردی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اور اس

روز بھی شام سے ذرا بعد پوٹھا واپس آ گئے۔ ہڑیال تو کافی تعداد میں نظر آتے رہے لیکن اسلم نے جس پرانے کو دیکھا تھا اس کا پتہ نہیں چلا۔

شکار ۔ ایسے کامیاب شکار کے لیے جس کی یاد طبیعت کو مطمئن، مسرور اور فرحان کرے، بڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

ویسے ایک دن میں ہڑیال مار کر واپس آ جانا بھی دشوار نہیں ۔ بہت لوگ مار لیتے ہیں۔ اور قانونی لوازم بھی قائم رہتے ہیں ۔ لیکن یہ شکار وہ نہیں ۔ جو میرے شایانِ شان ہو ۔

میرے ساتھ ایک بار رحمان نام کا ایک شخص اپنی جیپ پر شکار کے لیے آڑے آیا۔ ایک امریکی دوست بھی ساتھ تھا ۔ اور رحمان کا ایک غلط قسم کا بندوق بردار ساتھی بھی تھا۔ عام طور سے ان دونوں نے جو بد اخلاقیاں اور بدسلوکیاں کیں وہ تو اپنی جگہ ۔ لیکن انھوں نے نہایت بے دردی اور ظلم کیساتھ دو ہڑیال ہلاک کر دیئے، جو بالکل بچے تھے، اور ہرگز مارے جانے کے قابل نہیں تھے۔

اس قسم کی حرکات کو شکار نہیں کہا جا سکتا۔

اس موقعے کے بعد میں نے دوبارہ کبھی ان کو شکار پر لے جانے کی غلطی نہیں کی ۔ بلکہ منہ بھی نہیں لگایا ۔

غرض ۔ میں اور اسلم ایک ہفتے تک روزانہ صبح پوٹھا سے روانہ ہو کر پہاڑ در پہاڑ ۔ نالا بہ نالا ۔ وادی در وادی گھومتے ۔ اور سورج ڈھلے واپس پوٹھا آ جاتے ۔ کامیابی تو کیا ۔ ہڑیال کی جھلک بھی نظر نہیں آئی۔

آٹھویں روز میں نے کیمپ بدل دیا ۔ پوٹھا کے بجائے ڈھڈیالی کو مستقر بنایا، اور ایک روز آرام کیا ۔ اس ایک روز میں اسلم آڑا جا کر کئی روز کے کھانے پینے کا سامان لے آیا۔ جس میں چاول، آٹا، مصالحے، اور کچھ سبزی جیسے مولیاں، گاجر، اور لیموں۔ شکار پر اس قسم کی چٹ پٹی چیزیں اور ذائقہ بدلنے والے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کھانے بڑا مزہ دیتے ہیں اور حوصلہ بلند کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔

ڈھنڈیالی جنگلوں کے وسط میں واقع ہے اور پانی کی قربت نے درختوں کو خوب گہرا سبز اور جھاڑیوں کو سبز اور شاداب کر رکھا ہے۔ ان میں سرخ بیری کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ میں تو یہ بیر کثرت سے جیب میں بھر لیتا تھا اور کبھی کبھی دو چار منہ میں ڈال لیتا تھا — اسلم منع کرتا تھا کیونکہ اس کے علم کے مطابق ان بیروں سے جسم میں گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ اور پیاس کی بھی شدت ہوتی ہے۔ مجھے تو ان دونوں کیفیات کا تجربہ نہیں باوجودیکہ کبھی کبھی تو میں بہت سے بیر کھا جاتا تھا —

ان بیریوں کے علاوہ ان جنگلوں میں کوئی پھل نہیں ہوتا — اس کے برعکس ممالک متوسط، اور دکن کے جنگل پھلدار درختوں سے بھرے پڑے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک عرصہ صرف جنگلی پھلوں پر گذر کرنا چاہے تو مہینوں کھٹے میٹھے پھلوں پر گذر کر سکتا ہے۔ میں اکثر صبح کا ناشتہ کر کے منہ اندھیرے شکار کے لیے نکلتا۔ کھانے کا معمولی سامان — جیسے بسکٹ، خشک پنیر — بادام، پستے، اخروٹ خشک ناریل اور کوزے والی مصری شکاری تھیلے میں ہوتی تھی — لیکن میں نے کبھی انہیں استعمال نہیں کیا۔ ان چیزوں کو تھیلے میں رکھے رکھے کئی ماہ گذر جاتے تو بیگم صاحبہ ان کو نکال کر پھینک دیتیں اور تازہ اشیاء رکھ دیتی تھیں۔ میں دوپہر کو اکثر کوئی پھل کھا کر گذر کر لیتا تھا۔

وہ پھل دار درخت، جن کے پھل لذیذ اور مفید ہوتے ہیں — اور جو جھانسی سے شروع ہو کر دکن تک پھیلے ہوئے میں نے دیکھے اور ان کے پھل ہزاروں بار شکم سیر ہو کر کھائے ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں —

۱ امرود

۲ آمڑا

۳ آم (آم جنگلی بھی ہوتا ہے اور بکثرت)

۴ آنولہ (بڑا درخت)

۵ املی (بہت بڑا سایہ دار درخت ہوتا ہے)

۶ انجیر (نسبتاً چھوٹا لیکن بہت سرسبز سایہ دار درخت)

۷ اچار (چرونجی) (چھوٹی جھاڑیاں جیسی)

۸ بادام (بڑے پتوں کا تناور اور سایہ دار درخت)

۹ پیٹھہ (بیل ہوتی ہے)

۱۰ پھوٹ (بیل ہوتی ہے)

۱۱ تیندو

۱۲ جامن (خوب بڑا اور سایہ دار درخت مگر اس کی شاخیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔)

۱۳ رس بھری (بہت چھوٹی جھاڑی)

۱۴ شریفہ (چھوٹے درخت)

۱۵ شہتوت (اوسط سائز کا درخت)

۱۶ فالسہ

۱۷ کرونده

۱۸ کھرنی

۱۹ کیتھا (بہت بڑا درخت ہوتا ہے لیکن اس کے سائے میں

۲۰ بیٹھنے یا دیر تک کھڑے رہنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ سر پھوٹنے کا شدید خطرہ)

۲۱ کرونده

۲۲ کچری

۲۳ کمرخ (بڑا سایہ دار درخت)

۲۴ کسیرو (پانی میں ہوتا ہے)

۲۵ کندرو

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

۲۶ پھسوڑا (بڑا درخت)

۲۷ لیمو

۲۸ مہوہ (بہت بڑا اور خوب سایہ دار درخت)

۲۹ مکو

۳۰ مولسری (بڑا درخت)

۳۱ گولر (بڑا درخت، اس کا پھول بہت مفید ہے۔ کسی کو ملے تو مجھے بھی اطلاع کرے)

۳۲ سنگھاڑا (نالابوں میں بکثرت ہوتا ہے)

ان کے علاوہ جو پھل ہوتے ہیں وہ جانور ہی کھاتے ہیں اور بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا پھل بھی جن جانوروں کے ہتھے چڑھتے ہیں وہ خوب کھاتے ہیں۔ مثلاً بندر، ریچھ اور گلہری ان پھلوں کو کھاتے بھی ہیں اور گراتے بھی ہیں اس کا یہ فائدہ ہے کہ دوسرے ایسے چرندے جو درخت پر نہیں چڑھ سکتے، زمین پر گرے ہوئے پھل مزے سے لیکر کھاتے ہیں۔ جیسے سانبھر، چیتل، ہرن، چکارے، نیل گائے، وغیرہ۔

ڈھڈیالی سے ہم جس روز نکلے اسی روز بہت دور سے مطلوبہ ہڑیال کی ایک جھلک نظر آئی اس کے بعد سارا دن کوئی سراغ نہیں ملا۔ دوسرے روز ہم منہ اندھیرے ہی نکل کھڑے ہوئے۔ اور سیدھے اس وادی میں اتر گئے جو ڈھڈیالی کے شمالاً جنوباً کئی میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ گذشتہ روز ہڑیالوں کو اسی وادی کے شمال کی پہاڑیوں میں جاتے دیکھا تھا۔ اگرچہ ہم ان میں ہی تمام دن گھومتے رہے لیکن پھر ہڑیال نظر نہیں آئے۔

میں عادتاً اسلم کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ اسلم میری بندوق شانے پر رکھے پانی کی بوتل اور جھولا دوسرے شانے پر لٹکائے پہاڑیوں کو دیکھتا چلتا رہا۔۔۔ ایک جگہ نالے کی نرم ریت پر بڑے "بادل" چیتے کے پیر کے نشان بھی نظر آئے

جو دور تک ملتے رہے اور چٹانیں شروع ہوئیں تو گم ہو گئے۔ اگر خاص طور سے یہی نشان ڈھونڈھنے ہوتے تو شاید پھر تلاش کر لیے جاتے۔

گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ ایک بلند ٹیلے کے گرد گھوم کر نکلے تو سامنے ہی ایک پہاڑی کے دامن پر کوئی بیس ہڑیالوں کا منڈا نظر آیا۔۔۔ فوراً ہی ہم لوگ ٹیلے اور جھاڑیوں کی آڑ میں دبک گئے۔ فاصلہ کوئی ڈیڑھ میل سے زیادہ ہوگا۔ میں ہڑیال تو دیکھ رہا تھا لیکن کوئی بڑا جانور بظاہر مجھے نظر نہیں آیا۔

اسلم کی نظر مجھ سے تیز ہے۔۔۔ ذرا ہی دیر کی کوشش سے اس نے ہڑیال دیکھ لیا۔۔۔ اور ذرا کوشش سے مجھے بھی نظر آگیا۔۔۔ اتنے فاصلے سے صحیح اندازہ تو مشکل تھا لیکن بڑے سینگ۔ اور داڑھی نظر ہی آ رہی تھی۔۔۔ اس وقت میرے ساتھ دوربین نہیں تھی ورنہ دیکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

"بہت دور ہیں۔۔۔"

میں نے کہا۔۔۔

"یہاں سے فائر نہیں ہو سکتا۔۔۔؟"

اسلم نے پوچھا

"نہیں۔۔۔ فاصلہ بہت زیادہ ہے۔۔۔"

"ہم نکلے تو بھاگ جائیں گے۔۔۔"

"ہاں۔۔۔"

میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔۔۔ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے چھپ کر اسٹاکنگ کی جا سکتی، لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔۔۔

"اسلم اب میرے پیچھے رہو۔۔۔ اور خیال رکھنا۔۔۔ ہڑیال تم کو نہ دیکھ سکیں"

"ٹھیک ہے جناب۔۔۔"

اور پھر اسٹاکنگ کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو تمام دن جاری رہا۔۔۔ ہر جھاڑی، ہر پتھر، ٹیلے، پہاڑی، نالے اور گڈھوں کا سہارا لیتے ہم آخر نزدیک آتے گئے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ہڑیال اطمینان لیکن ہوشیاری کے ساتھ بدستور پیٹ بھرنے میں لگے تھے۔ حرکت بھی کرتے رہے۔ جس پہاڑی پر یا پہاڑی کے دامن پر ہم نے ان کو صبح دیکھا تھا وہاں سے تو وہ کب کے ہٹ گئے تھے لیکن بھاگے نہیں۔ آہستہ آہستہ ہٹتے رہے اور ہمارا کام مشکل بناتے گئے۔

عصر کی نماز میں نے قصر کر کے ایک ٹیلے کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے پڑھی وہ بھی تیمم کر کے ۔۔ اور پھر اسٹاکنگ، یہاں سے میں نے ہڑیال کو صاف دیکھا ۔ بڑا پرانا جانور تھا، سینگ بھی بڑے اور داڑھی بھی لٹکی ہوئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہڑیال شام ہونے کے قریب پہاڑی کی چوٹی پر ٹھہر گئے تھے۔ بڑا ہڑیال سامنے نہیں تھا لیکن ایک بڈھی مادہ نگہبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

سورج بڑی تیزی سے مغرب کی طرف پھسل کر گر رہا تھا۔۔

پہاڑیوں کی چوٹیاں گہرے سرخ رنگ سے نہا گئی تھیں، ہوا بھی ساکت تھی۔

اور بڑی اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ہوا کا رخ مخالف تھا۔۔ یعنی ہڑیالوں کی طرف سے میری طرف آ رہی تھی۔ ہم چھپتے چھپاتے اس پہاڑی کے عین نیچے پہنچ گئے ۔۔ تھکاوٹ، بھوک اور پیاس ۔۔ سب ہی ستانے کو تھے، لیکن کامیابی قریب ہی تھی۔ اور اب پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ جھاڑیوں کی آڑ میں زمین پر لیٹ کر ایسے سرکنا کہ نہ آواز ہو نہ کنکر سرکیں نہ اوپر کھڑی بڑی بی ہمیں دیکھ سکیں۔

تقریباً نصف گھنٹے کی نہایت صبر آزما محنت کے بعد ہم اوپر آ گئے۔

اب جس مقام پہ تھے وہ پہاڑی کا آخری حصہ تھا۔۔ اور تقریباً چھ فٹ سیدھی۔ یعنی عمودی دیوار جیسی تھی ۔۔ جس کی آڑ میں ہم چھپے ہوئے تھے۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ کھول کر آہستہ آہستہ بلند ہوا۔۔ اوپر کی سطح ہموار تھی اور چھوٹا سا مسطح میدان بن گیا تھا ۔۔ سارے ہڑیال وہیں ٹھہر گئے تھے۔ کچھ بیٹھ گئے تھے کچھ کھڑے تھے ۔۔ ہماری طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔

بڑا ہڑیال ۔۔ اچانک ہماری ہی جانب گھوما ۔ میں جلدی سے بیٹھ گیا۔۔ فاصلہ بمشکل دس بارہ گز رہا ہوگا۔۔ میں نے رائفل رکھ دی اور اسلم سے بارہ بور کی شاٹ گن لے لی۔۔

اس وقت کی کیفیت بیان کرنا بہت مشکل ہے ۔ کئی روز کی تھکن، محنت اور تلاش کے بعد یہ موقعہ آیا تھا۔۔ اور وہ بھی عجیب موقع ۔۔ اتنے قریب سے فائر کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ میں نے رائفل اسی لیے رکھ دی تھی کہ بہت نزدیک کا فائر تھا۔ ایسے موقعے پہ شاٹ گن اور اس میں SG یا LG کے کارتوس بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔ رائفل سے تو ایک گولی فائر ہوتی ہے اور اتنے قریب سے رائفل کی گولی کا خالی جانا بھی عین ممکن تھا۔ شاٹ گن کے فائر میں یہ آسانی تھی کہ سات یا نو عدد دانے فائر ہو کر بکھرتے ہیں اور خاصا بڑا دائرہ بنا کر کافی رقبہ گھیر لیتے ہیں۔ اس دائرے کے اندر بہرحال ہڑیال کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور آجاتا ہے اور اگر دو دانے بھی لگ جائیں تو جانور کو گرا دیتے ہیں۔

میں نے شاٹ گن سنبھال کر ہمیر چڑھا دیئے ۔۔ اور دونوں ہاتھوں میں بندوق سنبھالے اوپر دیکھنے کے لیے اٹھا۔۔ ابھی پوری طرح اٹھا بھی نہیں تھا کہ ہڑیال کنارے کی طرف آتا نظر آیا اور میں وہیں دبک گیا۔ وہی بڑا ہڑیال ۔۔ وہ سیاہ سینگ اور داڑھی ۔۔ اس کو ضرور شک ہو گیا تھا۔۔

سارے جانوروں کی فطرت ہے کہ اگر کوئی مشکوک چیز ہو تو ضرور اس کی طرف بڑھ کر اپنا شک دور کر لیتے ہیں۔

وہ ہڑیال بھی بڑھ کر کنارے کی طرف آ رہا تھا۔۔ اگرچہ ہڑیال کی نزدیک کی نظر کمزور ہوتی ہے۔

میں نے شاٹ گن فائر کی پوزیشن میں لے لی۔

ہڑیال کی تھوتھنی نظر آئی ۔۔ پھر سارا چہرہ سامنے آیا۔۔ پھر پورا سر ۔۔ پھر اور آگے بڑھا۔۔ میں نے سر نشانے پہ لے رکھا تھا۔۔ ذرا اور آگے آیا تو سر اور گردن کا

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

آڈار ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں اسلم ہڑیال کو سنبھالے بیٹھا ہے۔ ہڑیال کا پیٹ چاک کر کے آلائش نکالی جا چکی ہے۔ سینگوں کی پیمائش پچیس انچ سے ذرا زیادہ۔

ایک حصہ نظر آیا اور میں نے ٹریگر دبا دیا — دھماکا — شانے پر فائر کاری کوائل — اور ہڑیال جہاں کھڑا تھا وہیں گر گیا —

اسلم اُٹھ کر دوڑا — اور اوپر چڑھ گیا —

میں نے بھی اس کی تقلید کی — ہڑیال گر کر بیر ہوا میں چلا رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر کمر کی بلٹ سے چھرا نکالا اور اسلم نے ہڑیال کو پکڑا تو میں نے پرانے سینگوں والے کو جنت کی خاک بنا دیا اور سجدۂ شکر ادا کیا — البتہ سینگ ایسے بڑے ثابت نہیں ہوئے — تصویر اوپر دیکھی جا سکتی ہے جو ریسٹ ہاؤس آ کر کھینچی گئی۔

اور اسلم ہڑیال کے سینگ پکڑے بیٹھا نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بیان بھی صحیح منظر کشی نہیں ہے۔ یہ آدم خور شیر کا قصہ ہے جو کچھ میں نے ہڑیال کے بارے میں لکھ دیا وہ محض اپنی طبعی مسرت سے مجبور ہو کر۔ یہ منظر بھی ان چند خصوصی شکاری اتفاقات میں سے ایک ہے۔ جن کے بارے میں تنہائی میں جب بھی سوچتا ہوں تو طبیعت میں ایک عجیب خوشی، ایک عجیب انبساط کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اچھادر سے اطلاع آنے میں چار روز لگے — چوتھے روز شام کو سپاہی وارد ہوا اور چھوٹے بھائی کا خط مجھے دیا — مطلب کی بات صرف اتنی تھی۔

"عورت کو کسی درندے نے مارا ہے — کھایا بھی ہے — ادھ کھائی لاش ملی — اب یہ کیسے کہا جائے کہ یہ حرکت شیر کی ہے یا چیتے کی — بارش کی وجہ سے کوئی نشان نہیں ملتا — لیکن یہ پکی بات ہے کہ وہ عورت کسی درندے کا شکار ہوئی ہے۔ اس علاقے میں چیتے بھی ہیں اور بعض بہت بڑے چیتے ہیں۔ جن کی جسامت اور ساکھ دیکھ کر شیر کا شبہ ہوتا ہے۔

تم جب بھی آؤ پورے انتظام سے ہی آنا — بارش رک گئی ہے لیکن ندی نالے خوب چڑھے ہوئے ہیں۔"

میں نے سپاہی کو تو واپس کر دیا — تیار تو میں ضرور تھا لیکن کچھ طبیعت موزوں نہیں تھی — میں نے سوچا ایک دو روز ٹھہر کر جانا چاہیئے اور وہ ٹھہرنا اچھا ہوا — دوسرے ہی روز مجھے نزلہ ہو گیا — اور کئی روز طبیعت خراب رہی — اس عرصے میں اچھادر سے ایک اور سپاہی چھوٹے بھائی کا پیام لے کر آیا اور معلوم یہ ہوا کہ اسی درندے نے ایک اور واردات کی۔

وہ یوں کہ —

گاؤں کا ایک کسان منہ اندھیرے اپنا ہل شانے پر رکھے گھر کے احاطے سے نکلا۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

بیل ساتھ لیے اور کھیتوں کی طرف چلا — وہ مقامی لباس پہنے تھا — مسلمان ہونے کی وجہ سے تہمد — چھوٹی بنڈی — اس پر ایک روئی بھرا شلوکہ اس لیے کہ سردی کا زمانہ تھا، اور سر پر پگڑی — کئی گاؤں والے اس وقت گھروں سے نکل کر اسی طرح ہل بیل لے کر کھیتوں کی طرف جانے کی تیاری میں تھے — لیکن کوئی ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا — سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے — البتہ اس کسان کو ہل شانے پر رکھے بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیت کی طرف جاتے کئی دیہاتیوں نے دیکھا —

اور وقت گذرتا گیا —

سب اپنے اپنے راستے پر چل دیے — کسی کو کوئی شبہ یا فکر نہیں تھا — رجی کی موت کو سب نے اتفاقی واردات خیال کیا تھا —

ایک کسان اس راہ پر نکلا جس پر پہلا آدمی گیا تھا — اس کو ایک طرف پگڈنڈی کے ساتھ ہی ہل پڑا نظر آیا — ہل — اس طرح بے جگہ — اور ہل بھی جانا پہچانا — اس نے قریب جا کر دیکھا تو وہ ہل جمال کا تھا تھوڑی دور پر ہی دونوں بیل اس جگہ سے فاصلے پر کھڑے نظر آئے اور وہ بھی اس لیے کہ ان کی ناتھیں درختوں یا جھاڑیوں میں اٹک گئی تھیں — سارا معاملہ مشکوک سا معلوم ہوا۔

فوراً ہی اس نے شور مچایا — جو لوگ کھیتوں میں چلے گئے تھے وہ واپس آ کر وہیں جمع ہو گئے، جو لوگ گاؤں میں تھے وہ بھی نکل آئے۔ اور جمال کی تلاش میں نکلے جلد ہی شیر کے ماگھ، گھسیٹے کے نشانات اور کسی قدر مدافعت کی علامات بھی مل گئیں — اور یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ ایک دفعہ پھر کوئی المیہ رونما ہوا ہے۔

اس مقام سے کوئی آدھ میل پر جمال کی تہمد جھاڑی میں الجھی ملی — جس میں خون بھی بھرا تھا — جمال کی گھر والی کو بھی اطلاع مل چکی تھی اور اس کے بین کی آواز کھوجیوں اور تلاشیوں کا تعاقب کر رہی تھی — بچے بھی رو رہے تھے۔

آگے چل کر جھاڑیوں اور کانٹوں میں شلوکے کی دھجیاں بھی ملتی گئیں — لیکن اس جگہ کے بعد سے شیر — یا چیتا — ایسے علاقے میں گھسا تھا جہاں جانا

ممکن نہیں تھا — لیکن کسی نہ کسی طرح تلاش جاری رکھی گئی — تاہم دوپہر تک کوئی نشان اور نہیں ملا — سورج ڈھلنے لگا تو لوگ واپس آ گئے — اب جمال کی موت اور واقعے کی اصلیت سب واضح تھی۔

دوسرے روز صبح پھر تلاش جاری کی گئی — اور شام کو ختم کر دی گئی جمال کی لاش کا کوئی پتہ نہیں لگا، اب پولیس کو اطلاع کی گئی — واردات کے تیسرے روز اچھاور سے پولیس کی ایک پارٹی گاؤں آئی اور تمام دن گاؤں والوں کی مہمان نوازی کا امتحان لے کر — اور بیانات قلمبند کر کے — دوسرے روز واپس گئی — جمال کی لاش نہیں ملی —

مجھے نارمل ہوتے ہوتے پندرہ دن گذر گئے۔

ایک سرد جمعے کی صبح تھی — فجر کی نماز پڑھ کر میں نے لباس تبدیل کیا — اور باہر آیا تو جیپ بالکل تیار تھی — میں رات کو ہی سب کو اپنی روانگی کا الٹی میٹم دے چکا تھا — اور ہتھیاروں کے سوا جیپ پر میری ضروریات کا سب سامان رکھا جا چکا تھا — میرے ہتھیاروں کو میرے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا — میں نے چار سو پچاس ایکسپریس کا بکس جیپ پر رکھوایا — شاٹ گن کا بکس رکھوایا، اور تین سو چھتر ہالینڈ اینڈ ہالینڈ کور میں بند کر کے رکھوائی۔

اسی زمانے میں مجھے میرے ایک عزیز نے تھرٹی اسپرنگفیلڈ تحفتاً دی تھی۔ وہ ہاتھ میں لی اور جیپ پر بیٹھ گیا — احسن ساتھ تھا وہ پیچھے بیٹھا، اور ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کی اور اچھاور کی طرف چل دیا — ہم نے جمعے کی نماز اچھاور میں پڑھی۔

شام کی چائے پر چھوٹے بھائی نے ان وارداتوں کا قصہ چھیڑا — اور رات گئے تک اس موضوع پر ہی گفتگو رہی — سنیچر کو میں اچھاور میں ہی رہا — احسن نے خوراک کا ضروری سامان یہاں سے خرید لیا — اور اتوار کی صبح کو فجر کی نماز کے بعد ہی تین بیل گاڑیوں کا قافلہ اچھاور سے نکل کر موقعہ واردات —

http://updf.weebly.com

یا میدان جنگ کی طرف چل پڑا۔

سردی کا زمانہ ویسے تو خزاں کا دور ہوتا ہے — لیکن مالوے کے جنگلوں میں خزاں کا گذر نہیں۔ سبزی اور شادابی جس چیز کا نام ہے وہ تو اسی علاقے میں ہوتی ہے۔ بارش کے شفاف پانی میں نہائی دھلی درختوں کی پتیاں — اتنی گہری سبز ہوتی ہیں کہ دیکھنے سے آنکھوں کو تسکین اور آرام ملتا ہے — حد نگاہ تک پھیلے ہوئے اونچے نیچے پہاڑ شاداب اور سرسبز درختوں کا لباس پہنے نیلگوں آسمان کے پس منظر کے ساتھ کسی لاثانی مصور کے شاہکار کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ اور ان کی آغوش میں مچلتے ہوئے ٹھنڈے، صاف شفاف پانی کی ندیاں اور چشمے۔ یوں بل کھاتے چلے جاتے ہیں جیسے کسی نے رنگینیوں کے درمیان سفید سفید لکیریں کھینچ دی ہوں —

پہاڑیوں کے دامنوں پہ ملے جلے رنگوں کے سرخ، بنفشئی، اودے، نیلے، پیلے، پھول، ایسے لگتے تھے جیسے سبز قالینوں پہ رنگین لباسوں میں ملبوس ننھی ننھی پریاں رقص کر رہی ہوں —

ایسے ہی دلنواز مناظر کو مصور اپنے موئے قلم کی جنبش اور رنگوں کی آمیزش سے کینوس پہ منتقل کرتے ہیں تو وہ لوگ جو ان مناظر سے ان کے قدرتی ماحول میں لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مصوری کے ان نقوش کو دیکھ کر مصور کی مہارت پہ متحیر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصور نے جن مناظر کے مشاہدے کے بعد ان نقش کو تخلیق کیا، وہ قدرتی مناظر کس قدر دلکش ہوتے ہوں گے۔

تر و تازہ ہوا کے نرم نرم جھونکوں میں جھومتے ہوئے سرسبز و شاداب درخت۔

بارش میں نہائی ہوئی ہری پتیوں سے لدی ہوئی جھاڑیاں —

دھلا ہوا سبزہ — جیسے کسی نے ساری زمین پہ لاجوردی فرش بچھا دیا ہو۔

نہ دھوپ زیادہ گرم — نہ ہوا زیادہ سرد —

ایسی حسین جگہیں کہ —

جی میں آتا ہے یہیں مر جائیے۔

ان مناظر سے گذرتی بیل گاڑیاں — دوپہر کے ذرا دیر بعد گاؤں میں وارد ہوئیں — تین بیل گاڑیوں پر صرف میرا ہی کارواں نہیں تھا — میرے سامان کے لیے تو ایک ہی گاڑی کافی تھی — دو گاڑیاں ان مسافروں کی تھیں جو اچھاور سے گاؤں آنا چاہتے تھے اور درندے کے خطرے کے پیش نظر الگ الگ سفر کرنے کے بجائے ایک قافلے کی شکل میں سفر کرنا زیادہ محفوظ سمجھتے تھے۔

گاؤں والے مجھے تو نہیں جانتے تھے۔ لیکن شکاری کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ لوگ اس کو جانتے ہوں — جس علاقے میں درندہ وارداتیں کرتا ہے۔ وہ علاقہ تو گاؤں والوں کے لیے مصیبت اور ہلاکت کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ اور جو شخص ان کی مصیبت کو دفع کرنے کی سعی کرے۔ وہ لوگ طبعاً اور لازماً اس شخص کا دل سے استقبال کرتے ہیں — بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں تن تنہا۔ رپنی رائفل لیے کسی انجانی آبادی میں وارد ہوا ہوں — اور گاؤں والوں نے میری مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

البتہ اس موقعے پر میرے ساتھ ایک سپاہی میاں بھی تھے — جنہوں نے گاؤں کے مکھیا — مجروا — سے تعارف کرایا — مجروا کا اصل نام تو مظہر تھا — لیکن گاؤں والوں نے اس کو لگاڑ کر خالص مقامی رنگ دے دیا تھا —

مجروا نے میرا سامان بخوشی اپنے کوٹھے میں رکھوایا — اور میرے آرام کا ہر وہ سامان مہیا کر دیا جس کی مجھے ضرورت ہو سکتی تھی۔

میں نے گاؤں کے کنویں کے پانی سے غسل کیا — اگرچہ سردی تھی، لیکن قدرت کا انتظام یہ ہے کہ سردیوں میں کنوئیں کا پانی گرم ہوتا ہے — نہا کر ساری تھکن دور ہو گئی — لباس تبدیل کر کے میں نے کنوئیں کی جگت پہ ہی ظہر کی نماز قصر کر کے ادا کی، اس کے بعد قیامگاہ واپس آ گیا۔ کھانا ساتھ تھا — احسن نے گرم کر کے دسترخوان بچھا دیا — اور میں نے کھانا کھایا۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کھانے کے بعد احسن نے سب کو رخصت کر دیا تو میں نے ایک گھنٹہ آرام کیا اور غالباً سو گیا۔ عصر کے وقت اُٹھ کر وضو کیا اور عصر کی نماز ادا کی۔ اس دوران مجروا، سپاہی اور گاؤں کے دوسرے لوگ سب جمع ہو گئے اور ہر شخص نے اپنی اپنی اہلیت کے مطابق وارداتوں کی روداد مجھے سنائی۔ اس میں قیاس آرائیوں کا سلسلہ بھی تھا۔ خیالی پلاؤ بھی تھے۔ مبالغہ بھی۔ اور اظہار قابلیت بھی۔ میں اس قسم کی طویل داستانیں صبر و سکون کے ساتھ سننے کا عادی ہوں۔

گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کو سب سے زیادہ مسرت اس بات سے ہوتی ہے کہ کوئی شخص۔ خصوصاً بظاہر ان سے زیادہ عقلمند اور مہذب۔ ان کی بات دلجمعی کے ساتھ سن لے۔ ایسے شخص کی وہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور خدمت میں ہر طرح حاضر رہتے ہیں۔

غرض اسی طرح یہ دن ختم ہوا۔ رات کو میں نے احسن کی مدد سے تین سو چھبیس میگنم صاف کر کے کور میں بند کر دی۔ چار سو پچاس ایکسپریس نکال کر جوڑ دی اور صاف کر کے تیار کر دی۔ اسی طرح احسن نے بارہ بور بھی صاف کر کے اچھی طرح دیکھ بھال کر کے رکھی۔ جو ہتھیار مجھے دوسرے روز صبح ساتھ نہیں لیجانے تھے وہ مجروا کے گھر بحفاظت رکھوا دئیے گئے۔ سپاہی میاں بھی وہیں مقیم ہو گئے تھے۔

دوسرے روز میں فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کر کے تیار ہوا اور سورج چڑھتے چڑھتے پوری جنگی تیاریوں کے ساتھ میدان جنگ میں وارد ہوا۔

میں نے اس مقام کو تو قطعی نظر انداز کر دیا جہاں رجی ماری گئی تھی۔ اس لئے کہ بارش کے دن تھے اور اتنے روز گذرنے اور اتنا پانی پڑنے کے بعد اس مقام پر نشانات کی موجودگی ناممکن تھی۔

میں نے ادھر کا رُخ کیا جدھر جمال غائب ہوا تھا۔ احسن کے علاوہ گاؤں کے دو ایسے آدمی بھی میرے ساتھ تھے جو جمال کی لاش ڈھونڈھنے والی جماعت میں شامل رہ چکے تھے اور انہوں نے مجھے سب سے پہلے وہ مقام دکھایا جہاں

جمال کا بل پڑا ملا تھا۔ یہاں چہ دکچی کی دو بڑی گنجان جھاڑیاں تھیں جو کافی دور تک پھیل گئی تھیں۔ درندہ ان جھاڑیوں میں ہی چھپ کر بیٹھا رہا ہوگا۔

یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جانوروں۔ بلکہ درندوں۔ کے پیروں کے نشانات عام پگڈنڈیوں، گذرگاہوں یا کھلی جگہوں پہ باقی نہیں رہتے۔ اگر انسان اور مویشی اس طرف سے گذر کر ان نشانات کو مٹا نہ دیں تو کم از کم ہوا سے گرد اور پتے اڑ کر ہی ان نشانات کو مفقود کر دیتے ہیں۔ لیکن جھاڑیوں میں یہ نشانات عرصے تک قائم رہتے ہیں۔ کیونکہ ان تک گرد بھی کم پہنچتی ہے انسانوں اور مویشیوں کے قدم تو پہنچتے ہی نہیں۔

میں نے احسن سے کہا کہ جھاڑی میں گھسے۔ گاؤں والوں نے بھی گھسنا چاہا مگر میں نے ان کو روک دیا۔ اور احسن تنہا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس کو معلوم تھا کہ میں نشانات کی تلاش میں ہوں۔ ہم چار آدمی وہاں کھڑے تھے اس کے باوجود احسن کے جھاڑی میں گھستے ہی دو خرگوش نکل کر بھاگے چلے گئے۔ ہم لوگوں کو وہاں دیکھ کر وہ جھاڑیوں میں دبکے رہے تھے۔

احسن چند منٹ میں ہی نکل آیا۔

"جناب خرگوشوں نے نشانات مٹا دئے ہیں۔ لیکن ایک پرانا نشان آدھے ناگھ کا ہلکا سا رہ گیا ہے۔"

اچھا۔ میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے جھاڑی میں گھس کر نشان دیکھا، اور ذرا غور کرنے سے اندازہ ہوا کہ شاید بڑے چیتے کے پیر کا نشان رہا ہو۔

کوئی خاص نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکا۔

میں نے گاؤں کے دونوں جوانوں کو چھٹی دیدی اب ان کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم گاؤں سے رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے اور اس خطے کے قریب چلنے لگے جہاں گنجان جھاڑیوں نے بہت ہی دشوار گذار جنگل سا بنا دیا ہے اور جس میں گاؤں والے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

نہ خود گھس سکے نہ مویشیوں کو اس گھنے خطے سے گذار سکے۔

ہم اسی گھنے جنگل کے کنارے کنارے دو میل چلے کسی جگہ ایسی حالت نہیں تھی کہ اس میں گھس سکتے۔ احسن نے ایک نزدیکی درخت پر چڑھ کر بھی دور تک علاقوں کا جائزہ لیا اور بتایا کہ جھاڑیوں کی یہی شکل دو تین میل کے فاصلے پر پہاڑ تک چلی گئی ہے، بلکہ پہاڑ کا دامن بھی اسی طرح کی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے۔

یہ بڑی دشوار اور خطرناک صورت حال تھی۔ اتنے گھنے اور وسیع جھاڑی والے علاقے میں گھسنا قطعاً خلافِ عقل تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ جمال کی لاش کے باقی ماندہ حصے اسی خطے میں ہی ہوں گے۔ بہرحال احسن سے میں نے کہا کہ جھاڑیوں سے چالیس گز کا فاصلہ قائم رکھتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے۔

جابجا بڑے بڑے درخت، جھاڑیاں اور بیلیں بکثرت پھیلی ہوئی تھیں۔

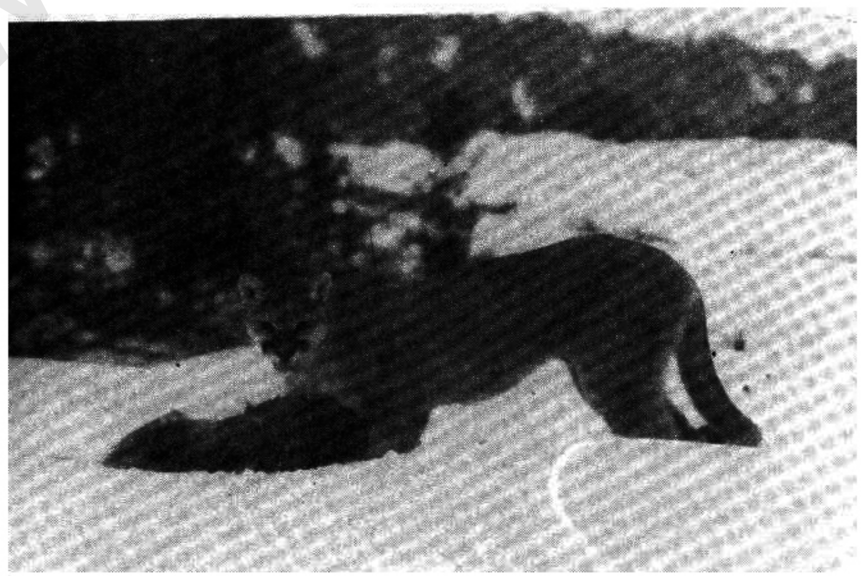

پوما یا پہاڑی شیر

اور کوئی چار میل اسی طرح چلتے رہنے کے بعد ہم اس نالے کے کنارے پہنچ گئے جس کا گاؤں والوں نے تذکرہ کیا تھا اور جو ان دنوں بھی بارش کی وجہ سے بہہ رہا تھا۔ گہرا تو نہیں تھا۔ پانی اُتر چکا تھا لیکن جو کچھ اصل بہاؤ ہوتا ہوگا وہ قائم تھا۔ پانی کے بہاؤ کا رخ کسی وادی کی طرف تھا اور نکاس اس پہاڑ سے جس کے دامن پر گھنی جھاڑیوں کے جنگل کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ نالے کے دونوں کناروں پر بھی خوب تناور درخت جنگل اور جھاڑیاں تھیں۔ میں ہمیشہ ایسی جگہوں سے گھبراتا ہوں جہاں کافی محفوظ فاصلے تک کھلی جگہ نہ ہو یا دور تک نظر نہ آ سکے۔ کوشش یہی رہتی ہے کہ کم از کم تیس چالیس گز کھلی جگہ چاروں طرف رہے اور اس کی وجہ شیر۔ یا آدم خور شیر۔ کا خطرہ ہے۔

اگرچہ آدم خور شیر کے بارے میں اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مقررہ فاصلے سے ہی حملہ کرے گا۔ اس کو تو جب اور جہاں داؤ لگ جائے دبا بیٹھتا ہے۔ عام طور سے شیر تیس گز کے فاصلے سے حملہ کرتے ہیں۔ البتہ یہ حملہ اتنا سریع اور اس قدر نپا تلا ہوتا ہے جو کبھی خالی نہیں جاتا۔ الا اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی خاص عنایت سے زندہ رکھنا چاہے اور اس برق رفتار حملے سے بھی بچا لے۔ ایسے انسان انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں جن پر شیر نے حملہ کیا اور بچ گئے۔ ان خوش نصیبوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ الحمدللہ۔

میرے ہاتھ میں دونالی چار سو پچاس ایکسپریس تھی۔ شاٹ گن احسن شانے پر لٹکائے تھا۔ اس کی ایک نال میں چار نمبر کے چھرے کا کارتوس لگا تھا۔ دوسری نال میں گولی۔

شاٹ گن کی دونوں نالوں کا بور یکساں نہیں ہوتا۔ اکثر فرق ہوتا ہے۔ یعنی دائیں نال سلنڈر اور بائیں چوک ہوتی ہے۔ اگر بندوق اس قسم کی ہو تو کارتوس لگاتے وقت بہت خیال اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی لاپرواہی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ہم اس گھنے خطے کے ساتھ ساتھ چلتے کوئی ڈھائی تین میل نکل آئے — ایک مقام پہ کوئی دس پندرہ چیتلوں کا منڈا دور سے نظر آیا - ایک اور جگہ ایک نر چکارا بھی ملا — چکارا بالعموم جھاڑیوں میں چھپا رہنے والا جانور ہے - اور کم نظر آتا ہے — اس کے فرار میں بھی خاص تکنیک ہوتی ہے اور تاوقتیکہ شکاری اس تکنیک سے واقف نہ ہو، چکارے کو جھاڑی میں چھپ جانے کے بعد تلاش کر لینا ناممکن ہے۔

دوپہر ہونے کو تھی۔ ہم نے گاؤں سے چلتے وقت فاصلے کا اندازہ کوئی سات میل کیا تھا — لیکن نالے پہ پہنچ کر خیال ہوا ہم تقریباً دس میل راہ طے کر چکے تھے۔ اور وہ پہاڑی جس کے سرے تک گھنی جھاڑیوں کا جنگل پھیلا تھا اب بھی چار پانچ میل دور نظر آتی تھی — اب یہ تو بالکل یقینی بات تھی کہ شیر اس گھنے جنگل میں چھپا رہتا ہوگا جو کئی میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس سے بہتر جگہ اس کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

سوال یہ تھا کہ اس گھنے اور خطرناک علاقے میں کیسے گھسا جائے —!

میں نے ایک مقام پر ٹھہر کر صورت حال پہ ذرا دیر تک غور کیا۔ جنگل کی کیفیت کا از سر نو جائزہ لیا — ایک ایک چپے کو بہت احتیاط سے دیکھا۔

اور ابھی اس مقام پہ ٹھہرے ہوئے دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ احسن نے یکبارگی گھبرا کر مجھے بازو سے پکڑا اور عین پشت کی طرف اشارا کیا۔ جیسے وہ بوکھلا گیا ہو — اس کی گرفت کسی قدر گستاخانہ تھی۔

میں پھرتی سے گھوما اور رائفل شانے پہ آ گئی —

احسن نے جن جھاڑیوں کی طرف اشارا کیا ادھر سے ہی گزر کر ہم ابھی آئے تھے۔ اور فاصلہ کوئی پچاس ساٹھ گز — اس کے بعد کھلا میدان تو نہیں لیکن ایک جانب کشادہ نالے کا دامن تھا جس پہ نسبتاً جھاڑیاں کم اور چھوٹی تھیں اور چھدری بھی۔ ان میں کوئی جانور چھپ تو نہیں سکتا تھا — لیکن میں نے اپنی نگاہ کے

خط مستقیم کی راہ میں حائل جھاڑیوں کے اندر سے دیکھنا چاہا تو نظر جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گئی — اور یہ طے نہیں کر سکا کہ جھاڑیوں میں کچھ ہے کہ نہیں ہے۔

میں نے احسن سے پوچھا کیا تھا —

جناب شیر — یا چیتا —

اب یہ جواب بھی نہایت مہمل معلوم ہوا — احسن نہ تو بچہ تھا — نہ کوئی ناتجربہ کار شکاری کہ شیر اور چیتے کا فرق نہ جانتا ہو۔

میں نے کسی قدر ناگواری کی نظر سے احسن کو دیکھا — اور پھر نظر ان جھاڑیوں پہ ہی جما دی، مگر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا — اس طرح کوئی دس منٹ گذر گئے تو میرے ہاتھ، بازو اور شانے شل ہونے لگے میں نے ہاتھوں کو آرام دینے کے لیے رائفل نیچے کر لی۔

احسن اس دوران دوسری سمتوں میں جھاڑیوں پہ نظر رکھے تھا —

ہم نے اس جگہ سے حرکت نہیں کی۔

آدھ گھنٹہ گذرا — ایک گھنٹہ گذر گیا — ایک جگہ کھڑے کھڑے — اور وہ بھی قطعاً بے حس و حرکت — نہ صرف جسم خستہ ہو گیا بلکہ ذہن اور نظر بھی —

میں سمجھتا ہوں ایک عام شخص اتنی دیر صبر و سکوت کے ساتھ ایک جگہ کھڑا بھی نہیں رہ سکتا — یہ استقامت اور اطمینان شکاری کی صفات حمیدہ میں سے چند معمولی علامات ہیں۔

اور یہ صبر و سکوت ہمیشہ اچھا ہی نتیجہ دیتا ہے۔

اتنی دیر گذر جانے کے بعد —

وہی پچاس ساٹھ گز دور کی جھاڑیوں کی آڑ سے ایک بہت بڑا سر برآمد ہوا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس درندے نے جھانک کر ہم کو دیکھنا چاہا — جتنی دیر ہم اپنی جگہ پہ بے حس و حرکت ساکت و جامد رہے تھے اتنی دیر وہ بھی نہایت صبر کے ساتھ جھاڑی میں چھپا بیٹھا رہا — ہمارے صبر کا ساغر چھلکنے کو تھا

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ادھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا — اگر وہ ذرا دیر اور نہ جھانکتا تو ہم ضرور حرکت کرتے۔ اور اس آزمائش میں ہم شکست کھا جاتے — لیکن ہم زیادہ صابر ثابت ہوئے اور اس جانور کو حرکت کرنا پڑی۔

میں نے جب احسن سے درندے کے بارے میں پوچھا تو اس نے قطعی جواب نہیں دیا اور مجھے ناگوار ہوا —

اب میں نے خود اس جانور کی جھلک دیکھی — لیکن میں اس سر کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ شیر ہے یا چیتا — اس نے جھانک کر سر فوراً اندر کھینچ لیا تھا۔

اور اب —

پھر وہی تعطل —

"احسن —"

"جناب —"

"پیچھے دیکھتے رہنا — یہ جانور اب دوسری جانب سے حملے کی کوشش کرے گا —"

"جی جناب —"

وہ بندوق ہاتھوں سنبھالے میری طرف پشت کیے کھڑا تھا — اور اس کے جواب کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مضطرب ہے۔

کیوں — ؟

اضطراب کی یہ کیفیت مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی — اور وہی سوال پیدا ہوتا تھا —

کیوں — ؟

شیر — یا — چیتا — یا کوئی اور درندہ — میرے لیے — یا احسن کے لیے۔ اضطراب کا باعث کیوں تھا۔

پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ کوئی جانور اتنی تیزی سے طے نہیں کر سکتا کہ میں

اس پر کم از دو فائر نہ کر سکوں اور اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت شامل ہو تو دو میں سے ایک گولی کا نشانے پر لگنا یقینی ہو سکتا ہے۔

تو پھر اضطراب — ؟

اور مجھے یکبارگی خطرے کا زبردست احساس ہوا —

یہ ایک قدرتی حس ہوتی ہے — اور ذرا سی کوشش اور توجہ سے اتنی مضبوط اور صحیح ہو جاتی ہے کہ خطرے کا احساس قبل از وقت ہو جاتا ہے اور اگر توجہ سے کام لیا جائے تو احساس ہوتے ہی خطرے سے مقابلے کے لیے آمادہ ہوا جا سکتا ہے — اور یقینی کامیابی کے ساتھ۔

میری یہ حس بہت قوی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس معاملے میں خطا — یا تاخیر ہوئی ہو — البتہ ایک بار مجھ سے خطرے کے احساس کا تجزیہ کرنے میں خطا ہوئی۔ اور اس کی سزا بھی بھگتنا پڑی — یہ واقعہ میں اپنی گزشتہ شائع شدہ کتاب میں بیان کر چکا ہوں —

اور ابھی میں خطرے کا صحیح تجزیہ کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ احسن چیخا —

"صاحب — سانپ —" میری رائفل شانے پر جھول گئی —

میں گھوما — احسن کے ہاتھ سے چشم زدن میں بندوق لی — سامنے جدھر احسن نے اشارا کیا دیکھا —

صرف دس گز کے فاصلے پر — کنگ کوبرا — اور حملہ آور —

میں نے نشانہ لیا —

اس عرصے میں وہ نسل انسانی کا دشمن سات آٹھ گز پر آ گیا — اس کی رفتار بھی تو غضب کی ہوتی ہے —

میں نے بندوق کے ہمبر کا بٹن کھسکایا —

اب فاصلہ پانچ گز ہی رہا ہوگا —

میں نے اس کے سر سے ایک دو انچ آگے نشانہ لے کر بائیں نال فائر کی۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

چار نمبر کے چھرے — اور اتنے قریب سے — پھر چوک سے فائر ہوتے ہیں تو بندھے ہوئے جاتے ہیں — سانپ کے تو چیتھڑے اڑ گئے۔

فائر کی آواز سے جنگل میں تہلکہ مچ گیا۔ آواز تو فوراً ہی جنگل میں گم ہو جاتی ہے۔ لیکن پرندے دیر تک شور کرتے رہتے ہیں —

سانپ کے ٹکڑے جمع بھی نہیں ہو سکے — بوٹیاں اڑ گئی تھیں۔ لیکن احسن نے کچھ ہی فاصلے پر اس کی کینچلی تلاش کر لی — اور خوبی یہ کہ پوری کینچلی بالکل صاف اور مکمل تھی ذرا سی بھی خراب نہیں ہوئی تھی — میں نے اس کینچلی کو اپنے گلے اور ہاتھ میں لپیٹ کر فوٹو کھنچوایا جو اگلے صفحہ پہ دیکھا جا سکتا ہے — یہ کینچلی نو فٹ لانبی ہے۔ اور ایسی حالت میں خشک ہو کر کافی سکڑ جاتی ہے — قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کہ سانپ کی لمبائی غالباً دس فٹ سے زیادہ رہی ہو گی اور موٹائی بھی اس مناسبت سے — مردہ سانپ کے جسم کے جو حصے بچ رہے ان سے اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ موٹائی ایک عام انسان کے بازو سے زیادہ ہی رہی ہو گی۔ میں نے ٹیپ نکال کر پیمائش کی — مردہ جسم کا ٹکڑا جو سکڑ چکا تھا — بارہ انچ قطر تھا۔ گویا ایک فٹ —!

رفتار کی سرعت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ غالباً — تیس چالیس میل فی گھنٹہ — لیکن تھوڑے فاصلے تک یہ رفتار ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ تک ہو سکتی ہے — اس لئے کہ سانپ جب نزدیک سے حملہ کرتا ہے تو اس کی حرکات میں برق رفتاری ہوتی ہے۔

اب اس درندے کی موجودگی کا تو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا،

لیکن میں اور احسن اس جھاڑی تک آئے اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ماگھ بہت بڑے چیتے کا تھا — اور یہ چیتا گھاس اور جھاڑیوں کے قطعے سے نکل کر نہیں آیا تھا بلکہ بڑی دور سے ہمارا تعاقب کرتا رہا تھا — میں نے کوئی نصف میل تک جا کر صرف اس تحقیق پر وقت صرف کیا کہ واقعی اس نے ہمارا تعاقب

کیا ہے یا نہیں — اور یہ بات قطعی ہو گئی —

پھر وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چھپا رہا — اور ہم پہ ایک گھنٹے تک تاک لگائے رہا — وہاں اس کے بیٹھے رہنے کے واضح نشانات تھے۔

آخری مرحلہ اس کے بھاگنے کے رُخ کا تھا۔

قدرتی حرکت تو یہ ہوتی کہ فائر کی آواز کے بعد چیتا سیدھا ان جھاڑیوں کی طرف ہی جاتا جنھوں نے میلوں قطعۂ زمین پر قبضہ کر رکھا تھا — چھپنے کی قدرتی جگہ وہی تھی — اس کے برعکس چیتا سیدھا نالے کی طرف بھاگا اور پانی کی وسعت کو ایک چھلانگ میں ہی عبور کر کے، دوسرے کنارے کے چھدرے جنگل میں میں گھس گیا۔

اگرچہ یہ حرکت ایک اضطراری فرار بھی کہی جا سکتی ہے — لیکن ایک تجربہ کار شکاری کے لیے یہ کچھ اور معنی رکھتی ہے۔

حالت اضطراری میں ہر جانور — چرند یا درند — ہمیشہ اپنی رہائش گاہ — یا جولاں گاہ کا رخ کرتا ہے۔ یہ گویا ایک فطری حرکت ہوتی ہے — نظر، قدم، ذہن، سب اس راہ پر چل پڑنے کے عادی اور آمادہ ہوتے ہیں۔ جہاں وہ جانور مستقل رہتا ہو — شیر چیتے کے معاملے میں اس مقام کو HOLDING GROUND بھی کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ میں نے ہرن، سانبھر، چیتل، چنکارے، اور بڑ پال کو بھی زخمی ہو کر یا ڈر کر سیدھا اپنی ہولڈنگ گراؤنڈ کی طرف بھاگتے دیکھا ہے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے قیاس کے عین خلاف — غالباً — چیتا اس گھنے جھاڑی والے علاقے میں نہیں رہتا تھا۔

جدھر وہ بھاگ کر گیا تھا ادھر پہاڑیاں تھیں، جو دور سے تو جنگل اور درختوں سے ڈھکی نظر آتی تھیں — لیکن کہیں صاف چٹانیں بھی عیاں تھیں — ماگھ کی بزرگی غمازی کرتی تھی کہ وہ چیتے کا پیر نہیں — بڑا شیر ہے — احسن بھی ذرا دیر مخمصے میں رہا۔ اور میں بھی غور کرتا رہا — لیکن پھر ہم دونوں نے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ نشان چیتے کا ہی ہے۔ شیر اور چیتے کے ماگھ کی شناخت آتنی آسان نہیں۔ اگر چیتا بڑا ہو تو ماگھ کی تمیز مشکل ہو جاتی ہے ۔۔۔ تاوقتیکہ آدمی۔ شکاری ۔۔۔ نشاناتِ قدم کی شناخت کا پورا تجربہ نہ رکھتا ہو ۔۔

لیکن ۔۔ یہ جس چیتے کے ماگھ تھے وہ جسامت میں کسی طرح اچھے بڑے شیر سے کم نہیں تھا ۔۔۔ اب میں یہ فیصلہ کیسے کر لیتا کہ وہ آدم خور ہی ہے ۔ البتہ قرائن اسی پر دلالت کرتے تھے ۔ اس طرح ہمارا تعاقب، ایک گھنٹہ تک کمین گاہ میں صبر کے ساتھ انتظار ۔۔

اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔

میں نے احسن کو شاٹ گن دیکر ہوشیار کھڑے رہنے کی تاکید کی، اور خود نالے کے شفاف پانی سے وضو کر کے ظہر کے فرض قصر کر کے پڑھی۔ یعنی صرف دو رکعت پھر میں رائفل لیکر نگراں رہا اور احسن نے وضو کر کے نماز پڑھی ۔ نماز کے بعد احسن نے زمین پر دسترخوان بچھا کر بھنا ہوا تیتر، لیموں کا اچار اور پراٹھے رکھے۔ تو میں نے دوپہر کا کھانا کھا لیا ۔۔ میرے بعد احسن نے کھایا ۔

اس طرح ہم دو بجے کے ذرا بعد اس جگہ سے چلے ۔

حسبِ دستور ۔۔ احسن مجھ سے کوئی پانچ چھ گز آگے میری شاٹ گن اور سامان کا جھولا لیے چل رہا تھا ۔۔ اس کے پیچھے ۔۔ رائفل ہاتھ میں لٹکائے ۔۔ بغور اطراف کا جائزہ لیتا میں تھا ۔۔

ہم نے چیتے کے ماگھ دیکھ کر اس کے تعاقب میں جانا غیر ضروری خیال کیا ۔۔ مجھے یہ تعجب تو ضرور تھا کہ چیتا اس گھنے جنگل میں گھسنے ۔۔ یا شاید رہنے ۔۔ کے بجائے پہاڑوں کی طرف رہتا ہے ۔۔ لیکن چیتوں کی حرکات، چالاکیوں اور مکاریوں کا مجھے کافی تجربہ تھا۔

غالباً ۔۔ دو وارداتیں کرنے کے بعد چیتے کو معلوم ہو گیا کہ اس کی فکر میں آنے والے اس گھنے خطے کو ہی اپنی کوششوں کا مرکز بنائیں گے ۔ لہٰذا اگر وہ اس

خطے میں رہتا بھی تھا تو اس کو ترک کر کے جنگل کے کسی اور حصّے کی طرف چل دیا ۔

ہم نالے کے کنارے کنارے پہاڑی کی طرف بڑھتے رہے جس مقام پر سانپ مارا تھا وہاں سے تقریباً دو میل چلنے کے بعد ایک جگہ سے ہم نے نالہ پار کیا اور مخالف کنارے پر گئے ۔ یہاں میں نے احسن کو اشارا کیا کہ ایک طویل دائرے کی شکل میں بائیں جانب مڑ جائے ۔ اس نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی ۔۔ اب ہم نالے کی طرف پشت کر کے سیدھے پہاڑوں کے متوازی خط پر چلنے لگے ۔۔ یہاں جھاڑیاں کم تھیں، درخت البتہ بڑے تناور تھے، اور درختوں کے سائے میں پتوں سے پوشیدہ زمین نم سی تھی ۔۔ پتے بھی خشک ہو جانے کے باوجود نرم تھے ۔ اتنے کہ ان پر قدم پڑنے سے آواز نہیں ہوتی تھی ۔۔

اس زاویے سے چلتے ہم آخر عصر کی نماز کے بعد واپس تقریباً اس مقام کے مقابل آ گئے جہاں سے گاؤں کی طرف جا سکتے تھے۔ گاؤں اب چھ میل کے فاصلے پر تھا ۔ یہاں نالے کے کنارے ہی میں نے عصر کی نماز ادا کی ۔۔ اور احسن کو اشارہ کیا کہ درخت پر چڑھ کر اطراف پر نظر ڈالے ۔ لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اب میں کسی قدر تیز قدم گاؤں کی طرف واپس ہوا اور مغرب کی نماز سے چند منٹ قبل ہی آبادی کے نزدیک کھیتوں میں پہنچ گیا۔

بعض اوقات قسمت یاوری کرتی ہے تو کامیابی قدم چومنے میں دیر نہیں کرتی ۔۔ یہ جدا بات ہے کہ معاملہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے ۔

اسی کو موقعے کا نام دیا جاتا ہے ۔

بلکہ عملی زندگی میں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ شخص جو راہِ زندگی پر چلتا ہے اسے ہر چند قدم بعد مواقع ملتے ہیں ۔ کامیابی اور کامرانی کے مواقع ۔ بعض لوگوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ موقع ملتے ہی اس کو ضائع نہیں جانے دیتے، موقعے سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ اور محض اس صلاحیت کی بدولت کامیاب اور کامران ہو جاتے ہیں ۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ میں نے اوپر کی سطر میں کہا ہے "بعض لوگوں میں مواقع سے استفادے کی صلاحیت" ہوتی ہے — اس میں لازمی طور پر دوسری صلاحیتیں، شامل نہیں ہیں — یعنی علم، عمل، عقل اور اہلیت — کوئی بھی شامل نہیں —

مثال کے طور پر حضرت میم نون ہے — یا الف ے — یا میم رے — وغیرہ۔ ان لوگوں میں اہلیت کوئی نہیں — صرف موقعے سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت ہے۔

البتہ یہ ہر شخص کے ساتھ نہیں — بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں موقعے سے استفادے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ قابلیت بھی ہوتی ہے — یہ لوگ تعداد میں کم ہوتے ہیں۔

لیکن یہ معاملہ شکار کے بارے میں درست نہیں ہو سکتا — یا اگر زیادہ دقت نظر سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ —

مجھے چیتے کو مارنے کا موقع قسمت نے — یا قدرت نے — فوراً ہی فراہم کر دیا — لیکن میں اس موقعے سے استفادہ نہیں کر سکا —

کیا یہ درست ہے —؟

اگر وہ منحوس کوبرا حملہ آور نہ ہوتا تو شاید فائر کا موقع ملتا — پھر یہ کہ — اگر فائر کا موقعہ ملنے کے بعد فائر نہ کرتا — یا میرا نشانہ خطا کرتا تو بیشک یہ کہا جا سکتا تھا کہ میں نے موقعے سے استفادہ نہیں کیا۔

یہاں تو موقع نہیں ملا — یا اگر ملا تو سانپ پر فائر کا موقع ملا — اور اس کو میں نے ایک ہی فائر میں فنا کر دیا — نشانہ خطا نہیں ہوا۔

گویا موقعے سے استفادہ کیا —

بس —!

مجروا گاؤں کے باہر ہی منتظر ملا — اور میں نے اس کے شام کے وقت کھیتوں میں تنہا آنے پر کسی قدر فہمائش بھی کی — اور درست بھی تھا جس جگہ

مجروا ملا تھا وہ گاؤں سے نصف میل پر تو ضرور رہی ہوگی، آدم خور کے حملہ کرنے کا نہایت عمدہ موقع تھا۔

میں نے مجروا کے گھر کے صحن میں ہی گرم پانی سے غسل کر کے ہلکا ململ کا کرتہ اور لٹھے کا پاجامہ پہنا ہلکی سی خوشبو لگائی اور بیٹھک میں آگیا — میں نے تمام عمر نہ تو کبھی سلیپنگ سوٹ پہنا نہ کوئی اور لباس — ہمیشہ میں شام کو کام اور آمدورفت سے فارغ ہونے کے بعد ململ کا کرتہ اور پاجامہ ہی پہنتا ہوں اور ان کپڑوں میں جو آرام ملتا ہے وہ کسی اور لباس میں مفقود ہے — ہر موسم اور دنیا کے ہر گوشے میں میرا شب خوابی کا لباس یہی رہا ہے۔

بیٹھک میں کئی آدمی موجود تھے اور احسن ان کو سارے دن کی روداد سنا بھی چکا تھا —

ذرا ہی دیر بعد دسترخوان بچھا دیا گیا — اور میں نے تنہا ہی کھانا کھایا اس لیے کہ اور سب کھا چکے تھے۔ گاؤں والے اندھیرا ہونے سے پہلے ہی کھا پی کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

ذرا دیر بعد میں عشاء کی نماز کے لیے اُٹھ گیا —

اس رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا —

جیسے — گھنے جنگل سے گھری ہوئی ایک بلند پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے میرا پیر پھسلا اور باوجودیکہ نہ زیادہ ڈھلان تھا، نہ ہی پیر ایسا پھسلا تھا — لیکن میں الٹ کر گر گیا۔ اور گرتے ہی رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر وہیں رہ گئی — میں پہاڑ کے دامن پر لڑھکتا چلا گیا، اور ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ نزدیک کے ایک درخت پر سے ایک بھورے رنگ کا ریچھ کود کر مجھ پر حملہ آور ہو گیا — میں بُری طرح گھبرایا ہوا اُٹھا — اور ریچھ سے بچنے کے لیے ایک چٹان کی طرف بھاگا جو قریب ہی تھی —

خواب میں دوڑنے کا معاملہ بڑا عجیب ہوتا ہے — پاؤں ایک ایک من

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کے ہو جاتے ہیں۔ کسی طرح بھاگا ہی نہیں جاتا۔۔ بس وہی کیفیت ہوتی ہے جو امریکی فلم سیریز "سکس میلین ڈالر زمین" کے ہیرو اسٹیو آسٹن کے بھاگتے وقت دکھائی جاتی ہے۔۔ میں خواب میں بہت دفعہ بھاگتے پایا گیا ہوں۔ کبھی کسی کے تعاقب میں، کبھی کسی ایمرجنسی کے حال میں۔ کبھی دفاع کے لیے۔ لیکن ہر بار وہی اسٹیو آسٹن کی سی حالت ہوئی ہے اگرچہ اس حالت کے باوجود میں نے جس کا تعاقب کیا اس کو جا لیا۔ جس سے بچ کر بھاگا اس سے صاف بچ کر نکل گیا۔

اور وہی حال اس خواب میں ہو رہا تھا۔

میں بھاگ ہی نہیں پا رہا تھا۔۔ اور ریچھ بس اب سر پہ آنے ہی کو تھا۔ اور میرے پاس رائفل بھی تو نہیں تھی، میں نے جلدی سے بھاگتے بھاگتے اپنی بُش شرٹ اُتاری اور پلٹ کر ریچھ پر پھینک دی۔

یہ جنگل کی ایک بہت عام مگر کامیاب ترکیب ہے۔ اور۔۔

نہ صرف ریچھ بلکہ سانپ کے لیے بھی بڑی کارگر ہے۔ اگر کوئی ہتھیار، ڈنڈا، لاٹھی، کچھ بھی نہ ہو تو آسان دفاع یہ ہے کہ کوئی کپڑا۔۔ قمیض، کوٹ، رومال حتیٰ کہ پاجامہ اور پتلون بھی استعمال کرنا پڑے تو جان سے عزیز نہیں ہوتا۔۔۔ اور ان دونوں کی عادت ہے کہ اگر اس طرح کپڑا ہی ہتھے چڑھ جائے تو بھاگے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر اس سے الجھ جاتے ہیں۔ اور جب تک معاملہ صاف ہو تب تک بھاگنے والا بھاگ لیتا ہے یا اپنے دفاع کا انتظام کر لیتا ہے۔

اس بھاگ دوڑ کے دوران ہی میری آنکھ کھل گئی۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ میں اُٹھا، صحن میں پانی کا مٹکا تھا اس سے پانی لے کر میں نے وضو کیا اور نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ دو رکعت نفل قضائے حاجت، خواجگان نقشبندیہ کے طریقے کے مطابق پڑھی۔ اور دُعا پڑھ کر بہت رقت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اعانت اور رحم و کرم کی دعا کی۔۔ آنے والی مصیبتوں بلاؤں اور حادثات سے حفاظت اور پناہ مانگی۔۔ اور پھر لیٹ کر آرام سے سو گیا۔۔

فجر کے وقت پھر بیدار ہوا۔۔ اس وقت سارا گاؤں ہی جاگ اُٹھتا ہے۔۔ میں نے بھی اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کی اس کے بعد احسن کو جگا دیا اور جب تک وہ ناشتہ تیار کرے میں ضروریات سے فارغ ہوا اور لباس تبدیل کر کے دو رکعت نماز نفل ادا کی پھر اپنے ہتھیاروں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

جب ہم گاؤں سے نکل کر جنگل کی طرف چلے تو لوگ اپنے کھیتوں میں جا چکے تھے اور دھوپ نکل آئی تھی۔۔ لیکن ہواؤں میں اب بھی وہی بارش کے بعد کی کیفیت اور ٹھنڈک تھی، یوں بھی سردی کا زمانہ تھا اور مالوے میں خاصی سردی ہوتی ہے میرے ہاتھ میں تین سو تھری میگنم تھی۔۔ اور حسب معمول شاٹ گن احسن کے ہاتھ میں، جو مجھ سے کوئی سات آٹھ قدم آگے آگے چل رہا تھا۔

ہم کھیتوں سے گذرے۔۔ اور جنگل میں داخل ہو گئے۔ ہوا نہایت صاف، صحت بخش اور جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ اس قسم کے صاف ستھرے اور پاکیزہ ماحول کا طبیعت پر۔۔ بلکہ صحت پر بھی۔۔ بڑا خوشگوار اثر ہوتا ہے اور ان ہی ہواؤں، خوشبوؤں اور مشقتوں کا نتیجہ ہے کہ میں اس عمر کو پہنچ جانے کے باوجود الحمد للہ نہایت مضبوط اور صحت کی حالت میں ہوں۔۔ اور کئی سال سے شکار نہ کھیل سکنے کے باوجود پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ پیادہ طے کرنا میرے لیے معمولی بات ہے۔

جنگلوں میں رطوبت کی وجہ سے زمین بھی نم نم تھی ایسی کہ وہ خشک پتے جو گر کر جمع تھے ان پر قدم پڑتا تو آواز نہیں ہوتی تھی ورنہ خشک پتے روندے جا کر اس بُری طرح چیختے ہیں کہ دور تک کا ماحول بیدار بلکہ ہوشیار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے جنگل میں شکار کی تلاش کے دوران خشک پتوں سے بچا کر پیر رکھنا ہوتا ہے تاکہ شور نہ ہو۔۔

ہم گذشتہ روز جس سمت گئے تھے اسی سمت اس روز بھی نکلے۔ البتہ اب یہ گمان غلط ثابت ہو چکا تھا کہ چیتا گھنے جنگل اور جھاڑیوں کے خطے میں رہتا ہے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

وہ خطہ آر کی رہائش کے لیے موزوں بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارے تمام دن کے دورے میں نہ اس خطے میں جانوروں کے گھسنے کا کوئی راستہ بنا نظر آیا نہ ہی ادھر سے کوئی چرندہ نکلتا یا اس میں گھستا نظر پڑا۔

چکارے، جنگلی بکریاں، ہاگ ڈیر۔ اور لومڑیاں ۔۔ گھنے خطوں میں گھسے رہتے ہیں ان کا بھی اس خطے میں نشان نہیں تھا ۔۔

دوسری جانب جدھر نسبتاً چھدرا جنگل، درخت، اور پہاڑیاں تھیں اس جانب گذشتہ روز بھی مجھے چیتل نظر آئے تھے۔ اور دوسرے کئی جانور بھی ۔۔ مجھے یقین ہے کہ جانوروں کے رہنے، چرنے اور گلگشت کے علاقے سب نالے کے پار ہی تھے۔

میں نے احسن کو ہدایت کی کہ سیدھا نالے کی طرف جائے ۔۔ اور اس نے گھنے خطے کو چھوڑ کر خط مستقیم میں چلتے ہوئے چھدرے جنگل کا راستہ اختیار کیا۔

اس طرف درخت نسبتاً کم اور کسی قدر فاصلے پر ہیں، شریفے کے درخت بکثرت اور کسی کسی جگہ بہت ہی نزدیک ہونے کی وجہ سے گھنی جھاڑیوں کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں، لیکن ایسے بھی نہیں کہ ان میں چھپے ہوئے شیر یا چیتے کو میں دیکھ نہ سکتا ۔۔

اس کے باوجود، حسب عادت ہم ہر گھنی جھاڑی کو اچھی طرح دیکھ بھال کر گذرتے۔

چیتا عام طور سے شیر جیسا جری نہیں ہوتا۔ لیکن اس خیال پہ زیادہ پختگی کے ساتھ یقین ممکن ہے اچھے نتائج کا حامل نہ ہو۔ ایک بڑے درندے سے درندگی کے سوا کسی اور فعل کا حدوث اتفاقی ہو سکتا ہے یقینی نہیں ۔۔

پاکستان ہندوستان میں بالعموم دو قسم کے چیتے ہوتے ہیں۔

۱۔ چیتا یا لوریچہ یا گھبرا یا تیندوا۔

۲۔ شکاری چیتا ۔۔

اول الذکر چیتا تقریباً سارے پاکستان، اور سارے ہندوستان میں پایا جاتا ہے ۔۔ الا ان چند علاقوں کے جو بالعموم اچھے شکار سے ہی خالی ہیں۔

البتہ ان چیتوں میں دو قسم کے ہوتے ہیں، جو بہ اعتبار شکل وصورت، عادات، واطوار، طاقت وجسامت ایک ہی سے ہیں، لیکن ان کے گل کسی قدر مختلف ہوتے ہیں ۔۔ یہ بات ممکن ہے بہت لوگوں کو معلوم نہ ہو۔

ایک قسم کے گل درمیان سے خالی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مقابل کی تصویر سے ظاہر ہے۔

دوسری قسم کے گل وسط سے خالی نہیں ہوتے بلکہ سارے سیاہ ہوتے ہیں ۔۔ اس کو عام طور سے تیندوا کہا جاتا ہے۔

عام آدمی نہ اس فرق کو محسوس کرتا ہے نہ جسامت سے ہی کوئی تمیز ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں اول الذکر قسم کا چیتا ہوتا ہے ۔۔ اور درج ذیل علاقوں میں دیکھا گیا ہے ۔۔

کوہستان نمک:

جہلم سے پنڈ دادن خان تک

ڈیرہ غازی خاں کے نواح میں۔

کوہستان کیرتھر

کوئٹہ کے بالائی علاقے۔

گلگت اور سکردو۔

ہنزہ۔

چترال۔ میں نے ۱۹۵۶ء کے شکار میں سفید چیتا بھی دیکھا ہے۔

سوات: سوات سے زیادہ شمال کے برفانی علاقوں میں، مثلاً راکاپوشی، ننگا پربت وغیرہ کے گرد ۔۔ میں نے دور سے سفید چیتا SNOW LEOPARD دیکھا ہے۔ اور برفانی ریچھ بھی۔

http://updf.weebly.com

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

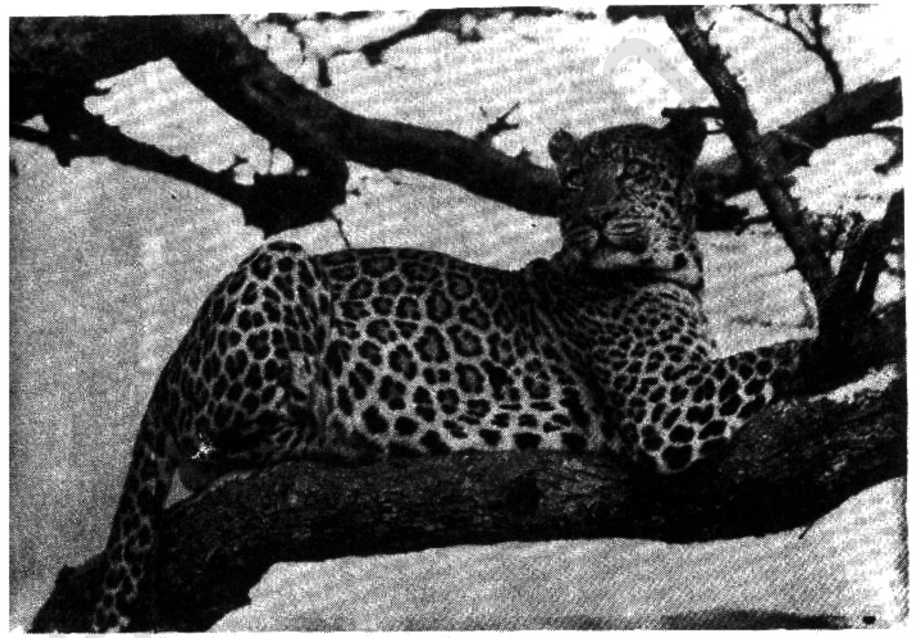

عام چیتیا یا تیندوا یا لوبرچہ

ہندوستان کے درجِ ذیل علاقوں میں چیتے پائے جاتے ہیں۔

سارے جنوبی ہند میں

وسط ہند کے سارے علاقے میں۔

راجستھان

اڑیسہ

آسام

ہمالیہ کی ترائی۔

مقبوضہ کشمیر

بنگلادیش کے چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں چیتوں کی تعداد خاصی تھی۔ افسوس یہ رہا کہ جس دور میں بنگلادیش مشرقی پاکستان ہوا کرتا تھا مجھے وہاں جانے اور شکار کھیلنے کا موقعہ نہیں ملا — ایک دفعہ میرے ایک دوست نے پیشکش

بھی کی تھی کہ اگر میں آجاؤں تو وہ سندربن اور چٹاگانگ دونوں جگہ شیر اور چیتوں کے شکار کا انتظام کر دیں گے لیکن افسوس کہ میں نہ جا سکا — اور آخر کار امریکہ چلا گیا جہاں سے کئی سال تک واپسی کا امکان نہ ہوا۔

اور اب —!

البتہ پاکستان کو ایک مختلف قسم کے چیتے یا تیندوے کے وجود کا شرف حاصل ہے۔ اور یہ ہے کلاؤڈڈ تیندوا — GLOUDED LEOPARD-

یہ جسامت میں چیتے اور تیندوے سے کچھ بڑا ہی ہوتا ہے — بالخصوص سر اور جبڑے جسامت کے لحاظ سے نسبتاً بڑے اور بے ڈول — اگلے صفحے کی تصویر سے دیکھا جا سکتا ہے کہ سر اور منہ عام چیتوں کے تناسب بدن سے بڑا ہوتا ہے۔ تصویر اتنی اچھی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت کم شکاریوں نے ابری تیندوے کو دیکھا اور بہت ہی کم نے شکار کیا ہے — میں نے کئی بار کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی یہی وجہ ہے کہ اس درندے کی صحیح تصویریں بھی نایاب ہیں۔ میں نے یہ تصویر بمشکل حاصل کی جو کچھ ایسی واضح نہیں لیکن بہرحال اندازہ تو ہو ہی سکتا ہے۔

میں نے ابری تیندوے کے شکار کی دو بار کوشش کی ہے۔

ایک بار ڈھڈیالی کو مستقر بنا کر — اس دورے میں میرے ساتھ ابو خورشید حقانی، کاظمی اور ان کا ایک امریکی دوست بھی تھے۔ آئندہ صفحات میں کسی مقام پر ان کی ایک تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسری بار لوپھا کو مستقر بنا کر —

اس کوشش کے دوران میں نے ایک بکری بھی گارے کے طور پہ مسلسل چار رات بندھوائی اور خود بھی بیٹھا — چوتھی رات کے بعد بکری تو بدستور تندرست رہی لیکن میں کافی خراب ہو کر واپس ہوا۔ اس کا قصہ کسی اور موقعے پہ بیان کروں گا میری کسی شائع شدہ کتاب میں اس شکار کا قصہ شامل ہے۔

اس بار بھی تیندوا شکار کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ابری تیندوا، کوہستان نمک میں پایا جاتا ہے

CLOUDED LEOPARD

البتہ میں نے ان ہی جنگلوں میں عام تیندوا شکار کیا ہے جس کا واقعہ کسی کتاب میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

احسن کی رہنمائی میں ایک مناسب مقام سے میں نے نالہ پار کیا۔ اور دوسرے کنارے کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے زمین نسبتاً بلند ہوتی گئی تھی جس سے ظاہر تھا کہ پہاڑی دامن کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ لیکن میں اس کو سطح مرتفع

کہوں گا۔ بلند لیکن نہ میدانی نہ پہاڑی، اور دور دور پر درخت جو کم بلند تھے۔ البتہ خوب پتوں سے بھرے۔ تیندوا یا چیتا بڑی آسانی سے درخت پر چڑھتا اور پتوں میں چھپ رہتا ہے۔ کبھی کبھی کسی بے برگ درخت پر چڑھ کر با اطمینان و فراغت آرام کرتا ہے یا بیٹھا رہتا ہے۔ چنانچہ جو تصویر گذشتہ صفحے پر ہے وہ ایک ایسے ہی تیندوے کی ہے جو درخت پر با اطمینا بیٹھا ہے۔

اس لیے ہمیں زمین پر، اطراف و جوانب کے علاوہ پُر برگ درختوں سے بھی ہوشیار رہنا تھا۔ اور ایسی حالت میں ہماری پیشقدمی کی رفتار کا سست ہونا قدرتی بات ہے۔

اس سطح مرتفع کے اختتام پر ایک نسبتاً پست، یعنی نشیب میں واقع، شاداب وادی تھی جو کئی میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ وادی کے وسیع علاقے میں کئی نالے نظر آتے تھے، جن کے کناروں پر بڑے بڑے درخت سایہ فگن تھے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان نالوں میں پانی ہوگا یا نہیں۔ مالوے کے پہاڑی نالے، بالخصوص وہ نالے جو گھنے جنگلوں سے ہو کر گذرتے ہیں اکثر پانی کی پتلی سی بہتی ہوئی دھار سے ضرور مزین ہوتے ہیں۔ بارش ہو تو یہ نالا، ندی بن جاتا ہے۔

اس وادی کی وسعت کو میں اندازاً چھ میل کہہ سکتا ہوں۔ بڑی وسعت تھی۔ وادی کے آخری سرے پر۔ شفاف چٹانوں کے پہاڑ تھے، بعض پہاڑ تو ایسے تھے کہ دور دور تک سنگلاخ چٹانیں ہی نظر آتی تھیں جن پر نہ درخت تھے نہ جھاڑیاں۔

ہم اس وادی میں اتر گئے، اور درختوں کے سائے میں وسعت کی طرف سے کسی قدر شمال کے رخ پر چلے۔ یہاں کی زمین کہیں کہیں سبزے سے خالی تھی اور اس خالی جگہ میں سُرخ مٹی پر مختلف جانوروں کے نقوش قدم نظر آتے رہے۔ البتہ وادی میں اُترنے کے بعد جانوروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ ہرن بھی کئی مقامات پر نزدیک سے نظر آئے۔ چتیل بھی کئی منڈول کی شکل میں ملے۔ ایک سیاہ ریچھ بھی ایک درخت پر چڑھا پھل کھاتا نظر پڑا۔ نیل گائے تو ہر جگہ بکثرت

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ہوتے ہی ہیں —

گویا اس وادی میں چرندوں کی خاصی تعداد تھی۔ اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس علاقے کے بیشتر چرندوں کی چراہ گاہ اسی وادی کو کہا جا سکتا ہے۔

دوپہر کے قریب ہم نے وادی کو طول میں عبور کر لیا اور اس اونچے پہاڑ کے دامن پر پہنچ گئے جسے گاؤں والے "اودی" کہتے تھے — یہ پہاڑی گھنے جنگل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور خاصی بلند تھی — اس کے دامن میں ہی نالے کی ریت پر شیر کے ماگھ صاف نظر آئے جو غالباً گذشتہ شب کے رہے ہوں گے اور اس آدم خور کے ماگھ سے مختلف تھے جو ہم دیکھ کر ذہن میں نقش کر چکے تھے — اس نالے کو عبور کر کے ہم پہاڑی پر چڑھنے لگے — ارادہ یہ تھا کہ پہاڑی کے اوپر پہنچ کر اطراف کے جنگل اور وادی کا بھی جائزہ لیا جائے —

وہ چڑھائی ہمارے گمان سے زیادہ دشوار ثابت ہوئی۔ اور ظہر کی نماز کے وقت تک ہم بمشکل نصف بلندی تک پہنچے تھے — مجھے بھوک بھی لگی تھی۔ چنانچہ ایک چشمے کے پاس ٹھہر کر میں نے وضو کر کے ظہر کی نماز قصر کر کے ادا کی پھر ہلکا سا کھانا کھایا ذرا دیر وہیں ٹھہر کر آرام کیا حتیٰ کہ احسن اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر، کھا پی کر لیٹ گیا اور مجھے حیرت ہوئی کہ چند منٹ میں ہی وہ خراٹے لینے لگا — ایسے خطرناک جنگل میں جبکہ ہم ایک آدم خور کی تلاش میں گھوم رہے تھے اس کا اس قدر بےفکری سے گہری نیند سو جانا تعجب کی بات تھی — اور غیر معمولی حرکت — وہ سالہا سال سے میرا ملازم اور شکاروں میں ساتھ رہنے والا شخص تھا — اس کو میں نے اس طرح سوتے کبھی نہیں دیکھا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے اس کو جگانا اچھا نہیں سمجھا۔

جس شخص نے کئی سال کی رفاقت میں ایک حرکت نہ کی ہو — اس سے ایک خلافِ عادت حرکت سرزد ہو تو تعجب ضرور ہوتا ہے۔

احسن کوئی دو گھنٹے غافل سوتا رہا — اور غالباً ابھی اور سوتا رہتا کہ ایک بار ہم سے کوئی سو گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں سے ایک بہت بڑے گلچھے والے

شیر نے سر نکالا — اس کے سر نکالتے ہی قریب کے درختوں پر سے کچھ پرندے شور کرتے ہوئے اڑے اور چلانے لگے — کسی نزدیکی درخت سے ہی مجھے کالے منہ والے بندروں کے نگران کی خطرے سے آگاہ کرنے والی کراہ بھی سنائی دی اور اسی آواز نے مجھے اس جھاڑی کی طرف متوجہ کیا جہاں شیر تھا — وہ میری طرف متوجہ بھی نہیں تھا —

میں نے فوراً احسن کو جگایا —

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اٹھتے اٹھتے بندوق پر گرفت مضبوط کر لی — میں نے اشارے سے اس کو خاموش رہنے کی ہدایت کی —

لیکن اس کی حرکات اور میری حرکت سے شیر ہوشیار ضرور ہو گیا۔

یہ سال کے درختوں کا جنگل تھا — ان جنگلوں کے شیر کبھی کبھی دن کے وقت بھی گھومتے یا کسی کھلی جگہ آرام کرتے مل جاتے ہیں —

میں یہ لکھنا بھول گیا کہ دوپہر سے ذرا پہلے مطلع ابر آلود ہو گیا تھا — بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے اور سردی بھی بڑھ گئی تھی — شاید سردی کی وجہ سے ہی شیر اپنی کچھار سے نکلا ہوا — شاید اسے دھوپ کی ضرورت ہو۔ یا ممکن ہے دھوپ میں سو رہا ہو — بادل آ جانے سے دھوپ غائب ہو گئی اور ٹھنڈک بڑھی تو شیر نے کسی بہتر مقام — غار یا کھوہ میں جانے کے لیے حرکت کی ہو گی۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو —

ہماری حرکت کی طرف متوجہ ہوتے ہی اس نے سر جھاڑی میں کھینچ لیا اور نظر سے غائب ہو گیا — مجھے اس شیر سے کسی قسم کی پرخاش نہیں تھی۔ اور اس کا بھی ہمارے ساتھ کسی تنازعے کا ارادہ نہیں ہو گا یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد نہ ہم اس مقام کی طرف بڑھے نہ وہی ہماری طرف آیا —

شیر بے سبب کسی پر حملہ نہیں کرتا — اور انسان کے وجود سے تو سب ہی گھبراتے اور بھاگتے ہیں۔ شیر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

اب میں نے احسن کی طرف دیکھا ـــ

"صاحب ـــ سر میں بڑا درد ہے ـ"

وہ بولا

"تم کوئی دو گھنٹے سوئے ہو ـــ"

"جناب طبیعت ٹھیک نہیں ـــ"

"تمھاری طبیعت صبح سے ہی خراب رہی ہو گی ـ تم کو بتانا چاہیئے تھا۔ اتنا پیدل چلنے سے اور خراب ہو گی ـــ"

"صبح سے ہی سر میں درد ہے حضور ـــ"

میں نے تھیلے میں تلاش کر کے اسپرین کی دو گولیاں نکالیں اور احسن کو دیں ـــ اس نے چشمے کے پانی کے ساتھ کھالیں ۔

"واپس چلو ـــ"

میں نے کہا ـــ

اور ہم لوگ بخیریت شام سے کافی پہلے گاؤں واپس پہنچ گئے ۔ احسن کو واپس آتے آتے حرارت ہوگئی اور وہ آکر بس لیٹ ہی گیا ـــ اب نمایاں طور پر اس کو نزلے اور بخار کی کیفیت معلوم ہونے لگی تھی ـــ رات میں ہلکی بارش ہوئی اور صبح بھی مطلع ابر آلود رہا ـــ

اس سے اگلے روز میں تنہا روانہ ہوا ـــ احسن کو ہلکا بخار تھا، اور خوب نزلہ ہوا تھا ۔ وہ تو اس حالت میں بھی ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اس کو روکا ـــ

میرے ہاتھ میں اب پھر تین سو تچھتر میگنم تھی ـــ چار سو پچاس ایکسپریس محض وزن کی وجہ سے نہیں لے گیا ـــ البتہ شاٹ گن بھی شانے پر لٹکی تھی ۔ پانی کی بوتل بھی چھوڑ دی ـــ جنگل میں چشموں کی افراط تھی ـــ ویسے بھی مجھے شکار کے دوران بھوک پیاس کم لگتی ہے اور برداشت بھی کر لیتا ہوں ـــ کھانے کے بجائے

چند بسکٹ شکاری تھیلے میں تھے جو لپشت پر لگا ہوا تھا ـــ اس طرح سامان کم ہونے کے باوجود میں خاصا بوجھ اُٹھا کر چلا ـــ

گاؤں سے نکلتے نکلتے مجروا ساتھ آملا ـــ اور میرے انکار کے باوجود ساتھ چلنے پر مصر ہو گیا ـــ میں نے بھی غنیمت جانا ـــ شاٹ گن اور شکاری تھیلا اس کے سپرد کر دیا ـــ وہ احتراماً مجھ سے پیچھے چلنا چاہتا تھا ـــ لیکن میں نے اس کو سامنے چلنے پر بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور وہ میرے اصول اور ہدایت کے مطابق مجھ سے دس قدم آگے چلنے لگا ـــ

اس روز میں نے گاؤں کے مغرب ـــ یعنی اب تک کی گردش والے علاقے کے عین مخالف سمت میں جنگل کا معائنہ شروع کیا ـــ پہاڑ اور نالے تو ہر طرف ہی ہوتے ہیں ـــ وہ سارا خطہ ہی پہاڑی ہے ۔

ہم سارا دن ان جنگلوں میں گھومتے رہے، سہ پہر کے قریب ایک مورنی کے ساتھ چار پانچ چوزے نظر آئے ـــ میں انہیں دیکھ کر بہت للچایا ـــ اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ مجروا نے اپنی تہبند کی گانٹھ میں سے ایک چھوٹی سی غلیل نکالی ۔ جیب سے نکال کر اس میں غلہ لگایا اور مجھے اشارا کر کے جھاڑیوں کی آڑ لیتا مورنی کی طرف بڑھا ۔

چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ ایکبار مورنی چیخ کر اڑی ـــ اور ایک چوزہ گر کر پھڑ کنے لگا ۔ باقی چوزے بھی اڑ گئے ۔ مجروا نے دوڑ کر گرا ہوا چوزہ اُٹھا لیا ۔ اور میں نے چھوٹی چھری سے اس کو حلال کر لیا، مجروا اپنی کامیابی پر بچوں کی طرح خوش تھا ۔

اس رات کھانے پر مجروا کی گھر والی نے وہی چوزہ اتنا لذیذ پکا کر کھلایا کہ طبیعت خوش ہو گئی ـــ احسن کی طبیعت بدستور خراب رہی ۔ لیکن بخار کم تھا ۔ اور میں نے اس کو مور کے چوزے کا ہی سوپ بنوا کر پلوایا ـــ اسپرین کی دو ٹکیاں دیں اور جلدی ہی سو جانے کی تاکید کی ۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

احسن تین روز بعد میرے ساتھ جانے کے قابل ہوا — نزلے کا زور بالعموم تین روز ہی رہتا ہے لیکن مور کے چوزے کے سوپ نے وہ کام کیا جو کوئی تیز اینٹی بائیوٹک کرتی ہے۔ ساتھ ہی اسپرین پابندی سے کھائی گئی۔

اس عرصے میں نہ تو تیندوا کہیں نظر آیا نہ اس کی کوئی اطلاع ملی۔ واردات کی بھی خبر نہیں تھی۔

اور جب دس روز بے نتیجہ گذر گئے تو مجھے خواہ مخواہ یہ شک ہونے لگا کہ وہ دونوں وقوعے اتفاقی رہے ہوں گے — لیکن مجھے ایسا تجربہ نہیں تھا کہ ایک دفعہ کسی شیر یا تیندوے نے آدم خوری شروع کر کے ترک کر دی ہو۔ کسی بڑے شکاری کی کتاب میں بھی میں نے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں پڑھا تھا — مستزاد یہ کہ چھوٹے بھائی نے کہا تھا واقعات اور بھی ہوں گے —

اور پھر صرف ایک ہی نہیں — دو واقعات۔

اس شک کا یہ نتیجہ ہوا کہ گیارہویں روز میں نے جنگل میں گشت کا ارادہ ترک کر کے گاؤں میں رہ کر آرام کیا — اور یہ آرام دو روز جاری رہا۔

اس وقفے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ گاؤں والوں کو جمع کر کے ان کے سامنے ایک نہایت بے سروپا تقریر کی — بے سروپا اس لیے کہ میں واعظ نہیں ہوں — اپنا مقصد خالص اور سادے الفاظ میں بیان کرنے کی اہلیت ضرور رکھتا ہوں — چنانچہ میں نے مختلف طریقوں اور تکرار کے ذریعے ان کو یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی کہ تیندوا کئی روز کے بعد اب صحیح معنوں میں انسانی گوشت کی ضرورت محسوس کر رہا ہوگا اور کسی وقت بھی کسی کو شکار کر سکتا ہے۔ میں نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ انھیں اپنی حفاظت خود کرنا ہو گی — اور اس حفاظت کے لیے ان کو ہر وہ تدبیر بتا دی جو اس وقت میرے ذہن میں آ سکتی تھی۔

گاؤں کے مشرقی علاقے میں وہ گھنا جنگل ہے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا

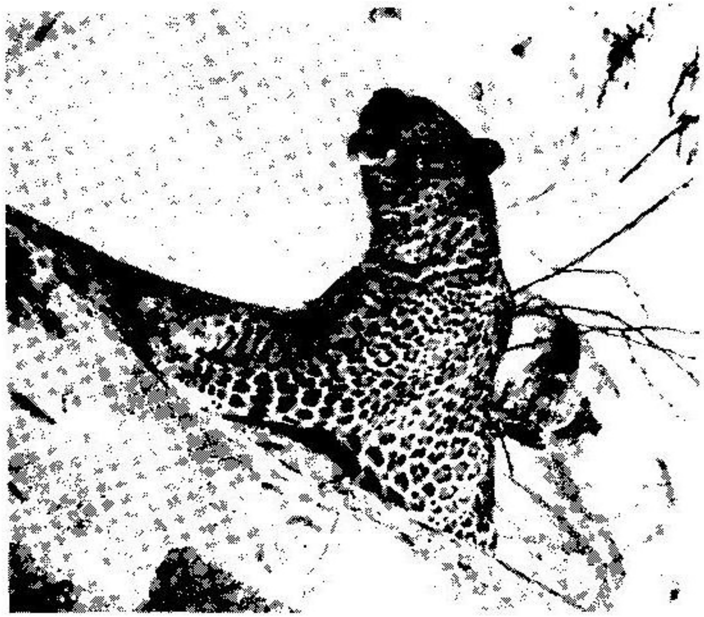

مغربی علاقہ بھی میں نے دیکھ لیا — شمالی علاقے میں دور تک گاؤں کے کھیت ہیں اور ان ہی کھیتوں کے درمیان سے وہ پگڈنڈی ہے جس پر سے گذر کر بیل گاڑیاں اچھا ور جا سکتی ہیں — جنوبی علاقے میں بھی دور تک کھیت ہیں۔ لیکن ان کھیتوں کے وسط میں بھی جا بجا بڑے بڑے املی پیپل اور برگد کے درخت ہیں۔ اور گاؤں کے آس پاس بھی دیار، نیم، اور دوسرے جنگلی درخت ہیں۔ بلکہ عین گاؤں کے کنارے ہی جنوبی حصے میں ایک بہت پرانا برگد کا درخت ہے جس کی جٹائیں بڑھ کر زمین تک لٹک گئی ہیں — اس درخت کے عین نزدیک گاؤں کا پہلا گھر ہے۔

اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس گھر کی دیوار برگد کے درخت سے متصل ہے بلکہ اس درخت کی دو جٹائیں دیوار کے قریب ہی لٹکی ہوئی تھیں۔

پندرھویں روز کا واقعہ ہے —

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں احسن کو ساتھ لے کر حسبِ معمول جنگل میں جا چکا تھا۔

دوپہر سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔۔ گاؤں کے تندرست مرد کھیتوں میں کام پر لگے ہوئے تھے۔۔ گاؤں میں یا تو عورتیں تھیں یا وہ دو چار بوڑھے جو یا تو کام کے نہیں رہے تھے یا وہ جو کسی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں۔

برگد کے درخت سے متصل جس دیہاتی کا گھر تھا۔۔ اس کا نام مجھے صحیح یاد نہیں رہا۔۔ اس کی بیوی اور دو بچے گھر میں تھے۔۔ چھوٹا سا چار پلنگوں بھر کا صحن اسی میں ایک طرف رسوئی دہاں عورت اپنے کام میں مشغول تھی۔۔ دونوں بچے تھوڑے ہی فاصلے پر زمین پر بیٹھے اپنے کھیل میں لگے تھے۔۔ ایک بچہ تین سال کا دوسرا پانچ سال کا تھا۔

یکبارگی دیوار پر سے تیندوا صحن میں کودا۔۔ اور اس عورت سے کوئی گز بھر پرے ہی کودا ہوگا۔ زمین پر اترتے ہی اس نے عورت کو تھپڑ مارا تو وہ لڑھک کر وہیں دیوار سے ٹکرا کر ڈھیر ہو گئی۔ پھر اس نے بڑھ کر چھوٹے بچے کو منہ میں دبایا، اور ایک چھلانگ میں ہی دیوار پر چڑھ کر برگد کی جٹا میں لٹکتا درخت پر چڑھ گیا۔

یہ سب کارروائی اس پھرتی اور سرعت سے ہوئی کہ عورت کی چیخ اس وقت نکلی جب تیندوا دیوار پر چڑھ چکا تھا۔

اور پھر وہ عورت جس طرح چیخی پیٹی ہوگی اس کا صرف کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس نے تو زمین و آسمان سر پر اٹھا لیے۔ گاؤں میں جو دو چار مرد تھے وہ دوڑے اور ان کے بھی شور کرنے پر کھیتوں میں کام کرنے والے بھاگ کر آئے۔ ان کے جمع ہوتے ہوتے اور معاملہ واضح ہوتے ہوتے ایک آدھ گھنٹہ تو گذر ہی گیا ہوگا۔

تیندوے نے عورت کو جو تھپڑ مارا تھا اس کے نتیجے میں اس عورت کا دایاں شانہ اور پہلو زخمی ہوئے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔

گاؤں کی عورتوں نے اس کو سنبھالا۔۔ اور مرد بلم بھالے لے کر تیندوے

کے پیچھے بھاگے افسوس یہ کہ ان لوگوں کو مجھے اطلاع کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔

تلاش میں جانے والے سہ پہر تک کھوج لگانے کی کوشش کرتے رہے اور آخر ناکام ہو کر واپس آ گئے۔ برگد کے جس درخت پر تیندوا چڑھا تھا ادھر سے بڑے درخت اور جنگل نزدیک ہی تھے۔۔ اور زمین بھی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ کھوج بھی نہیں بن سکے تھے۔۔ ان کو تیندوے کا نشان تک نہ ملا۔

بچے کی ماں جس دردانگیز طریقے پر بین کرتی تھی وہ بڑا ہی متاثر کرنے والا تھا۔ اور اس غریب کے غم کا اندازہ کسی کو کیا ہو سکتا ہے جس کی آنکھوں کے سامنے اس کا لختِ جگر موت کی آغوش میں اس طرح جائے کہ وہ ہائے بھی نہ کر سکے۔

میں اس روز واپس بھی دیر سے پہنچا۔ مغرب کی نماز کا وقت بھی تنگ ہو رہا تھا، اس لیے میں نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی کنویں پر ہی وضو کر کے نماز ادا کی۔۔ سلام پھیرا تو کئی آدمی جمع ہو چکے تھے اور سرگوشیوں میں احسن سے گفتگو کر رہے تھے۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔۔

دعاؤں سے فارغ ہو کر میں اٹھا۔۔

اور گاؤں کے ہر اس شخص نے جو وہاں موجود تھا بیک وقت واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا،

اسی وقت بچے کی ماں کے بین کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اور مجھے اب یقین ہو گیا کہ جس حادثے یا وقوعے کا خطرہ تھا وہ رونما ہو گیا۔۔

لیکن مجھے اس حادثے کے اس المیہ اور دل دوز پہلو کا علم نہیں تھا جو پیش آ چکا تھا۔۔

جب مجھ سے اس کی تفصیل بیان کی گئی۔ اور بچے کے باپ نے ہچکیوں، آہوں، اور آنسوؤں کے ساتھ اپنے غم و اندوہ کا نقشہ کھینچا تو میرا دل ہل گیا۔۔۔ اس وقت میں بھی ایک بچے کا باپ بن چکا تھا۔ اور اس اندوہگین باپ کے جذبات

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کا کسی قدر اندازہ کر سکتا تھا مگر اس ماں کے غم کا کیا قیاس ہو جس کی آنکھوں کے سامنے اس کا ہنستا کھیلتا ننھا معصوم بچہ درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔

عشاء کی نماز پڑھ کر میں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ اور دیر تک ساکت و جامد ہاتھ اُٹھائے رہا۔ نہ ذہن میں کوئی خیال تھا، نہ لبوں پر کوئی حرفِ دعا۔ بس ہاتھ اُٹھے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ جو سمیع و بصیر بھی ہے، عالم الغیب بھی اور دلوں کے راز جاننے والا بھی۔ اس کو معلوم تھا کہ میرے ہاتھ کس لئے اٹھے ہوئے ہیں۔

صبح میں نے محلِ وقوع کا جائزہ لیا۔ گھر میں آکر وہ جگہ دیکھی جہاں سے بورنچے نے اس دیہاتی کے معصوم بچے کو اُٹھایا۔ دیوار کی پیمائش کی۔ ساڑھے چھ فٹ اونچی دیوار پر سے صحن میں کودنا، اور پھر بچے کو منہ میں دبا کر اچھل کر دیوار پر چڑھ جانا عجیب بات تھی۔ دیوار سے چیتا سیدھا برگد کی اس جٹا میں جمٹ گیا جو دیوار کے ساتھ ہی لٹکی تھی۔ اور وہاں سے درخت پر چڑھ گیا۔ جا بجا بچے کے خون کے دھبے بھی موجود تھے۔

میں نے درخت کے پاس کسی کو نہیں آنے دیا۔ وہ لوگ خود بھی درخت کی طرف نہیں گئے تھے میں نے معہ احسن اس کے چاروں طرف بڑی دیر تک بغور تیندوے کے اترنے اور بھاگ کر جنگل میں جانے کے نشانات تلاش کئے لیکن کہیں ذرا سا نشان تھا نہ کوئی علامت۔ زمین جگہ جگہ نم تھی۔ اور نرم بھی۔ اگر چیتا وہاں اُترتا تو ضرور نشانات ملتے۔

اس کے متصل ہی دو درخت اور بھی تھے۔ خیال ہوا کہ شاید شاخ بہ شاخ چل کر دوسرے درخت تک گیا ہو اور وہاں سے اترا ہو۔ دوسرے درخت کے نزدیک سے میں گذر ہی رہا تھا کہ اوپر نظر اُٹھی۔ ایک جگہ مکھیاں بھنبھناتی نظر آئیں۔ اور غور کیا تو پتیوں پر کچھ خون نظر آیا جو خشک ہو چکا تھا اور ان میں چیونٹیاں لگ رہی تھیں۔

"احسن ــــ"

میں نے آواز دی

اور احسن فوراً ہی حاضر تھا۔

میں نے اس کو خون کی چتیاں اور بھنبھناتی مکھیاں دکھائیں۔ وہ فوراً ہی کمر کس کر درخت پر چڑھ گیا۔ اور دو ہی لمحوں میں شور مچ گیا۔ نہ صرف گاؤں کے مرد اور بچے ہی وہاں جمع ہو گئے بلکہ مرے ہوئے بچے کے ماں باپ بھی کئی عورتوں کے ساتھ روتے پیٹتے آ گئے۔ یہ صورتِ حال اچھی نہیں تھی۔ میں نے مجروا سے کہا کہ وہ ان سب کو وہاں سے ہٹا دے۔ اگر تیندوا درخت پر ہوا تو بڑی مشکل پیش آجائے گی۔ ادھر احسن درخت پر چڑھتا گیا۔

مجھے خیال تھا کہ شاید تیندوا بھی ہو۔ ایسا ایک بار پہلے ہو چکا تھا۔ لیکن تیندوا نہیں تھا۔ البتہ چند لمحوں بعد ہی احسن نے پتوں کے ایک جھنڈ کی آڑ سے دو شاخوں کے درمیان پھنسا ہوا ننھا سا سر اُٹھا کر مجھے دکھایا۔ باقی سارا جسم معہ ہڈیوں کے وہ موذی کھا گیا تھا۔ بچے کی ہڈیاں ہی کیا رہی ہوں گی۔ احسن نے سر ایک رومال میں باندھا اور لے کر نیچے آ گیا۔

"جناب ــــ وہ سارا بچہ کھا گیا۔ وہاں کی شاخوں پر خون اور کچھ گوشت کی ٹکڑیاں سی تھیں جن میں چیونٹیاں لگ چکی ہیں۔ بس یہ سر ہی بچ گیا ہے۔"

وہ سر میں بچے کے باپ کے سپرد کرتے ہی رائفل لے کر جنگل میں چلا گیا۔ تاکہ ان کے بین کی آواز مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ بڑا المناک واقعہ تھا۔

میں اس روز تنہا جنگل میں بے مقصد گھومتا رہا۔ عصر کے بعد واپس گاؤں آیا۔ اور سیدھا ان درختوں کے پاس ہی گیا۔ مجھے تیندوے کے درخت سے اترنے کے نشانات کی جستجو تھی۔ آخر وہ موذی کس طرح اور کس جگہ سے درخت پر چڑھ کر اس گھر کی تاک میں رہا اور کس طرح اس کو یہ ترکیب معلوم ہوئی کہ درخت کی جٹاؤں کے ذریعے گھر کی دیوار پر اتر جا سکتا ہے۔ اور گھر کے اندر کود کر شکار حاصل

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کیا جا سکتا ہے۔

چیتا یا تیندوا آدم خور ہو جائے تو شیر سے زیادہ ہلاکت آفرینی کا باعث بنتا ہے۔ آدم خور شیر کی مکاری اور ہوشیاری ضرب المثل ضرور ہے لیکن صرف اس لیے کہ بیشتر شکاریوں نے صرف شیر کی آدم خوری کے بارے میں ہی لکھا ــــ لوگوں میں بھی ان قصوں کی اشاعت اس لیے زیادہ ہوئی کہ شیر کی ذات سے جو خوف، طاقت اور عظمت وابستہ ہے وہ کسی دوسرے درندے کا حصّہ نہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ تیندوا آدم خور ہو کر انتہائی حیرت انگیز حرکات انجام دیتا ہے جو آدم خور شیر سے سرزد نہیں ہوتیں ــ نہ کبھی میرے ذاتی تجربے میں آئیں۔ نہ میں نے کبھی سنا، پڑھا یا دیکھا نہ کسی اور نے کہ آدم خور شیر برگد کے درخت پر چڑھ کر اس کی جٹاؤں میں لٹکا اور ان کے ذریعے کسی کے گھر میں کود کر بچہ اٹھا کر فرار ہوا ــ پھر اسی جٹا کے ذریعے درخت پر چڑھا، اور ایک درخت سے چھپ کر دوسرے درخت پر جا چھپا ــ اور ایسی حالت میں کہ گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا ــ جو اس کی کمین گاہ سے دور نہیں تھا ــ وہ مکار درندہ، بچے کی لاش لئے وہیں گھر کے نزدیک درخت پر چھپا بیٹھا رہا ــ لوگ دور دور کا جنگل کھنگال کر نامراد واپس آگئے اور اس نے عین اسی گھر کے پڑوس میں بیٹھ کر اپنے شکار کا لقمہ تر بنایا۔

یہ تیندوے کی جرأت، مکاری اور تباہ کاری کی ایک مثال ہے۔

میں ان درختوں کے گرد طواف کرتا رہا ــ کبھی درخت کے اوپر دیکھتا کبھی زمین پر ــ جب احسن کو کسی نے اطلاع کی کہ میں وہاں آگیا ہوں تو وہ شاٹ گن لیے آموجود ہوا لیکن میں نے اس کو دور ہی ٹھہرے رہنے کو کہا ــ میں عصر کی نماز ادا کر چکا اس لیے اپنے کام میں لگا رہا۔

اور میری کوشش ضائع نہیں گئی ــ ایک درخت کے تنے پر مجھے اس موذی کے پنجوں سے اکھڑے ہوئے درخت کی چھال کے ٹکڑے نظر آ گئے ــ اور یہ فیصلہ کرتے دیر نہیں لگی کہ وہ اس درخت سے چڑھ کر گیا تھا ــ میں نے اوپر دیکھا۔

اس درخت کی ایک پتلی سی شاخ برگد کے درخت سے بالکل متصل تھی ــ بظاہر وہ شاخ اتنی مضبوط نہیں معلوم ہوتی تھی کہ تیندوا اس پر سے گذر کر دوسرے درخت پر گیا ہو لیکن اس کے علاوہ کوئی اور راہ بھی نہیں تھی ــ

اب مجھے دوبارہ ان نشانات کی جستجو ہوئی جو اس کی واپسی کی خبر دے سکیں۔ اس کے لیے میں نے برگد کے درخت کی جٹاؤں میں معائنہ شروع کیا۔ ناکامی رہی ــ دوسرے درختوں کے گرد طواف کئی بار ہو چکا تھا ــ ایک بار پھر کوشش کی ــ ناکامی ــ

اب میں نے دائرے بڑے کرنا شروع کئے، فاصلہ بڑھتا گیا ــ اور آخر کار اس کی واپسی کے نشانات بھی مل ہی گئے۔

دوسرے روز صبح میں نے احسن کو ان نشانات پر چلنے کا حکم دیا اور خود حسب معمول اس سے دس قدم پیچھے رہا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ چیتا نکل کر سیدھا جنوبی جانب کے پہاڑی علاقے میں گھسا تھا ــ ہم گاؤں سے نکل کر کھیتوں سے گذرتے جب جنگل میں داخل ہونے لگے تو ایک جگہ نرم مٹی پر چیتے کے ماگھ واضح تھے اور یہ وہی واپسی کے نشانات تھے ــ ان کا رُخ سیدھا جنوب کی طرف تھا۔

نشانات پا کے ذریعے جانوروں کو تلاش کر لینا کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔ میں بارہا یہ طریقہ اختیار کر چکا ہوں اور اکثر کامیابی ہوئی ہے۔

درختوں، جھاڑیوں اور پتھروں کے درمیان گھومتے ہم ان نشانات پر چلتے رہے۔ ایک نالے سے دوسرے نالے ــ اور پھر ہماری یہ کوشش ایک گہرے پہاڑی نالے کے کنارے ختم ہوئی ــ یہ نالہ قطعی پہاڑی نالہ تھا ــ کنارے سنگلاخ اور عمودی، گہرائی سات آٹھ فٹ رہی ہوگی ــ چوڑائی بھی کسی طرح پندرہ بیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ اور کناروں پر چھوٹے درخت جا بجا کھڑے تھے، کچھ تو ترچھے ہو کر نالے کے اوپر جھک گئے تھے، اس طرح کہ ان سے نالے پر سایہ ہو گیا تھا۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

یہیں نالے کے اندر جھانکا۔

تہہ میں پانی بہہ رہا تھا۔ لیکن صرف وسط میں۔ کناروں پر خشک ریت تھی جس پر جا بجا مختلف پنجے دار جانوروں کے پنجوں کے نشانات تھے۔ کہیں کہیں چیتے کے بھی رہے ہوں گے بات یہ تھی کہ تیندوا تو سیدھا اسی نالے میں اتر گیا تھا۔ اب ہم کیا کرتے۔ نالے میں اترنا ممکن نہیں تھا۔ یعنی خطرناک شکار میں، نالے کے اندر نہیں اترا کرتے۔ بالکل منع ہے۔ شیر اور چیتے کے شکار میں تو قطعاً ممنوع اور گویا خودکشی کے مترادف ہے۔

میں نے احسن کو ہدایت کی کہ وہ کسی ترکیب سے نالہ پار کرے۔ ذرا دیر کی تلاش سے ہمیں ایسی جگہ مل گئی۔ میں تیار کھڑا رہا۔ احسن نے نالہ پار کر لیا تو میں اترا اور دو لمحوں میں ہی دوسرے کنارے پر نکل گیا۔ اب ہم کو پھر ایسے نشانات کی جستجو ہوئی جو تیندوے کے نالے سے نکلنے کو ظاہر کریں۔

ہم جس نقطے سے نالے کے پار اترے تھے وہاں سے تقریباً ایک میل شمال اور پھر واپس اسی نقطے پر آ گئے کوئی نشان نہیں ملا۔ پھر اس نقطے سے کوئی ڈیڑھ میل جنوب کی طرف۔ لیکن کوئی نشان نہیں ملا۔ آخر اس کو کہیں نہ کہیں نالے سے نکلنا چاہیئے۔ میں نے وہاں ٹھہر کر ذرا دیر صورت حال پر غور کیا۔ معاً مجھے خیال ہوا کہ تیندوا ہم کو۔ یا اپنے تعاقب کرنے والوں کو دھوکا دینے کے لیے ممکن ہے نالے کے اسی کنارے پر چڑھ کر نکل گیا ہو جدھر سے وہ نالے میں گھسا تھا۔

فوراً ہی ہم واپس ہوئے۔ احسن نے نالہ پار کیا پھر میں نے۔ اور دوبارہ وہی تدبیر۔ اس نقطے سے پہلے شمال میں ایک ڈیڑھ میل۔ پھر جنوب میں کوئی نصف میل ہی چلے تھے کہ چیتے کے نالے سے نکل کر جنگل میں گھسنے کے صاف نشانات مل گئے۔ اور زیادہ تعجب یہ کہ ہم سیدھے ایک پہاڑی کی طرف گئے۔ اس پر چڑھے۔ دوسری طرف اُترے اور پھر ماگھ کا رُخ گاؤں کی طرف پا کر ان کو دیکھتے ہی چل پڑے۔

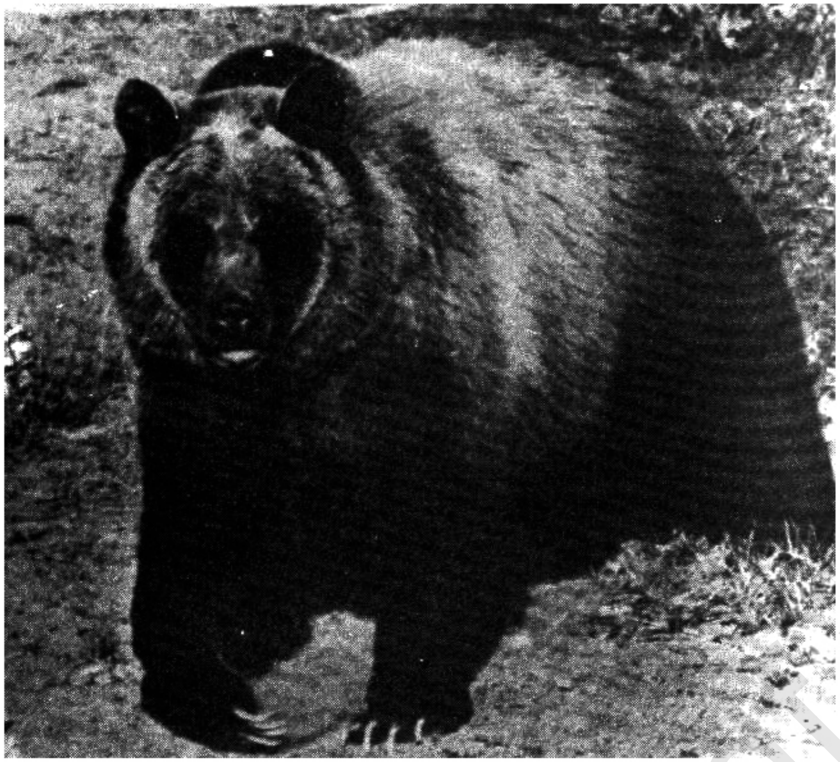

آخر یہ تیندوا کر کیا رہا تھا۔؟

ساری راہروی بے مقصد ہی معلوم ہوتی تھی۔

کوئی میل بھر چلنے کے بعد ایک درخت کے سائے میں تیندوے کے بیٹھنے کا نشان بھی ملا۔ اور غالباً اس نے جلد کھجلائی ہوگی اسی وجہ سے وہاں چند بال بھی پڑے ملے۔ یہاں سے چیتے نے پھر رخ بدل دیا تھا اور ایسا معلوم ہوا جیسے دوبارہ اسی پہاڑی کی طرف گیا جس سے ہم گذر کر آئے تھے۔

اب اگر ہم اسی طرف جاتے تو غالباً حماقت ہی ہوتی۔

میں وہیں ٹھہر گیا۔ احسن کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

جناب۔ اب ان نشانات کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ ویسے جو آپ کا حکم ہو۔

میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

واقعی تیندوا سیدھا اسی پہاڑی کی طرف گیا تھا جدھر سے ہم ابھی آئے تھے، لیکن اس بار یہ نشانات پہاڑی کے اوپر جانے کے بجائے مشرق کی طرف پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے۔ پہاڑی جس جگہ ختم ہو کر وادی میں تبدیل ہوتی ہے وہاں ایک پیپل کے درخت کے نیچے ہی کروندے کی جھاڑیاں تھیں، ان میں ریچھوں کا ایک خاندان کروندے کھانے میں مصروف تھا، ہم کو انھوں نے سو گز کے فاصلے سے دیکھ لیا، ہم بھی پہلے ہی انھیں دیکھ چکے تھے۔ اسی جگہ درختوں پر بندر بھی شور غل کئے ہوئے تھے۔ لال منھ کے بندروں کی ہندو پرستش بھی کرتے ہیں اور ان کا بہت احترام بھی اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے جدامجد شری ہنومان نے لنکا فتح کرنے اور سیتاجی کی بازیافت میں رام جی کی اعانت کی تھی۔

لال منہ کے بندر جسامت میں چھوٹے مگر شرارت میں بہت بڑے ہوتے ہیں، بڑے بڑے قبیلوں کی صورت میں رہتے ہیں اور ہر قبیلے کی سرداری ایک پرانے بندر کے سپرد ہوتی ہے جو یہ سربراہی اپنی جسمانی طاقت کے زور پر حاصل کرتا ہے اور سارا قبیلہ اس کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔ اس بندر کو عرفِ عام میں "بھل" بھی کہتے ہیں۔

ریچھ ہمیں دیکھ کر فوراً ہی بھاگ لئے۔

یہاں سے ہمارے اس روز کے سفر اور تلاش کا اختتام ہو گیا۔ اور ہم گاؤں واپس آ گئے۔ مغرب کی نماز میں نے گاؤں میں پڑھی۔ مجبوراً اور کئی معمر دیہاتی بیٹھک میں جمع ہو گئے اور رات تک ہم لوگ شکار، آدم خوروں اور مختلف دیہاتی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے رہے، نو بجے میں عشاء کی نماز کے لیے اٹھ گیا۔

اگلی صبح میں نسبتاً دیر سے نکلا۔ اور ہم سیدھے اس مقام پر پہنچے جہاں سے گذشتہ روز تعاقب چھوڑا تھا۔ جب وہ کروندے کی جھاڑی نظر آئی جہاں گذشتہ

روز ہم نے ریچھ دیکھے تھے۔ تو میں نے ذرا تامل کیا۔ اور اس لمحاتی حرکت کا یہ فائدہ ہوا کہ تین بڑے قدآور ریچھ، لاپرواہی کے ساتھ کروندے کے پھل کھاتے، جھاڑی کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ گذشتہ روز بھی ریچھ اسی مقام پر کروندے کھاتے ملے تھے۔

ریچھ سے محتاط رہنا ضروری ہے۔ انسان کو دیکھ کر اس درندہ نما چرندہ صفت جانور کے ردعمل کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ کبھی تو انسان کی جھلک دیکھ کر ایسا بھاگتا ہے کہ گیدڑ کیا بھاگے گا۔ اور کبھی حملہ کر بیٹھتا ہے۔ میری بیگم کے بھانجے عزت اللہ صدیقی، محکمہ جنگلات میں ملازم ہیں۔ ایک بار دورے کے زمانے میں وہ ایک جنگل سے گذر رہے تھے کہ ریچھ نے نزدیک سے ہی حملہ کیا اور ان کو خاصا زخمی کر دیا۔ یہ حملہ بے سبب تھا۔

ہم دونوں ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر تھے کہ میں زور سے کھنکھارا۔ پھر دو ایک بار کھانسا۔ ریچھ آواز پر متوجہ ہوئے۔ اور ہماری طرف دیکھا۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ اتنی دور سے بھی ریچھ کے بارے میں صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ اسے نظر آتا ہے یا نہیں۔ لیکن میرے ہاتھ ہلاتے ہی تینوں ریچھ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اسی مقام سے ہی ہم نے تیندوے کے ناکھ دوبارہ تلاش کر کے گذشتہ روز کا ادھورا کام مکمل کرنے کے ارادے سے تعاقب شروع کر دیا۔ کروندے کے جس جنگل میں ریچھ کھا پی رہے تھے اس سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر ہی چھدرے جنگل سے ڈھکی، پہاڑی تھی۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ عام سی چھوٹی پہاڑی ہے لیکن فی الواقعہ ایک دور دراز تک پھیلتے ہوئے سلسلے کا دیباچہ تھا۔ اور تیندوے کے نقوش پا سیدھے اسی پہاڑی پر گئے تھے۔ ریچھ بھی اسی پہاڑی کے ایک حصے کی طرف بھاگے تھے۔

میں نے احسن کو اشارہ کیا کہ وہ ایک نسبتاً کم برگ لیکن بلند درخت پر چڑھ کر پہاڑی کی بلندی پر جہاں تک نظر آ سکے اچھی طرح معائنہ کرے۔ نیچے سے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ریچھ

اوپر کی طرف جاتے ہوئے خاصی احتیاطی تدابیر ملحوظ رکھنا چاہیئے ــ جو جانور بھی اوپر سے نیچے کی طرف حملہ کرتا ہے اس کے حملے کی رفتار زیادہ سریع، اور مقابلہ دشوار ہوتا ہے ــ اسی طرح اوپر سے نیچے کی طرف فائر میں خاصی رعایت کرنا ہوتی ہے یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ نیچے سے اوپر کی طرف حملہ کرنے والے جانور کی رفتار خاصی کم اور مقابلہ نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔

احسن درخت پر چڑھ کر اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اُتر آیا۔ اور مجھے بتایا کہ پہاڑی پر کوئی جانور حدِ نگاہ تک نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ہم پھر چل پڑے ــ تیندوے کے ماگھ کہیں نہ کہیں مل ہی جاتے تھے ــ رفتہ رفتہ زمین بلند ہوتی گئی اور ہم پہاڑی کی چوٹی کی طرف بڑھتے رہے ــ آدم خور درندے کی جستجو میں نشیب سے بلندی پر جاتے ہوئے یا بلندی پر سے نشیب کی طرف آتے وقت جھاڑیوں درختوں اور چٹانوں کی آڑ میں رہنا سود مند ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کہ آدمی بلند جگہ پر ہو، جنگل کے جانوروں کو دور تک صاف نظر آتا ہے۔ اور ایک جانور کے ہوشیار ہو جانیکا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی معلومات کا اعلان کر کے جنگل کے دوسرے سارے باشندوں کو ہوشیار کر دے۔

جنگل کے ڈھنڈھورچیوں کی تعداد کافی ہے ــ
پرندے بالعموم سارے ہی جنگل میں کسی نئی بات ــ حرکت یا واقعے کو دیکھ کر شور ضرور کرتے ہیں ــ انسان کو دیکھ کر بھی بعض پرندے شور مچا دیتے ہیں خصوصاً شکاری کو دیکھ کر ــ حیرت کی بات تو یہی ہے کہ ان جانوروں میں عام جنگل کے رہنے والے، دیہاتی اور شکاری کی تمیز کا مادہ ہوتا ہے۔ لیکن کچھ پرندوں کی حس زیادہ تیز اور ان کے اعلانات کا دائرہ خاصا وسیع ہوتا ہے۔

جنگل بھی بولتا ہے۔ اس کی اپنی زبان ہے۔ اس کے اپنے طور طریقے ہیں۔ ماحول ہے۔ سکون ہے اور ایک مرتب صورت حال ہے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی یا کسی اجنبی کا ورود ــ جنگل کے ماحول پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے۔ اور جنگل کے رہنے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

والے، اپنی زبان میں اس وقوعے کا اعلان بھی کر دیتے ہیں۔ جن پرندوں سے محتاط رہنا ہوتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ مور ۲۔ مینائیں، ۳۔ کوّے
۴۔ عام چڑیاں۔ گورتیاں۔ چڑوٹے ۵۔ جنگلی مرغی

یہ نئے آدمی۔ یا شکاری کو دیکھ کر بہت غل مچاتے ہیں۔

وہ جانور جن سے جنگل والے خطرے کی اطلاعات حاصل کرتے ہیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ بندر

خصوصاً کالے منہ کا بندر۔ یہ بڑے بڑے قبیلوں کی صورت میں رہتے ہیں اور جہاں بھی ٹھہرتے ہیں وہاں سب سے پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ ایک نہایت پرانی، خرانٹ، قسم کی بندریا کو چوکیداری پر مقرر کرتے ہیں۔ یہ بندریا کسی اونچے درخت کی سب سے بلند شاخ پر اس زاویے سے بیٹھتی ہے کہ چاروں طرف کڑی نگرانی رکھ سکے۔ کیا مجال جو اس کی حدِ نگاہ کے اندر ہلکی سے ہلکی غیر عادی حرکت، یا کسی درندے کی موجودگی اس کی نظر سے بچ جائے۔ ادھر خطرے کا احساس ہوا ادھر اس نے ایک خاص آواز نکالی اور سارا قبیلہ آن واحد میں حرکت میں آجاتا ہے، اور حرکت بھی اس سرعت سے کہ جن درختوں پر یہ ہوتے ہیں ان میں زلزلے کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ دور دور تک کے جانوروں کو علم ہو جاتا ہے کہ بندروں نے کسی خطرے کی بو سونگھ کر نقل مکانی کی۔ اور اس نقل مکانی میں اطراف جوانب کے سارے ہی جانور شریک ہو کر کسی محفوظ تر مقام کی طرف حرکت کر جاتے ہیں۔

لال منہ کے بندر بھی خطرے کی بو سونگھ کر اپنے بڑوں کی سی حرکت کرنے اور سارے جنگل کو اپنی چیخ دھاڑ سے سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

۲۔ سور۔ خطرے کی بو سونگھ کر بھاگتا ہے تو ایسی کر یہہ خوں خوں کرتا ہے کہ دہشت معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ ریچھ۔ ۴۔ سانبھر۔ ۵۔ بارہ سنگھا۔

میں ان تمام جانوروں کا خاص خیال رکھتا ہوں۔

ان ہی جانوروں کی بولیوں اور حرکات کو اگر بغور سنا اور مشاہدہ کیا جائے تو مطلوبہ جانوروں کی نقل و حرکت، موجودگی یا عدم موجودگی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ بعض اوقات خطرے کے مواقع پر، میں نے ان جانوروں کی حرکات کا مشاہدہ اور تجزیہ کر کے خطرات کا نہایت کامیاب مقابلہ کیا ہے۔

ہم بتدریج پہاڑی پر چڑھتے گئے، جھاڑیوں کی آڑ لیتے، پتھروں کو پردہ بناتے، آگے ہی بڑھتے رہے۔ اور ماگھ برابر ملتے رہے۔ البتہ پہاڑی پر ان کو ڈھونڈھ نکالنا آسان نہیں اس لیے کہ بیشتر سطح پتھریلی یا بہت سخت ہوتی ہے لیکن اگر ذرا تردد کیا جائے تو بات بن ہی جاتی ہے۔

آخر ہم پہاڑی کے اوپر آ گئے۔ یہاں کوئی دو سو گز عریض اور غالباً میل ڈیڑھ میل طویل سطح مرتفع بن گئی تھی۔ اس کے بعد ایک اور اس پہاڑی سے بلند پہاڑی تھی جس کو ہم سر کر چکے تھے۔ مگر اس کی نوعیت اتنی مختلف تھی کہ درخت کم اور فاصلے سے تھے۔ اور پہاڑی کا جسم نہایت شفاف سرخ پتھروں۔ بلکہ سنگلاخ چٹانوں کا سا تھا۔ تہہ سے لے کر اوپر تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف حجم اور شکلوں کی بڑی بڑی چٹانیں۔ یا ٹول۔ اس طرح رکھے تھے جیسے کسی نے ان کو اوپر سے بیک وقت لڑھکا دیا ہو اور وہ لڑھکتے لڑھکتے ادھر اُدھر اٹک کر رکتے گئے حتیٰ کہ سارے پہاڑی دامن پر اسی طرح کے ٹول جمع ہو گئے۔

ہم نے دو سو گز کا عرض بہت احتیاط اور سکون سے طے کیا اور اس سطح مرتفع کے آخری سرے پر پڑی پہلی ٹول کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں کوئی ایسی بلند جگہ یا اونچا درخت نہیں تھا جس پر اس کو چڑھنے کے لیے کہا جاتا۔

تیندوے کے ماگھ بھی یہاں آ کر ختم ہو گئے تھے، صرف آدھے پنجے کا ایک مٹا سا نشان ملا تھا جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ تیندوا اس پہاڑ پر ضرور گیا ہے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں نے یہاں ٹھہر کر موقعے کی نزاکت کے بارے میں غور کیا۔ اس علاقے میں احسن کو ساتھ لے کر گھسنا نہایت خطرناک عمل معلوم ہوا۔ احسن کی زندگی بہت قیمتی تھی۔ ہر انسان کی زندگی مساوی حیثیت کی گراں قیمت ہوتی ہے لیکن احسن کی حفاظت میرے ذمہ تھی۔ اور ایسی حالت میں کہ ہر طرف اتنے بڑے بڑے ٹول جمع تھے جن کے پیچھے کسی جگہ بھی تیندوا چھپا ہو سکتا تھا مجھے احسن کا جانا قطعاً مناسب معلوم نہیں ہوا۔

آخر میں نے فیصلہ کر لیا۔

"احسن۔ تم واپس جاؤ۔ وہ جو درخت ہے اس پر چڑھ جاؤ۔"

"کیوں جناب۔ ؟"

"میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔"

بحث کا موقعہ نہیں تھا۔ وہ ذرا دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔

"آپ اکیلے جائیں گے۔ ؟"

"ہاں۔"

"جناب۔"

"احسن۔ وقت نہ ضائع کرو۔"

پھر بھی اس نے ٹلنے میں کئی منٹ لگائے۔

اور آخر بادل نخواستہ وہ نیم کے اس درخت پر چڑھ گیا۔ جہاں اس کو میری واپسی تک بیٹھے رہنا تھا۔ میں نے رائفل کو ایک بار پھر دیکھا کہ کارتوس ہیں کہ نہیں۔ اور بسم اللہ کہہ کے دو چٹانوں کے درمیان خلا میں داخل ہو گیا۔

دوسری طرف نکلا تو زمین سرخ مٹی کی تھی اور تیندوے کا بالکل تازہ نہایت واضح ماگھ۔ چند لمحوں قبل کا۔ گویا وہ موذی وہاں موجود تھا۔

میں نے رائفل کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے سیفٹی کیچ نہیں کھولا تھا۔

اب میں اور زیادہ احتیاط سے اوپر کی طرف چلا۔ یہاں ایک شریفے کا گھنا نگر پست قد درخت بھی تھا۔ میں اس کے نزدیک سے گذرا اور بلندی کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک جگہ زمین اور کنکر خاصے نرم تھے میں نے احتیاط کے ساتھ قدم رکھا کسی قدر اونچائی تھی، میں کوشش کر کے چڑھا کہ پیر نہ پھسل جائے۔

اسی وقت ذہن میں ایک کوندا ہوا۔

میں نے بہت دن پہلے خواب میں یہی جگہ تو دیکھی تھی۔ اسی جگہ میرا پیر پھسلا تھا۔ اور اسی جگہ ریچھ نے درخت پر سے کود کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔

میں نے گھبرا کر شریفے کے درخت کی طرف دیکھا۔

ایک بہت بڑا۔ کالا اور خوفناک ریچھ پتوں میں چھپا مجھے ہی گھور رہا تھا۔

اور اس جھٹکے کے ساتھ گھوم کر درخت کی طرف دیکھنے کی حرکت میں وہ نرم کنکری حصہ ٹوٹ گیا جس پر میں نے احتیاط سے پیر رکھا تھا میرا توازن بگڑا۔ اور قبل اس کے کہ میں سنبھل سکوں، پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی اور میں دھڑام سے گرا۔

رائفل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

اور میں لڑھک کر ٹک کر رہ گیا۔

اسی وقت درخت پر نظر پڑی۔ ریچھ کودنے ہی کو تھا۔

میں اُٹھا۔ اور سیدھا اس درخت کی طرف بھاگا جہاں احسن چڑھا تھا۔ کیونکہ میری شاٹ گن جو احسن لے کر چلتا تھا۔ درخت کے تنے سے ٹکی رکھی تھی۔

اور ریچھ درخت سے کود کر میری طرف دوڑا۔

ریچھ کو خاموش رہنا تو آتا ہی نہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ آواز ضرور نکالتا رہتا ہے۔ خصوصاً گھبراہٹ، خوف یا غصّے کی حالت میں۔ اس وقت اس کی حلق سے مختلف قسم کی بھیانک سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اور اسی حالت میں مجھے احساس ہوا کہ احسن بھی بری طرح چیخ رہا ہے۔ شور کر رہا ہے۔ اور شاید اسی شور کا اثر تھا کہ ریچھ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں بھاگ کر درخت کے پاس پہنچا شاٹ گن اُٹھائی اور گھوم کر دیکھا تو اطمینان کی رفتار سے بدستور بڑبڑاتا ہوا رخ بدل کر سطح مرتفع کے مشرقی حصے کے جنگل کی طرف بھاگا جارہا تھا — احسن اب خاموش ہوگیا — میں بھی چند لمحے گم سم کھڑا رہا — پھر شاٹ گن سنبھالے اپنی رائفل اُٹھانے بڑھا — اور چاروں طرف اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد شاٹ گن شانے پہ ڈالی اور رائفل اُٹھالی — بظاہر اس پر گرنے کا کوئی اثر نہیں تھا صرف یہ کہ سُرخ مٹی میں لتھڑ گئی تھی۔

"جناب میں اتر آؤں —"

احسن نے درخت پر سے ہی پوچھا

میں نے اس کو منع کیا —

شاٹ گن میں نے رکھدی — ساتھ رائفل بھی — اور اب اپنا جائزہ لیا — کوئی چوٹ نہیں آئی — صرف دونوں کہنیاں ذراسی چھل گئی تھیں — پیر مڑ گیا تھا۔ جو ذرا دیر تکلیف دے کر ٹھیک ہوگیا۔

اور مجھے اپنا خواب یاد آگیا — سارا وہی کچھ ہوا تھا جو میں دیکھ چکا تھا صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت اور فضل سے نوازا اور انجام بخیر ہوا۔

میں نے رومال نکال کر رائفل کو اچھی طرح صاف کیا۔ ایکشن کو ایک بار چلا کر روانی کا امتحان کیا اور جو کارتوس اجکٹ ہوا تھا وہ دوبارہ لگا دیا۔ اپنے کپڑے جھاڑے، پرانی ٹوپی جو سالہا سال سے استعمال کر رہا ہوں اور جس کا مُنڈ خراب ہو چکا ہے مگر میں اس کو ترک نہیں کرتا۔ اسے بھی سنبھال کر سر پہ فٹ کیا۔ احسن کو اشارے سے بتایا کہ شاید تیندوا وہیں کہیں نزدیک ہی ہو — اور یہ کہ اس کو خاموش بیٹھے رہنا چاہیے۔

میں نے عزم کے ساتھ پھر اس پہاڑی پر چڑھنے کے لیے بڑھا — اور آہستہ آہستہ چٹانوں کے درمیان سے گذرتا چلا گیا — نہ صرف اطراف بلکہ اوپر بھی نگاہ رکھنا پڑتی ہے — تیندوے کا کیا پتہ، کسی ٹول پر چڑھ کر ہی حملہ کردے کوئی پینتالیس منٹ بعد میں پہاڑ کے بلند ترین نقطے تک آگیا — یہاں سے عقب کی جانب نگاہ کی تو ایک گہری وادی نظر آئی — بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک گھاٹی سی تھی جو نہایت گھنے شریفے، کروندے، فالسے اور اچار کے درختوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی — میں جس مقام پر تھا وہاں سے یہ گھاٹی کوئی ڈیڑھ سو گز نشیب میں تھی —

اور تھوڑی دیر ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد میں پانی کے گراؤ کی ایک نالی میں جو کنکریوں اور سرخ ریت سے پُر تھی اتر گیا۔ یہ نالی کوئی تین فٹ چوڑی اور ڈیڑھ دو فٹ گہری تھی۔ — اور میں جس مقصد سے اترا تھا وہ بھی پورا ہوا۔

نرم سرخ ریت پر تیندوے کا تازہ ماگھ تھا — لیکن نیچے اُترنے کا نشان۔ گویا وہ گھاٹی میں اتر گیا تھا، میں فوراً وہیں دبک گیا — اگرچہ وہاں آڑ تو تھی نہیں۔ اگر تیندوے نے اوپر نظر اُٹھائی تو میں صاف نظر آجاؤں گا — اسی خیال سے میں

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بہر حال ساکت بیٹھا ہی گیا — اور بغور ان خطوں کا جائزہ لینے لگا جو درختوں کے درمیان نظر آتے تھے — تقریباً نصف ساعت اس معائنے کے باوجود کچھ نظر نہ آیا تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی — اور اوپر واپس آ کر کسی ایسی جگہ کی تلاش شروع کی جہاں سے احسن کو دیکھ سکوں — مگر ممکن نہ ہوا — آخر میں ان چٹانوں سے گذر کر دوسری طرف اترا اور احسن کے آشیانے والے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔

نیچے اُتر آ بھئی —"

میں نے حکم دیا

احسن ذرا ملیں ہی اُتر آیا۔

"تیندوا اس پہاڑ کے پیچھے گھاٹی میں ابھی اترا ہے"

"ہم بہت دور میں گاؤں سے"

لیکن میں گھاٹی میں اُترے بغیر کیسے واپس ہوتا — ابھی تو ظہر کا وقت بھی نہیں ہوا تھا — اور پھر واپسی کے لیے ہم سیدھا اور چھوٹا راستہ اختیار کر سکتے تھے۔

احسن نے کھانے کے بارے میں پوچھا — میں نے انکار کیا وقت ضائع ہوتا۔ لہٰذا احسن شاٹ گن اور جھولا اُٹھا کر آگے آگے چل پڑا — ہم کسی قدر تیز قدم، لیکن بدستور احتیاط کے ساتھ، پہاڑ پر چڑھے اور کوئی آدھ گھنٹے میں ہی پہاڑ کے کنارے آ پہنچے جہاں سے گھاٹی نظر آتی تھی — میں جس نالی کا تذکرہ کر چکا ہوں وہی نالی اس گھاٹی میں اُترنے کا بہترین راستہ ثابت ہوئی، اور ہم بیس منٹ کی کوشش میں نیچے اُتر آئے — اور اترے بھی اس قدر بے آواز اور پوشیدہ طریقے سے کہ جب نیچے پہنچ کر ہم نے اس جھاڑی کی آڑ سے جھانکا جو نالی کے اختتام پر ہی تھی تو پہلے اس سانبھر پر نظر پڑی جو سامنے ہی ایک کشادہ لیکن چھوٹے گھاس کے قطعے سے گذر رہا تھا — اگر ہم اس نالی سے اُترتے نظر آ رہے ہوتے تو سانبھر نے ضرور ہم کو دیکھا ہوتا اور اس صورت میں اس کی رفتار ایسی نہ ہوتی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اطمینان کی حالت میں ہے۔

یہاں — گھاٹی کی زمین نرم تھی، اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس جگہ — یعنی نالی کے عین مقابل — گویا اس کی نکاس پر جو تھوڑی سی جگہ پانی کے گرنے کے زور سے بن گئی تھی وہ اگرچہ ریت اور پتھروں سے مل کر بنی تھی لیکن، ریت نرم اور کافی دور تک پھیلی ہوئی تھی — اس پر بیشمار ماگھ — اور سارے نشانات کا معائنہ کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نالی گہری ہونے اور جھاڑیوں میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے چیتے کے نیچے سے اوپر جانے اور واپس آنے کی بہترین مخفی گذرگاہ تھی۔ اور یہ بات بھی پایہ تحقیق کو پہنچی کہ اگر تیندوا اس علاقے میں رہتا نہیں تو کم از کم بکثرت اِدھر آمد و رفت رکھتا ہے۔ پھر یہ کہ اس جنگل، پہاڑ اور گھاٹی کے کسی نہ کسی حصے میں ان کی قیامگاہ بھی ہو سکتی ہے۔

جنگل کی نوعیت موقعے اور ماحول کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا تھا کہ وہ مقام درندوں کے لئے موزوں ترین جگہ تھی۔

گھاٹی کی وسعت، یا چوڑائی بیس پچیس گز سے زیادہ نہیں تھی۔ لمبائی کئی میل رہی ہوگی — ساری گھاٹی مختلف درختوں سے گنجان بن گئی تھی۔ اور درخت سارے ہی شاداب، اور پھلوں سے لدے ہوئے۔ اسی لئے اس گھاٹی میں طوطے، مینائیں اور دوسرے پرندے بھی کثرت سے تھے۔

بڑی مشکل یہ پیدا ہوئی کہ اس مقام پر ماگھ اس کثرت سے تھے کہ ان کی سمت یا کسی ایک طرف جاتے ہوئے نشانات کا تعین ممکن نہیں ہوا — اور جب پانی کے گراؤ اور پہاڑ کی حدود سے نکلے تو زمین سبزے، جوا فسے کے پودوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں نے احسن کو اسی جگہ چھوڑ کر خود ایک نیم دائرے کی شکل میں گھوم کر کافی علاقے کا جائزہ لیا۔ لیکن کوئی نقش قدم پیدا نہ کر سکا — پھر میں اور احسن دونوں اسی طرح صف بستہ گردش میں آئے۔ کافی علاقہ تلاش کیا اور ناکامی ہوئی۔

ظہر کا وقت ہو گیا تھا — پانی تو وہاں نزدیک تھا نہیں میں نے تیمم کیا اور

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

احسن کو نگرانی پر مامور کر کے خود ظہر کی نماز قصر کر کے ادا کی۔ اس کے بعد پھر تلاش شروع کر دی، اور اس بار چند نشانات ڈھونڈھ ہی لیے جو گھاٹی کے جنوب کی طرف گئے تھے اور زیادہ پرانے بھی نہیں تھے۔ پھر مزید غور کیا تو اور کچھ نشانات بھی ملے ــ کچھ ایسے تھے جن کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا کہ تیندوے کے اس طرف آنے کے ہیں۔ اور کچھ واپسی کے۔

سوال یہ تھا ــ

کیا اس کی HOLDING GROUND جنوب کی جانب ہے۔!

اور اس سوال کا جواب اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک کہ اس کے رہنے کی جگہ ہم دیکھ نہ لیں۔

درختوں کے تنے ہی اتنے قریب تھے کہ پانچ دس گز سے زیادہ دور نظر نہیں آتا تھا۔ پھر بعض جگھوں پر جھر وبجی کی جھاڑیاں بھی خوب گنجان ہو گئی تھیں اور اسی وقت جب میں ایک جھاڑی کو شبہے کی نظروں سے دیکھ رہا تھا ــ ایک چکارا دم ہلاتا نکلا، اور ایک نظر ہمیں دیکھ کر نہایت تیزی سے اسی جھاڑی میں گھس گیا۔

ظاہر تھا کہ تیندوا وہاں موجود نہیں ــ

درختوں پہ بندر بھی تھے ــ اور سب پر سکون ــ

پرندے بھی تھے ــ اور اطمینان سے پھل کھانے ــ یا وقت گذاری میں مشغول۔

وقت زیادہ ہو گیا تھا ــ احسن کو اشارہ کیا تو اس نے وہیں صاف جگہ منتخب کر کے دسترخوان بچھا دیا، اور میں نے کھانا کھایا ــ کھانے میں دیر ہو گئی تھی اس لیے گوشت کی چند بوٹیوں اور روٹی کے ایک ٹکڑے پر اکتفا کی اس کام میں بھی کوئی آدھا گھنٹہ تو صرف ہو ہی گیا ــ احسن نے ایک خوب پکا ہوا شریفہ توڑ کر دیا وہ میں نے کھا لیا ــ

واپسی سے پہلے میں نے اس گھاٹی میں ایک اور طویل چکر لگایا۔
گھاٹی سے پہاڑ پر چڑھنا ــ اور پھر اسی نالی کے ذریعے کچھ اتنا آسان نہیں

تھا ــ جتنا وقت اترنے میں لگا تھا، اس کا تین گنا وقت چڑھنے میں لگا ــ حتیٰ کہ ہم جب پہاڑی سے اتر کر وادی کی وسعت میں پہنچے تو عصر کا وقت گذر رہا تھا ــ میں نے ایک پہاڑی چشمے پر وضو کر کے نماز ادا کی۔

وضو اور نماز کے بارے میں شاید کسی کو گمان گذرے کہ میں خطرے سے قطعاً لاپرواہ ہو کر یہ کام کرتا تھا، یا میں کچھ غیر معمولی حد تک بہادر ہوں ــ یہ دونوں باتیں درست نہیں۔

میں نماز تو حتی الامکان کبھی نہیں چھوڑتا ــ لیکن احتیاط بھی جاری رہتی ہے ــ میں کوئی غیر معمولی بہادر شخص بھی نہیں ہوں ــ عام لوگوں کی سی جرأت رکھتا ہوں۔

جب احسن یا اور کوئی معتبر ساتھی موجود ہو تو اس کو رائفل دے کر نہایت ہوشیاری سے نگرانی کی تاکید کرتا ہوں اور وضو کرتے وقت یا نماز پڑھتے وقت اپنی رائفل یا بندوق اس طرح رکھتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ شیر یا چیتا یا اور کوئی درندہ حملہ کر دے تو فوراً ہی اٹھ کر فائر کر سکوں ــ ویسے الحمد للہ نماز وغیرہ کی حالت میں مجھ پر کبھی کسی نے حملہ نہیں کیا ــ البتہ صرف ایک بار نہایت اضطراری حالت ضرور پیدا ہوئی ہے ـ

میں جہلم ــ یعنی کوہستان نمک میں اپنی پسندیدہ شکارگاہ، پوٹھا کوبالی کے علاقے میں سرگرداں تھا ــ اشرف ساتھ تھا ــ نہ معلوم کس وجہ سے اسلم ساتھ نہیں تھا ــ ظہر کا وقت ہوا تو میں نے چشمے پر وضو کیا اور اپنی سیون ملی میٹر کی بھری ہوئی رائفل اور دونالی شاٹ گن جس میں کارتوس لگے ہوئے تھے پہاڑی چٹان سے ٹکا کر رکھی۔ اور نزدیک ہی نماز کی نیت باندھ لی ــ اشرف ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

ابھی پہلی ہی رکعت تھی کہ نہ معلوم کیسے ایک دیہاتی جو ادھر سے گذر رہا تھا۔ نزدیک آیا ــ اشرف سے سلام دعا کی اور جھٹ ہاتھ بڑھا کر میری رائفل اٹھا کر دیکھنے بھالنے لگا ــ میرے تو ہوش اڑ گئے ــ اس نے اپنی دلچسپی اور مہارت کے اظہار کے لیے ایک بار نالی اشرف کی طرف بھی کی ــ

اب میں نماز کیسے جاری رکھتا ــ توجہ کیا ــ خوف اور پریشانی سے پسینے

http://updf.weebly.com

پسینے ہوگیا اور اس قدر مضطرب ہوا کہ آخر نماز توڑ کر اس گدھے کے ہاتھ سے رائفل لی۔ اور اس کو ایسی ڈانٹ پلائی کہ بس یاد ہی کرتا ہوگا۔ ساتھ اشرف کی بھی خبر لی کہ اس کو چاہیئے تھا منع کرتا اور ہتھیاروں کو ہاتھ نہ لگانے دیتا۔ اشرف بھی نادم ہو کر رہ گیا۔

جب وہ دیہاتی چلا گیا تو میں نے توبہ استغفار کی اور نماز پڑھی۔

لیکن یہ ان جنگلوں کی بات ہے جہاں خطرہ کوئی نہیں تھا۔ اسی لئے وہ دیہاتی آرام سے گھوم بھی رہا تھا۔ جن جنگلوں میں شیر یا چیتے کا وجود ہو وہاں بالعموم لوگ بے دھڑک ٹہلتے نہیں ہیں۔ اور جس علاقے میں آدم خور کا ہونا ثابت ہو وہاں کسی کی کیا مجال کہ جا سکے۔ جانور کے حملے کا ہی خطرہ ہوتا ہے۔

عصر کی نماز کے بعد میں چند لمحے وہیں ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد ہم سیدھے گاؤں واپس آئے۔ راستے بھر میں سوچتا رہا کہ پہاڑی کے اس مقام پر جہاں وہ گہری نالی اوپر آکر نکلتی ہے۔ درخت بھی مچان کے لیے موزوں تھے اور بکری یا کتا باندھ کر چیتے کے آنیکا انتظار کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں نے یہ کام کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

دوسرے روز میں ایک بکری ساتھ لے کر نکلا۔ احسن کے ہاتھ میں اس کی ڈوری تھی۔ اور بکری بھی ایسی ضدی کہ دس منٹ سیدھی چلے اور پانچ منٹ اڑ جاتی کہ ہم دونوں کی کوشش سے بھی نہ کھینچی جائے تا آنکہ میں اس کے دو ایک چھڑیاں رسید کر دوں۔ گویا احسن بکری کو کھینچتا آگے آگے، اور میں چھڑی ہاتھ میں لئے بکری کو مستقل دھمکاتا اور کبھی کبھی ایک آدھ چھڑی رسید کرتا پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

لیکن میں نہ تو احسن کی حفاظت کی طرف سے غافل تھا نہ اپنی احتیاط کی عادت ترک کی تھی۔ رائفل سیدھے ہاتھ میں تھی اور وہی تین سو چھتر میگنم۔ جو بہر حال چار سو پچاس ایکسپریس کی نسبت ہلکی ہوتی ہے۔ میں نے شاٹ گن تو بارہا شانے پر لگائے بغیر، ہاتھوں میں ہی پکڑ کر فائر کی ہے لیکن رائفل کا دھکا بہت ہوتا ہے

اور میں نے نہیں سنا کہ کسی نے کبھی بڑی رائفل شانے پر رکھے بغیر فائر کر دی ہو۔ میں تو معمولی تن و توش اور معمولی طاقت کا آدمی ہوں۔ اکثر فائرنگ رینج پر فائر کی پریکٹس کے دوران جبکہ کم از کم بیس پچیس فائر تو کر ہی دیئے جاتے ہیں۔ میرے شانے پر وہ جگہ جہاں رائفل کا کندہ مضبوطی سے رکھا جاتا ہے، ریکوائیل برداشت کرتے کرتے نیلی ہو جاتی تھی۔ شاٹ گن سے بھی مرغابی کے شکار میں پے در پے پچاس ساٹھ فائر کرنے سے شانہ نیلا ہو جاتا تھا۔

اس بکری کو کھینچتے گھسیٹتے ہم نے کوئی دو ڈھائی گھنٹے کی سخت محنت کے بعد وہ فاصلہ طے کیا اور مطلوبہ جگہ پہنچے۔ ایک درخت کی زمین سے نکلی ہوئی جڑ میں بکری کو باندھ دیا۔ فوراً ہی احسن نے میرے منتخب کردہ درخت پر چڑھ کر رسوں کا جھولا بنا دیا جس میں مجھے بیٹھنا تھا۔ مچان باندھنے کا تو وقت تھا نہ موقع۔ جس درخت پر جھولا باندھا گیا تھا وہ بکری کی جگہ سے کوئی بیس پچیس گز کے فاصلے پر تھا۔ اور مجھے

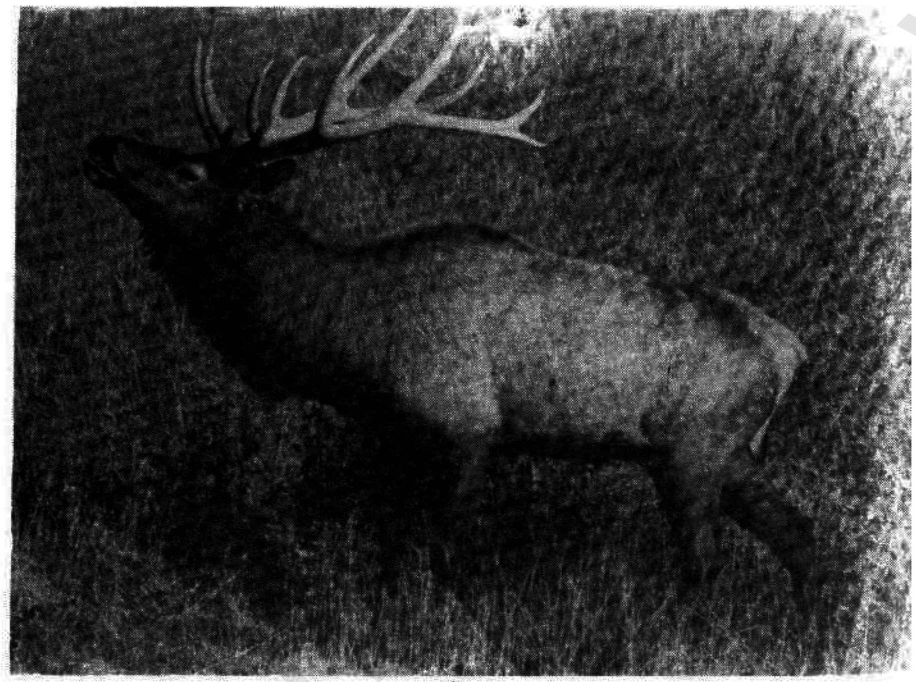

بارہ سنگھا

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

یقین تھا کہ رات کو اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی میں اسی مقام کو بہ آسانی دیکھ سکوں گا۔ چاند کی آٹھ نو تاریخ تھی اس لئے آدھی رات کے بعد تک تو چاندنی ہی رہنا تھی۔

پھر میرے پاس بڑی ٹارچ بھی تھی اور ضرورت پڑنے پر روشنی کی جاسکتی تھی۔

اس کام سے ہم دوپہر کو ساڑھے گیارہ بجے فارغ ہو گئے، اب شام تک وقت گذارنا تھا ــ میں نے احسن کو اسی پہاڑی کے آخری سرے کی طرف چلنے کو کہا ــ یہ جگہ بکری سے کوئی نصف میل کے فاصلے پر جنوب کی جانب تھی اور نسبتاً بلند تھی یہاں ایک ایسی جگہ جہاں گھاس نہیں تھی اور اطراف میں بھی پچیس تیس گز تک کسی جانور کے چھپنے کا موقع نہیں تھا ـ میں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا ــ احسن کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرنا ضروری نہیں تھا ــ وہ اپنے فرائض بنا بنا خوب جانتا تھا۔

میں نے اپنی رائفل دائیں طرف نزدیک رکھی ـ شکاری تھیلا سر کے نیچے تکیے کی طرح رکھا اور آرام سے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں ـ غالباً دس منٹ کے اندر میں غافل سو گیا ـ میری عادت ہے کہ جب اور جہاں چاہوں لیٹ کر ذرا دیر کی کوشش سے ہی سو جاتا ہوں اور جتنی دیر کا پروگرام بنا کر لیٹوں اتنی دیر بہ آسانی سو لیتا ہوں۔ بشرطیکہ کوئی خاص فکر نہ ہو ــ احسن ہوشیار بیٹھا تھا اس لئے مجھے اطمینان تھا۔

اس وقت کا سویا ہوا میں پانچ بجے سہ پہر کو بیدار ہوا ــ چشمے پر وضو کر کے ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں۔ اور احسن کی راہنمائی میں واپس اس درخت تک آگیا جہاں بیٹھنا تھا ــ بکری بدستور شور کئے ہوئے تھی ــ احسن نے اس کو پانی پلایا اور نزدیک گھاس بھی جمع کر دی۔

پہلے احسن درخت پر چڑھا ــ اس کے بعد ہتھیار رسی میں باندھ کر اوپر کھینچے اور آخر میں میری باری آئی ــ میں بہ آسانی درختوں پر چڑھ جاتا ہوں ـ لیکن وہ درخت خاصا عمودی تھا اور بڑی کوشش کے ساتھ میں جھولے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

جھولے پر بیٹھنا کوئی آرام دہ فعل نہیں ہے ـ بلکہ نہایت تکلیف دہ کام ہے ایسی حالت میں کہ مچان نہ باندھی گئی ہو اتنا ہی غنیمت ہوتا ہے ـ دیر تک جھولے میں

بیٹھنے سے اکثر رسیاں کاٹنے لگتی ہیں ـ پیر سُن ہو جاتے ہیں لیکن یہ سب درخت کی شاخ پر بیٹھنے سے بہرحال بہتر ہوتا ہے۔

میں نے اطمینان سے بیٹھ کر رائفل سنبھال لی ـ ٹارچ نزدیک ہی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ میں پھنسا دی تاکہ اندھیرا ہو نیکے بعد ہاتھ لگنے سے گر نہ جائے ـ بعض وقت ہوا کے تیز جھونکوں سے شاخ ہلتی ہے تو اس پر رکھی ہوئی چیزیں گر جاتی ہیں اسی لیے ہمیشہ ٹارچ، خنجر اور دوسرا سامان کسی نہ کسی شاخ میں ایسے پھنسا دینا چاہئیے کہ گر نہ سکے ــ

احسن مجھ سے ذرا فاصلے پر مخالف جانب منہ کئے شاخوں کے ایک مناسب اتصال پر جم کر بیٹھ گیا تھا ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ ساری رات بے آرامی میں گذارنا ہے ــ میں تو چار پانچ گھنٹے سو کر اپنی نیند پوری کر چکا تھا ــ اب احسن کی باری تھی۔ اس نے اپنے انگوچھے سے شاخ کے گرد اپنے کو باندھ بھی لیا تاکہ سوتے ہوئے گر نہ جائے۔

میں نے جب مغرب کی نماز کے لیے نیت کی، اس وقت بادلوں کے چند ٹکڑے جنوب کی طرف سے بڑھتے نظر آئے ـ یہ صورت حال تشویش ناک تھی ــ بکری تھوڑے تھوڑے وقفے سے آوازیں نکال رہی تھی اور جیسا کہ اس ڈرپوک جانور کی عادت ہوتی ہے چیخ چیخ کر آواز بٹھالی تھی ــ چنانچہ پہلے وہ جس سماعت شکن آواز سے چیختی تھی اب اس کی شدت خاصی کم ہو چکی تھی ــ اور میں جانتا تھا کہ رات تک اس کی حلق بالکل ہی بیٹھ جائے گی

نماز ختم کر کے میں نے رائفل ہاتھ میں لے لی ـ

اب تیندوے کا انتظار شروع ہوا ـ

بکری کے شور کی وجہ سے جو جنگلی جانور ادھر آنے کا ارادہ بھی کرتے ہوں گے، وہ کترا کر نکل گئے ــ نہ کوئی نیل گائے نہ سانبھر، نہ چیتل، حتیٰ کہ گیدڑ بھی نہیں آئے گو آدھی رات کے قریب پہاڑی کے اس طرف گیدڑوں کی ہکا ہوا ہو کی آوازیں آتی رہیں ــ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بکری کی آواز بالکل بیٹھ گئی تھی۔ اور اب اس کی چیخنے کی کوشش میں صرف سیں سیں کی سی آواز نکلتی تھی۔

چاندنی تو شام سے ہی پھیل گئی اور اس کی حسین و خنک روشنی میں جنگل کے سکوت سے سرشار بھینی بھینی پاکیزہ اور حیات بخش خوشبو پھیل گئی ۔۔۔ گھنے سبز درخت چاندنی کے دوشالے اوڑھ کر ایسے خاموش کھڑے تھے جیسے مناظر کی دلکشی سے مبہوت ہو گئے ہوں بادلوں کے وہ آوارہ ٹکڑے جو میں نے شام کو دیکھے تھے، ہواؤں کے بہاؤ میں کسی اور سمت نکل گئے تھے، یوں تو جنگل ساکت تھا۔ لیکن اس سکوت میں بھی ایک ترنم، ایک غنا کی سی کیفیت تھی ۔۔۔ اور ایسی ہوش ربا کیفیات کے عالم میں تیندوے کی فکر کسے رہتی ہے۔

رائفل ہاتھ میں تھی لیکن مجھ پر الہامی کیفیت طاری تھی، اور میں ماحول کی رنگینی اور دلکشی میں غرق قدرت کی فیاضی سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ذہنی اور جذباتی طور سے اس کلام کو قبول کر رہا تھا جو مجھے ودیعت کیا جا رہا تھا۔

جسم تو سب کے ہی زخمی ہیں مگر بات یہ ہے
دیکھنا چاہیے جو کوئی تو دکھائے نہ بنے
فاصلہ گلشن و زنداں میں نہیں کوئی مگر
ایک دیوار ہے حائل جو گرائے نہ بنے
جو شجر ہم نے بیاباں میں لگا رکھے ہیں
ان کے نیچے کبھی اپنے لیے سائے نہ بنے

اس شکار سے واپسی کے بعد جب میں نے چھوٹے بھائی کو بتایا کہ میں جھولے پر بیٹھ کر تیندوے کے شکار کو بھلا کر غزل کہہ رہا تھا تو وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے۔

"خان ۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن تم جنگل میں اکیلے شیر کی تلاش میں گھوم رہے ہو اور غزل ہونے لگے ۔۔۔ اور شیر مشاعرے کی صدارت کا دعویدار بن کر آ جائے۔"

"میں اس کو رائفل کی نال سے شعر سنوا دوں گا۔"

بہر حال ۔۔

صبح روشنی سے پہلے ہی میں نے درخت کے تنے پر تیمم کر کے فجر کی نماز پڑھی۔ البتہ میرا آدھا نچلا جسم سن ہو چکا تھا ۔۔ بھوک لگی تھی اور چائے کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی تھی ۔۔

احسن تمام رات نہایت گہری نیند سوتا رہا، خدا جانے اس ظالم کو کس قدر نیند آتی تھی ۔۔ اور وہ بھی درخت کی کھردری شاخوں میں پھنس کر۔

نصف شب کے بعد سے بکری کو بھی یا تو صبر آ گیا تھا یا طاقت جواب دے گئی۔ کیونکہ فجر تک امن رہا۔ ادھر روشنی ہوئی ادھر اس نے ایک زبردست ممناہٹ کا نعرہ لگا کر تمام دنیا کو اپنے زندہ ہونے کا یقین دلایا ۔۔ اس کی حلق تو پھر کھل گئی تھی۔

میں نے احسن کو جگایا ۔۔ غالباً اس کا سارا جسم ہی سُن ہو گیا ہو گا۔

ذرا دیر کی کوشش کے بعد اس کے جسم میں طاقت اور حرکت آ گئی۔ اور لنگوچے کی گرہ کھول کر خود کو آزاد کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اُٹھا۔ ذرا دیر بعد اس نے ہتھیار رسی سے نیچے لٹکا دیے تو میں اپنے جھولے سے نکلا اور احتیاط کے ساتھ ہر طرف دیکھ کر نیچے اُتر آیا ۔۔ اترتے ہی میں نے اپنی رائفل اُٹھا کر ہاتھ میں لی پھر چند قدم چلا ۔۔ احسن بھی درخت سے اُتر آیا۔

ضروریات سے فراغت کے بعد، احسن نے بکری کو پانی پلایا، پھر اس کی رسی دراز کر دی ۔۔ مثل مشہور ہے کہ خبیث کی رسی دراز کر دی جاتی ہے۔ البتہ اس موقعے پر بکری کی خباثت تو کچھ نہیں تھی مظلومیت بیشک تھی، اور ایک کثیر تعداد میں خلق خدا کو عذاب سے نجات دلانے کے لیے ایک بکری کی قربانی بڑی نہیں تھی۔

وہ بھی ابھی قربانی کہاں ہوئی تھی ۔۔ نصف دن، اور تمام رات وہاں نہایت حفاظت کے ساتھ موجود رہی۔

ہم نے اطراف و جوانب میں نشانات بھی تلاش کیے ۔۔ لیکن تیندوا یقینی طور سے اس سمت سے نہیں گذرا ۔۔ یا اگر گذرا بھی تو اتنے فاصلے سے کہ ہم کو

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

نشانات نہ مل سکے۔

میں نے چلتے چلتے بکری سے کہا۔ خوب شور کرنا تاکہ تیندوا تمہاری طرف ضرور متوجہ ہو جائے ہم شام کو پھر ملیں گے۔

اور ہم گاؤں واپس ہوئے۔

گاؤں سے میں چاہتا تھا کہ کم از کم دو چار آدمی چلے جائیں تاکہ بکری کو کچھ چارہ پانی اور میسر آ سکے لیکن احسن نے گھاس تو خوب ڈال دی تھی، رسی ڈھیلی ہو جانے کی وجہ سے اس کو نقل و حرکت کی بھی نسبتاً زیادہ سہولت ہو گئی تھی۔ اس لیے یہ کام ملتوی رہا۔

دوسرے یہ کہ پہلے روز کے بارے میں شک ہوا شاید ہمیں درخت پر چڑھتے دیکھ کر تیندوا ہوشیار ہو گیا ہو۔ لہٰذا میں نے حکم صادر کیا کہ تین بجے میرے ساتھ چھ جوان جانے کو تیار رہیں۔ ہلکا سا ناشتہ کر کے میں آرام کرنے لیٹ گیا حتیٰ کہ ظہر کے وقت احسن نے جگایا، میں نے اُٹھ کر گاؤں کے کنوئیں پر خوب اچھی طرح غسل کیا، ظہر کی نماز پڑھی اور پھر لیٹ گیا، ذرا ہی دیر بعد آنکھ لگ گئی اور پھر عصر کے وقت احسن نے بیدار کیا۔

میں عصر کی نماز پڑھ کر پوری تیاری کے ساتھ نکلا تو گاؤں کے چھ جوان مسلح و مکمل میرے منتظر تھے میں نے ان کو خاموش رہنے اور ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ اور ہم گاؤں سے نکل کر کوئی سوا گھنٹے میں مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ گاؤں والوں کو اس خطے کے راستے معلوم تھے چنانچہ وہ ہم کو ایک مختصر راستے سے لے گئے۔

میں نے ان کو تاکید کی تھی کہ جب میں درخت پر بیٹھ جاؤں تو احسن سمیت وہ لوگ درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ذرا دیر باتیں کرتے رہیں۔ نہایت ہلکی آواز سے۔ پھر آہستگی سے چلتے ہوئے واپس جائیں۔ اس روز احسن کو میرے ساتھ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

احسن نے درخت پر چڑھ کر جھولے میں دو کمبل اس طرح رکھ دئیے کہ میں ان پر کسی قدر آرام سے بیٹھ سکوں۔ قریب کی ہی ایک شاخ پر میری بندوق اس

طرح لٹکا دی کہ حسب ضرورت میں اس کو تیزی سے اُٹھا سکوں۔ کارتوسوں کی بلٹ اور پانی کی بوتل بھی وہیں قریب لٹکا دی۔ اس کے بعد میں درخت پر چڑھ کر جھولے میں بیٹھ گیا تو احسن درخت سے اترا۔ یہ سب کارروائی اس لئے تھی کہ تیندوا اگر کہیں سے ہماری نقل و حرکت کا معائنہ کر رہا ہو تو احسن کو درخت سے اترتے دیکھ کر یقین کر لے کہ آدمی درخت سے اتر آیا۔ شیر اور تیندوے دونوں کی ہی یادداشت ایسی نہیں ہوتی کہ اترنے چڑھنے والوں کی تعداد یاد رکھ سکیں۔

احسن نے اتر کر دیہاتیوں سے ذرا دیر باتیں کیں۔ بکری کو ایک بار پھر خوب پانی پلایا، اس کے بعد وہ لوگ میری ہدایت کے مطابق آہستہ آہستہ آواز سے باتیں کرتے واپس گئے۔ ان کے نظروں سے روپوش ہوتے ہی بکری کو تنہائی کا احساس ہوا اور اس نے اپنی آزاد نظم یا نوحہ شروع کر دیا۔

البتہ اس شام بکری کی حلق زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکی۔ کچھ تو گذشتہ رات کی خستگی کچھ تمام دن کی تنہائی میں شور۔ اور اب پھر مسلسل میں میں، مغرب کا وقت ہوتے اس کے حلق نے جواب دے دیا۔ اور اب ذرا ذرا دیر کے بعد بصد کوشش محض گھٹی گھٹی غیں غیں ہی نکل رہی تھی۔

جنگل کے دو مناظر بحد دل کش ہوتے ہیں۔

غروب کے وقت کا منظر۔ اور

طلوع صبح کا بصیرت افروز اور مسحور کن وقت۔!

سنہری سنہری دھوپ میدانوں، وادیوں اور گھاٹیوں سے تو فرار کر جاتی ہے لیکن پہاڑوں کی سبز پوش چوٹیوں پر سبز درختوں کو سنہری سرخ دھوپ میں نہلا دیتی ہے۔ رینگتے اور پھیلتے ہوئے سائے نیچے گہرے ہوتے جاتے ہیں اور ان کی گہرائی سے بلندیاں بتدریج متاثر ہوتی جاتی ہیں۔ تا اینکہ آخر کار زمین اپنے محور پر اتنی گھوم جاتی ہے کہ سورج کی طرف سے قطعی آڑ ہو جائے۔ اور حسینۂ شب اپنے دراز گیسو بکھرا دے۔

http://updf.weebly.com

جو جنگل ابھی تک خاموش تھا، وہ یکبارگی بسیرا کرنے والے بیشمار پرندوں کی چہچہاہٹ سے گونج اُٹھتا ہے یہ پرندے بھی صبح و شام اس خالق عظیم کی حمد گاتے ہوں گے جس نے نظامِ کائنات کو اس خوبی سے مرتب کیا ہے کہ حرکات عالم میں سرِ مو فرق نہیں آتا۔

صبح ہوتے ہوتے یہ پرندے مجموعی طور سے اللہ جل شانہٗ کی حمد گاتے ہیں ۔۔ اس کے بعد تمام دن تلاش معاش میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر شام ہوتے ہوتے جب شب گذاری کے لیے کسی درخت کی شاخوں کو اپنا عارضی گھر تصور کر کے ٹھہرتے ہیں۔ تو اللہ جل شانہٗ کی تعریفیں اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں ۔۔ حتیٰ کہ اس حمد خوانی کے دوران اجالوں کو نیند آجاتی ہے ۔

شام کے وقت ایک اور دلچسپ منظر بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔۔

لندن میں قصر بکنگھم میں گارڈ کی تبدیلی کا منظر بہت متاثر کن ہوتا ہے۔ جو لوگ سیر و سیاحت کے لیے لندن جاتے ہیں وہ اس تبدیلی کو خصوصاً دیکھنے جاتے ہیں۔

جنگل میں بھی اسی سے ملتی جلتی تبدیلی رونما ہوتی ہے ۔۔!

دن بھر بیدار رہنے اور کھانے پینے میں مشغول رہنے والے چرندے، اور درندے سب اپنا کام ختم کر کے اپنی اپنی خوابگاہ کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ اور راتوں کو زندہ رکھنے والے شب بیدار چرندے، اور درندے اپنی اقامتگاہوں سے مؤدار ہوتے ہیں ۔۔ مگر قدرت کا نظام ایسا ہے کہ ان دونوں تمام کی مراجعت کے دوران ایک دوسرے سے تصادم یا مزاحمت کی صورت پیدا نہیں ہوتی ۔۔ رات کو آرام کرنے والے جانور اپنی اپنی جگہ پہنچ کر مقیم ہوتے ہیں تب، شب بیدار جانور نکلتے ہیں ۔

میں نے ابھی مغرب کی نماز نہیں پڑھی تھی کہ اس میدان سے نیل گایوں کا ایک منڈا بھاگتا ہوا گذرا ۔۔ اور اس طرح کہ میں سمجھا بکری کو انھوں نے کچل دیا، لیکن ان کے گذرنے کے بعد بکری کو صحیح و سلامت دیکھ کر اطمینان ہوا ۔۔ یہ نہیں معلوم کہ نیل گایوں کو اس طرح بھاگنے کی ضرورت کس لیے پیش آئی ۔۔ اکثر کسی درندے کو دیکھ کر ہی بھاگتے ہیں۔ ان کے جانیکے بعد میں نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید نزدیک ہی کوئی

درندہ ہو لیکن اب نہیں تھا ۔

مغرب کی نماز کے بعد میں نے رائفل ہاتھ میں ہی رکھی ۔

اندھیرا ہونے سے پہلے ہی چاندنی نکل آئی ۔۔ اور بکری چونکہ ایسے زاویے سے باندھی گئی تھی کہ درختوں کے سائے میں نہ رہے، اس لیے اس پر چاندنی صاف پڑ رہی تھی اور میں اس کی حرکات تو دیکھ ہی رہا تھا اگر تیندوا بھی آس پاس آتا تو میں دیکھ لیتا ۔

تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ دس بارہ گیدڑوں کا غول بیابانی ادھر سے گذرا۔ گیدڑ عام طور سے نہایت بزدل جانور ہے۔ اور کسی زندہ شے سے تعرض نہیں کرتا۔ اکثر چوہے اور گلہری سے بھی کترا کر گذر جاتا ہے ۔۔ بہت بھوکا ہو تو شاید ہمت کرلے۔ زندہ بکری پر تو کبھی حملہ کرتے نہیں سنا ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گیدڑ مردار خور جانور ہے ۔۔ مرا سڑا ہوا جانور۔ ہڈیاں، کھال، سینگ سب کچھ چٹ کر جاتا ہے۔

اب اس کو صرف اتفاق ہی کہا جائے گا۔ کہ ایک گیدڑ کو نجانے کس وجہ سے شوخی سوجھی ۔۔ جاتے جاتے پلٹ کر بکری کی طرف دوڑا ۔۔ بکری بارک کر بھاگی اور رسی سے الجھ کر گر پڑی ۔۔ گیدڑ اس سے چند قدم پر ٹھہر گیا ۔۔ بکری اٹھی تو گیدڑ بھاگ کر دس قدم پر جا ٹھہرا ۔۔ ذرا دیر بکری کی طرف دیکھا اور پھر غاؤں کر کے اس پر دوڑا ۔۔ بکری پھر بدک کر بھاگنے کو ہوئی اور گری ۔۔ اس کے اُٹھتے اٹھتے گیدڑ فرار ہو گیا ۔۔ کوئی پانچ سات منٹ کے وقفے سے پھر یہی عمل دہرایا ۔

اب گویا یہ اس کا کھیل بن گیا ۔۔ دوسرے گیدڑ بھی چند قدم آگے جا کر رک گئے۔ اور فراغت کے ساتھ یہ کھیل دیکھنے لگے ۔ دو چار آرام سے بیٹھ بھی گئے ۔۔ یہ غول بکری سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا تھا ۔۔ اور کتوں کی سی آوازیں سب ہی وقتاً فوقتاً نکال رہے تھے۔ اس لیے جنگل میں جو سکوت اور یکسانیت کی کیفیت تھی وہ درہم و برہم ہو گئی تھی ۔۔

وہ پاجی گیدڑ جس نے یہ کھیل جما رکھا تھا۔ نہایت دلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بکری کی طرف بھاگتا۔ بکری فرار کرتی، رسی سے الجھ کر گرتی یا گھسٹ کر رہ جاتی، اور گیدڑ پھر بھاگ کر دور چلا جاتا۔ بیچاری بکری تو بکری۔ ذرا دیر میں ہی ہانپ گئی۔ زبان نکل آئی۔ اور سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ غریب بار بار پیشاب کرنے کی ریہرسل کرتی اور ناکام رہ جاتی۔ وہ گیدڑ ایسا نامعقول ثابت ہوا کہ بکری کی جان کو ہی آ گیا۔

بکری اپنی جان سے عاجز آ گئی تھی۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق، ایک بار گیدڑ اس کی طرف دوڑا تو بکری بھی بھاگنے کی کوشش کے بجائے سر جھکا کر سینگ نیچے کر کے گیدڑ کی طرف حملے کی شکل میں دو تین قدم بڑھی۔ گیدڑ کے تو جیسے ہوش اڑ گئے۔ ایک بار چیں کر کے اور دم ٹانگوں میں دبا کر جو بھاگا ہے تو اپنے غول تک بھاگا چلا گیا وہاں ٹھہر شکایت بھری نظروں سے بکری کی طرف دیکھا۔ بکری نے بھی اس کی حقیقت جان لی تھی۔ گیدڑ ٹھہرا تو بکری نے پھر سر جھکا کر دونوں اگلے پاؤں زمین پہ مارے۔ اور گیدڑ پھر بھاگ پڑا۔ ساتھ ہی اس کے غول نے بھی راہ فرار اختیار کی مجھے اس وقت بکری پر بڑا ترس آیا۔

گیدڑوں کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی بکری بھد سے زمین پہ گر گئی۔ اور بیٹھ کر بُری طرح ہانپنے لگی۔ میں دیکھ نہیں سکا ورنہ مجھے یقین ہے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے ہوں گے۔

میں نے عہد کیا آئندہ بکری کو گارے کے طور پر نہیں باندھوں گا۔ اور پھر میں نے بکری کبھی نہیں باندھی۔ گدھا، پرانی کھنڈی بیکار گائے۔ قریب المرگ ناکارہ بیل۔ کتا۔ جو ملا اسی کو استعمال کیا۔ لیکن بکری نہیں باندھی۔

اس سے قبل میں جہلم میں چیتے کے گارے کے لیے بکری باندھ کر بیٹھ چکا تھا اور اس بکری کے ساتھ کوئی افسوسناک واقعہ پیش نہیں آیا۔

بکری کی یہ حالت دیکھ کر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر تیندوا آیا بھی تو میں پوری کوشش کروں گا کہ اس کے بکری پہ حملے سے پہلے ہی اُس کا کام تمام کر دوں تاکہ بکری بچ جائے۔ میں نے زیادہ مستعدی سے درختوں کے نیچے سایوں کو نظر میں رکھا، رائفل

اس زاویے سے شانوں پر رکھی کہ ہاتھ کی معمولی جنبش سے شانے پر آ کر فائر کے لیے آمادہ ہو۔

لیکن وہ رات بھی یونہی گذر گئی۔

صبح ہی احسن اور چار دیہاتی آ پہنچے میں اس وقت سو رہا تھا۔ ان کی باتوں کی آواز سے آنکھ کھلی، بکری بخیریت تھی۔ میں درخت سے اترا اور احسن سے کہا بکری کو کھول کر واپس لے چلیے۔ اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ابھی دو ہی راتیں گذری تھیں اور اسے معلوم تھا کہ میں اتنی جلدی گھبرانے والا آدمی نہیں ہوں۔ بہر حال اس نے حکم کی تعمیل کی۔

میں نے واپسی کے دوران اس کو اپنے رات کے تجربے کی تفصیل بتائی۔ بکری گاؤں واپس لا کر اس کے مالک کے سپرد کر دی گئی۔ بکری کا مالک اس کو واپس لینے سے انکار کرنے لگا۔ بلکہ اس نے مجروا سے کہا۔ فروخت کی ہوئی بکری واپس نہیں ہو سکتی۔ میں نے احسن سے کہا کہ اس بدمعاش کو میرے سامنے پیش کرے۔ اس نے سامنے آتے ہی ہاتھ جوڑ دئیے۔ اور بولا۔

"سرکار۔ میں نے بنیئے سے ادھار لیا تھا۔ حضور نے جو سو روپیہ دیا اس میں سے پچاس بنیے کو دیدئے اب میں پیسے کس طرح واپس کر دوں۔

میں نے اس کی مجبوری سمجھ لی۔

"اچھا۔ تم نے سچ بتا دیا۔ اس لیے تم پیسے بھی رکھو۔ اور بکری بھی لیجاؤ"

میری اس فیاضی کا ان دیہاتیوں پہ بہت اچھا اثر ہوا۔ اور انھوں نے گارے کے لیے ایک بیکار، نہایت لاغر بلکہ مریض گدھا مہیا کر دیا۔ اور مفت۔ تاہم میں نے اس کے مالک کو بیس روپیہ احسن سے دلوا دئے۔ اب اس گدھے کو پہاڑی تک لیجانے کی دشواری پیش آئی۔ مجروا بولا۔

"حجور۔ ایہہ اپنے پاؤں چل کر تو ناہی جانے کا"

بہر حال اس کو کچھ چلا کر کچھ گھسیٹ کر لے جایا گیا اور جہاں بکری بندھی

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بھی وہیں باندھ دیا گیا ـــ یہ کام احسن کی سربراہی میں انجام دیا گیا کیونکہ میں تو نہا دھو کر آرام سے سو گیا ـــ صرف ظہر کی نماز اور کھانے کے لیے اُٹھا ـ اور پھر عصر کے وقت تک سوتا رہا ـ

دراصل بکری کو گارے کے طور پر باندھنے میں مصلحت یہ ہوتی ہے کہ وہ خوب شور مچاتی ہے ـ اور اگر درندہ اس خطے سے نہ بھی گذرے تو آواز سن کر دور سے ہی متوجہ ہو جاتا ہے ـ یہ بات صرف چیتے یا تیندوے کے ضمن میں ہی درست ہے ـ شیر کے لیے بکری باندھنا ممکن ضرور ہے لیکن بالعموم شیر بکری کو مارنے میں بڑا تامل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ شیر کے شکار میں ہمیشہ بڑا جانور باندھا جاتا ہے ـــ کسی نے آج تک یہ نہیں سُنا یا پڑھا ہوگا کہ شیر کے شکار کے لیے کوئی شکاری بکری باندھ کر مچان پر بیٹھا ـ

البتہ چیتے کے شکار میں یہ بات عام طور سے سنی جاتی ہے ـ

عصر کی نماز پڑھ کر میں درخت پر بسیرا کرنے چل کھڑا ہوا ـ

وہ رات بھی فضول گذری ـ

اس کے بعد بھی نو راتیں اسی طرح بیکار گذر گئیں اور تیندوا اس علاقے کے آس پاس سے بھی نہیں گذرا ـــ بلکہ میری دسویں روز کی تحقیق و تفتیش نے ثابت کیا اس تمام عرصے میں تیندوا گھاٹی سے باہر نہیں آیا جبکہ میرے قیاس کے مطابق پہلے وہ گھاٹی عبور کر کے اس پہاڑی water drop یا نالے کے راستے پہاڑ پر چڑھنا اور وادی کے خطے میں گھومتا تھا ـــ اس کا مطلب یہی تھا ـــ وہ مکار سمجھتا تھا ـ بکری یا گدھا باندھا جانا خطرے کی علامت ہے اسی لیے اس نے اس علاقے کا رُخ نہیں کیا ـ

دسویں روز میں نے گاؤں میں رہ کر آرام کیا ـ کسی انسان سے مسلسل راتوں کو جاگتے رہنا وہ بھی نہایت بے آرامی کی حالت میں، ممکن نہیں ـــ برداشت اور توانائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے ـ

اور جب آرام کا سلسلہ چلا تو پھر تین دن کے بعد میں نارمل ہو سکا ـ چوتھے روز میں نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ـــ اب میں اس جنگل، پہاڑوں، نالوں، ندیوں

اور وادیوں سے واقف ہو چکا تھا ـــ آمد و رفت کے کچھ راستے مجھے یاد ہو گئے تھے ـ لہٰذا میں نے تنہا جنگل پیمائی کا منصوبہ بنایا ـــ اور احسن سے کہہ دیا کہ اگر میں اس شام واپس نہ آؤں تو فکر کی ضرورت نہیں ـــ میرے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ اپنی بندوق ساتھ نہ رکھتا ـــ لیکن اس روز میں نے صرف تین سو چھپتر میگنم ہی ساتھ رکھی ـ کمر میں چھرا لگا، اور پشت پر شکاری تھیلا باندھ لیا ـــ پانی کی بوتل کی ضرورت نہیں تھی ـ جنگلی چشمے نہایت صاف اور پاکیزہ ہوتے ہیں ـ

چلنے سے پہلے میں نے جیب میں تھوڑے سے بادام اور چند ٹکڑے مصری کے ڈال لیے ـ تنہائی میں اگر منھ میں کوئی لذیذ چیز رہے تو طبیعت خاصی شگفتہ رہتی ہے ـــ بادام اور مصری بہت اچھی، صحت مند چیزیں ہیں ـــ پانی کی عدم موجودگی میں بادام مفید بھی ہیں اور اچھے بھی ـــ

میں گاؤں سے باہر دھینا کے گھر سے نکلا، اور آبادی سے کوئی سو گز کے فاصلے سے رہ کر سارے گاؤں کا ایک چکر لگایا ـــ میرا چکر دھنیا کے مکان کے مقابل ختم ہوا ـــ اس چکر میں کوئی نئی بات دریافت نہیں ہوئی ـــ اور میں نے آبادی سے دو سو گز دور رہ کر ایک اور چکر لگایا ـــ اس چکر کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ـ میں نے فاصلہ بڑھا کر ایک اور چکر لگایا ـــ اور اس بار مشرقی جنگل کی جانب ـــ ایک جھاڑی کے نزدیک چیتے کے تازے ماگھ ـ اور بیٹھے رہنے کے نشانات ـــ گویا تیندوا گذشتہ رات کو ہی گاؤں کے قریب موجود رہا ـــ

اب وہ نئے شکار کی تلاش میں تھا ـ

یہاں سے میں نے چیتے کی واپسی کے نشانات تلاش کر لیے اور سیدھا اس کے تعاقب میں چل پڑا ـ

صحیح معنوں میں اسے تعاقب تو نہیں کہا جا سکے گا ـ کیونکہ میں صرف ان نشانات کا رخ معلوم کرنا چاہتا تھا ـ میں اس تیندوے کا جلوہ دیکھنے میں اب تک ناکام رہا تھا ـــ اب میں اس کے رہنے کی جگہ معلوم کرنا چاہتا تھا ـــ آخر وہ سارا وقت

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

بھلا ہی تو نہیں رہ سکتا تھا۔ کہیں تو رہتا ہوگا ۔۔۔ ہر ایک شیر یا چیتے، یا ریچھ، یا اسی قسم کے درندوں کا کوئی نہ کوئی گھر ضرور ہوتا ہے۔

اور یہ حیرت انگیز بات تھی کہ نشانات کا رُخ ایک بار پھر اس پہاڑی کی طرف مڑ گیا جدھر مریل گدھا اب بھی بندھا ہوا تھا ۔۔۔ میں نے ماگھ کی فکر فراموش کر دی۔ بہ ظاہر بات تھی کہ تیندوا سیدھا اسی طرف گیا تھا جدھر وہ جایا کرتا تھا ۔۔۔ البتہ اس نے نہ تو اس خطے میں قدم رکھا جہاں گدھا بندھا تھا نہ اس درخت کے نزدیک آیا۔ جہاں میرے بیٹھنے کے لیے اب بھی جھولا بنا ہوا تھا ۔۔۔

اس کے باوجود ۔۔۔ وہ موذی اسی واحد نالی کے راستے اوپر آیا تھا۔

اور جب میں وہاں پہنچا تو یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ وہ اسی نالی کے راستے واپس بھی نیچے اتر گیا۔ نشانات کے ذریعے یہ سب جاننا اور طے کرنا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں۔ لیکن جس نے یہ فن سیکھ لیا ہو اس کے لیے آسان ہے۔

ذرا دیر کے تذبذب کے بغیر میں بھی نالی کے راستے گھاٹی میں اُتر آیا۔ اور یہاں مجھے قدرت کی استعانت کی سخت ضرورت تھی ۔۔۔ اس لیے کہ دس بارہ گز کی وہ جگہ جہاں نالی سے گذرنے والا پانی اپنے ساتھ پتھر اور ریت بہا کر لاتا اور گراتا ہے وہاں سے نشیبی خطے کی نرم ریت پر چیتے کی آمد و رفت کے بیشمار نشانات تھے۔ ان نشانات میں ریچھوں کے نقوش پا بھی تھے، گیدڑوں کے بھی ۔۔۔ سیہی کے بھی اور دو ایک سانپوں کے گذرنے کے نشان بھی ۔۔۔ نشانات کی اس غلط ملط صورت حال میں تیندوے کے پیر کے نشان پانا اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ واقعی تازے بھی ہوں۔ بڑا ہی مشکل کام تھا ۔۔۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مستقل زمین کی طرف ہی دیکھتا رہتا۔ اپنی حفاظت بھی ضروری تھی ۔۔۔ دو لمحے زمین کی طرف دیکھتا تو دو لمحہ چاروں طرف نظر کرتا ۔۔۔ وہ مقام بھی کچھ صاف قسم کا نہیں تھا ۔۔۔ پانی کے گراؤ کی جگہ کے بعد ہی پتھریلی زمین اور اس سے دو چار گز کے بعد ہی جھاڑیاں اور کچھ درخت بھی ۔۔۔ اور اور آگے تو جنگل جھاڑی گھنے ہوتے گئے تھے۔

بہر حال میں نے نصف گھنٹے کی کوشش اور مسلسل زاویے بدلتے رہنے کے بعد آخر نشانات ڈھونڈھ ہی لیے ۔۔۔ اور اسی رُخ پر چل بھی پڑا ۔۔۔ اندازہ یہ ہوا کہ جدھر میں جا رہا تھا ادھر سطح نیچی ہوتی جا رہی تھی۔

گویا گھاٹی کا وہ حصّہ جدھر چیتا جاتا تھا نشیبی تھا۔

میں گھاٹی کے تقریباً وسط میں چل رہا تھا۔ دونوں طرف جھاڑیاں بھی تھیں اور درخت بھی ۔۔۔ اور خاصے گھنے ۔۔۔ میں جس خط پر چل رہا تھا ۔۔۔ وہ پانی کے بہاؤ کا راستہ تھا ۔۔۔ میں سمجھتا ہوں بارش کے دوران اس میں خاصا پانی جمع ہو جاتا ہوگا اور ندی نجاتی ہوگی ۔۔۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں جھاڑیاں اور درختوں کی کثرت بھی تھی اور گنجانی بھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ چیتا ہمت کر کے مجھ پر کسی مقام سے بھی حملہ کرے تو مجھے فائر کے لیے تین چار گز سے زیادہ فاصلہ نہ ملتا ۔۔۔ اور یہ فاصلہ چیتا اس قدر سرعت سے طے کرتا کہ میں رائفل اُٹھا کر شانے تک لا بھی نہیں سکتا تھا ۔۔۔ اس وقت مجھے شاٹ گن کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی ۔۔۔ رائفل کو دونوں ہاتھوں میں قطعاً آمادگی کے انداز سے سنبھالے ہوئے ۔۔۔ سیفٹی کیچ کھلا ہوا ۔۔۔ اور میں بالکل مستعد ۔۔۔ بلکہ صحیح تو یہ ہوگا کہ بہت زیادہ مستعد ۔۔۔ جسے انگریزی کے لفظ TENSE سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔

میں کسی جانب سے غافل نہیں تھا۔ لیکن میری پیش قدمی اور حفاظت کا دارومدار بڑی حد تک ان پرندوں اور سرخ منہ کے بندروں کے ایک مختصر گروہ پہ تھا جو گھاٹی کے درختوں پہ اطمینان اور آرام کی حالت میں متمکن تھے ۔۔۔ ان کی نگران یا نگہبان بھی کسی مناسب جگہ بیٹھی ہوگی ۔۔۔ اور یہ بات کسی شک کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ اس کی شاطر نظر سے اس علاقے کی کوئی حرکت چھپی نہیں رہ سکتی۔

شیر اور چیتے سے بندروں کی روح فنا ہوتی ہے ۔۔۔ چیتا ان کا زیادہ دشمن ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ تو نہ بندروں کو درختوں پر اس سے امان ہے نہ زمین پہ۔ اگر چیتے نے بندر پکڑنے کا ارادہ کر لیا تو خواہ وہ سرخ منھ کا ہو ۔۔۔ یا کالے منہ کا بڑا بندر۔

http://updf.weebly.com

ایک بندر کا مارا جانا یقینی ہے ـــ ایک دفعہ مشہور انگریزی رسالے LIFE نے چیتے کے بندر پکڑنے کی تصاویر شائع کی تھیں ـــ اور جس نے بھی وہ تصویریں اتاری تھیں اس نے کمال کر دیا تھا ـــ چیتے کے درخت پر چڑھنے ۔ بندر کے بھاگنے ۔ تعاقب پھر بندر کا ایک شاخ پر سے گھبرا کر زمین پر کودنا ـــ بھاگنا ـــ چیتے کا کودنا ـــ اس کے پیچھے بھاگنا ۔ فاصلہ کم ہوتے جانا اور پھر آخری تصویر میں چیتے کا بندر کو پکڑ لینا ـــ کئی تصاویر میں گویا پوری کہانی قید کر دی تھی ـــ اور بے حد صاف اور واضح ۔

شیر درخت پر نہیں چڑھتا ـــ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عام طور سے بڑے سے بڑے درخت میں اتنی بڑی اور مضبوط شاخیں کم ہوتی ہیں جو شیر جیسی جسامت کے وزنی درندے کا وزن برداشت کر سکیں ـــ اور اسی تن و توش کے پیش نظر شیر کو درخت پر چڑھنے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ۔

دراصل ہر جانور کی عادات کے تقرر کے وقت اس کی غذائی بہم رسانی کے لوازمات اور اسباب کو قدرت پیش نظر رکھتی ہے ـــ درختوں پہ کوئی ایسا جانور نہیں رہتا جو شیر کی غذا بننے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔ بندر بھی اس قدر نرم و نازک اور مختصر شے ہے ۔ غالباً ـــ کہ شیر اگر اس کو مار کر کھا بھی لے تب بھی اس کی داڑھ بھی گرم نہیں ہوتی ہوگی ۔ پھر اس مختصر نوالے کے لیے شیر زحمت کیوں برداشت کرے ـــ جتنی کوشش اور محنت ایک بندر کے لیے کرے اتنی ہی دیر میں کیوں نہ ایک نیل گائے مار لے جو کم از کم دو دفعہ کی مکمل خوراک بہم پہنچاتا ہے ۔

میں نالی سے کوئی بیس پچیس گز چلا تھا ۔

دائیں جانب تقریباً پندرہ بیس گز کے فاصلے سے کئی ریچھوں کے بولنے ـــ بلکہ مستی کی حالت میں بڑبڑ کرنے کی آوازیں آنے لگیں ـــ اور ایسا اندازہ ہوا جیسے وہ آوازیں نزدیک آ رہی ہوں ـــ ریچھ یقینی طور پر کم از کم چار ضرور ہوں گے ۔ آوازوں سے میں نے یہی قیاس کیا ـــ اور میں نے ادھر ادھر دیکھا ـــ ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں میں دفاعی مورچہ بنا سکتا ـــ اور ابھی میں نگراں ہی تھا کہ ریچھ سامنے ہی آ گئے ـــ میری

پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ـــ بس ایک گھنی جھاڑی ہی ان کے اور میرے درمیان حائل تھی ۔ اور وہ وقت صرف دو لمحوں کا ہی رہ گیا تھا کہ وہ جھاڑی سے نکلتے ہی مجھے دیکھیں ـــ اور وہ بھی اتنے قریب کہ شاید دو گز بھی زیادہ ہو گا ۔

میں فائر کر کے ایک ہی کو مار سکتا تھا ـــ اس عرصے میں کہ میں بولٹ چلا کر دوسرا کارتوس چیمبر میں لا کر فائر کی پوزیشن میں آتا ـــ دوسرے ریچھ میری بوٹیاں نوچ ڈالتے ۔

میں نے نزدیکی درخت سے پشت لگا لی اور ساکت ہو گیا ۔

ریچھ ادھر نہیں آئے ـــ جھاڑی کے پاس سے ہی پلٹ کر اوپر کی جانب ادھر چلے گئے جدھر سے میں آیا تھا ـــ اور میں نے تقریباً تیس چالیس گز ان کے جانیکے بعد ایک ایک ریچھ کو دیکھا بھی ـــ یا اس کا عقبی حصہ دیکھا ـــ بہت بڑا ریچھ تھا ـــ نجانے کس وجہ سے انہوں نے اچانک اپنا رخ بدل دیا ـــ اللہ تعالیٰ کو مجھے بچانا ہی منظور تھا ۔

ریچھوں نظروں سے اوجھل ہونیکے بعد بھی دیر تک میں ویسے ہی کھڑا رہا ـــ نجانے اس وقت میرے خیالات کیا تھے اب مجھے یاد نہیں ـــ اور دیر بعد میں نے ان بندروں کی طرف دیکھا جن کی حرکات پر نظر رکھ کر میں اپنے کو چیتے سے محفوظ رکھنے کے گمان میں تھا ـــ بندر اب بھی اطمینان سے بیٹھے تھے ۔

اس کا مطلب یہ کہ ان کو ریچھوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا ۔

واقعہ بھی یہی ہے ـــ باوجودیکہ ریچھ چرندہ بھی ہے اور درندہ بھی لیکن کسی جانور کو خاص طور سے مار کر کھانے کا واقعہ پیش نہیں آیا ـــ ویسے سانپ، نیولے جب ہے ۔ گلہری، خرگوش وغیرہ قسم کے جانور ریچھ کے ہتھے چڑھ جائیں تو تکلف نہیں کرتا ۔ کسی نے کہا ہے کہ عشق اور جنگ میں سب جائز ہے ۔ عشق تو اب بھی ممکن ہے ۔ البتہ اب شخصی جنگوں کا امکان نہیں ۔ لہٰذا یہ بات کچھ یوں ہونا چاہیے کہ عشق اور بھوک میں سب کچھ جائز ہے ـــ چنانچہ جب ریچھ شدید بھوکا ہو تو سب کچھ چٹ کر جاتا ہے ۔ خواہ گوشت ہو خواہ پھل، شہد اور سبزی ۔

ذرا دیر بعد میرے حواس درست ہوئے ۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں نے حرکت کی تو پھر اسی رُخ پر جدھر میں جا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں کی کوشش سے وہ نشانات مل گئے جو مجھے یہاں تک لائے تھے۔ میں بندروں کے حصار سے جلد ہی نکل گیا۔۔۔ اب مجھے چیتے کی آمد کی اطلاعات فراہم کرنے کے لیے صرف ان ننھے بندروں پر اعتماد کرنا پڑا جو جا بجا شاخوں پر موجود تھے۔۔۔ اور چیتے کی موجودگی یا نقل و حرکت کے ساتھ ہی شور مچا سکتے تھے۔

گھاٹی کی زمین اب اس مقام سے کافی نیچی ہو گئی تھی۔ جہاں سے میں نے حرکت شروع کی تھی لیکن جنگل کے گھنے ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ مشکل تھا کہ کس قدر نشیب ہے ساتھ ہی گھاٹی تنگ بھی ہو گئی تھی۔ دونوں جانب کی تقریباً عمودی پہاڑی دیواریں پہلے کی نسبت قریب ہو گئی تھیں، لیکن اب بھی بیس پچیس گز چوڑائی تو ہو گی ہی۔ درخت اب نسبتاً کم بلند تھے، زمین پر ریت کے بجائے پتھروں کی مقدار بڑھ گئی تھی اور پتھر بھی بڑے تھے، شاید پانی کے بہاؤ کے ساتھ لڑھکتے ادھر آ گئے اور جگہ کی تنگی کے باعث ٹھہرتے گئے۔ چند قدم اور چلنے کے بعد تقریباً کھلی جگہ آ گئی، یہاں پتھروں کے ڈھیر اور زیادہ تھے۔

میں ایک دفعہ پھر رک گیا۔۔۔

چھوٹے بڑے پتھر، چٹانیں اور ٹوٹے درختوں کے تنے، سب نے مل کر وہاں عجیب سا بند بنا دیا تھا۔ اس مقام پر گھاٹی کی دونوں عمودی دیواریں کوئی پندرہ گز پر رہ گئی تھیں۔۔۔ دیوار تو میں نے ان کو اس لیے کہا کہ دونوں جانب تھیں اور عمودی درہ سا بن گیا تھا۔۔۔ اس قسم کے درے کو ایران میں گردنہ کہتے ہیں۔ اور شاہ پسند کے علاقے میں شکار کے دوران میں اس قسم کے کئی گردنوں سے گزرا ہوں لیکن وہاں خطرہ تو کوئی نہیں ہوتا۔

دراصل گھاٹی کے دونوں جانب پہاڑیاں تھیں، نجانے زمین کی کس حرکت یا قدرت کی کس تدبیر نے اس درے کو دو پہاڑیوں کے عین وسط سے اس طرح گذارا۔۔۔

میں نے دونوں جانب پہاڑیوں پر نظر کی۔۔۔ ادھر سے تو چھپکلی کو بھی چڑھنے اترنے میں دشواری ہوتی چہ جائیکہ تیندوا۔۔۔

نشانات تو یہاں تھے نہیں اس لیے کہ اب صرف بڑے پتھروں کے ڈھیر تھے۔ لیکن جہاں تک زمین نرم رہی وہاں تک نشانات ملے اور ان کے رُخ ادھر ہی تھے۔۔۔ یہ جگہ ویسے بھی تیندوے کے لیے نہایت موزوں مقام تھا۔۔۔ البتہ یہاں اس کا مستقل رہ پڑنا ممکن نہ تھا۔۔۔ میں یہ ضرور کہہ سکتا تھا کہ اس کی جائے رہائش اس مقام سے بہت دور نہ رہی ہو گی۔

ذرا سے توقف کے بعد میں نے قدم بڑھا کر ایک ٹول پر رکھا۔۔۔ اور چڑھ گیا۔۔۔ ایک سے دوسرے پتھر پر پیر جما کر رکھتا میں بڑھتا گیا۔۔۔ درہ اور تنگ ہو گیا تھا۔۔۔ پتھروں کا سائز بھی بڑا ہوتا گیا۔ دس بارہ گز پیش قدمی کے بعد تو ان پتھروں کی جسامت دیو پیکر چٹانوں کی سی ہو گئی جو بے ترتیبی سے لڑھک کر رک گئی تھیں اور اس طرح ایک دوسرے سے ٹکی ہوئی تھیں کہ ان پر چڑھنا اور گذرنا بھی آسان نہیں تھا۔

میں نے اچانک گھوم کر پیچھے دیکھا۔۔۔

ایک خرگوش دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا۔۔۔ بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔۔۔ میں جو گھوما تو اس نے ایک چھلانگ لگائی اور آناً فاناً غائب ہو گیا۔

میں ایک اور چٹان پر چڑھ گیا۔۔۔ اور پھر اسی طرح آگے بڑھتا گیا تا آنکہ وہ جگہ آ گئی جہاں گھاٹی ختم ہو کر ایک نشیبی وادی میں کھل گئی تھی۔۔۔ اس مقام پر گئی دیوہیکل چٹانوں کے باہمی اتصال کے بعد زمین کٹ جانے کی وجہ سے تقریباً پندرہ بیس فٹ گہرا گڑھا ہے۔ یہاں سے جب پانی گرتا ہو گا تو اچھا خاصا آبشار بن جاتا ہو گا۔ اس طرف اترنے کا راستہ تھا ہی نہیں اور میں اتنی بلندی سے رائفل ہاتھ میں لے کر پتھروں پہ کودنا بھی خودکشی کی کوشش سے کم نہیں سمجھتا۔ علیٰ ھذا القیاس تیندوا بھی ادھر کودنے کی زحمت ہرگز نہ کرتا ہو گا۔۔۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بائیں جانب کے کنارے سے گھوم کر پہاڑی کے دامن پہ جانے کا ایک نہایت دشوار راستہ سا معلوم ہوا۔ میں نے ادھر ہی ہٹ کر اچھی طرح پیچھے اور دائیں بائیں دیکھ لیا کہ ایسی حالت میں جبکہ میں اس پل صراط نما راستے سے ہو کر نیچے جانے کی حالت میں ہوں، تیندوا حملہ نہ کرے۔ اطمینان کر لینے کے بعد میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ لگا دیا۔ تاکہ اگر میں پھسل کر گروں تو دھکے سے رائفل فائر نہ ہو جائے۔

راستے پر قدم رکھا تو اندازہ ہوا کہ میں دونوں ہاتھوں سے پہاڑی پتھروں کو پکڑے بغیر سیدھا کھڑا ہو کر وہاں سے نہیں گذر سکتا۔ لہٰذا رائفل کو کراس اسٹریپ کی شکل میں پشت پر لٹکایا اور دونوں ہاتھوں سے پتھروں کو پکڑتا ــــ بمشکل چند اِنچ چوڑے پتھروں پہ پیر جماتا آخر نیچے اُتر ہی آیا۔

نیچے کھلی جگہ تھی۔ درخت بڑے لیکن فاصلے پر تھے۔ جھاڑیاں کم تھیں، اور بڑی بڑی غول بیکر چٹانیں دور دور پہ بے ترتیب پڑی تھیں۔ ان میں سے کسی کے پیچھے بھی چیتا یا شیر ہو سکتا تھا۔ جنگل بالکل پرسکون ــــ ساکت، اور انسان کی دست برد سے قطعی محفوظ ــــ دور دراز علاقہ جہاں جنگلی جانوروں کو ستانے کوئی نہیں آسکتا تھا۔ وہاں کی ہوا میں ایک ناگوار سڑاند سی تھی۔

درندوں کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے ــــ ماحول پہ ایک دہشت سی طاری تھی ــــ

میں نے اترتے ہی چاروں طرف ماحول کا جائزہ لیا۔ جس شئے نے سب سے پہلے میری توجہ مبذول کی وہ کسی جانور کی ہڈیاں تھیں۔ نزدیک جا کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ چیتل کی ہیں ــ ہڈیاں بکھر گئی تھیں اور خاصی پرانی تھیں اور صرف ایسی بڑی ہڈیاں ہی باقی رہ گئی تھیں جنہیں لگڑ بگڑ جیسے طاقتور جبڑے کے جانور بھی نہ توڑ سکیں۔ لگڑ بگڑ سائز میں تو کتے سے ذرا بڑا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے جبڑے کی طاقت بے پناہ ہوتی ہے اگر کسی شئے کو مضبوطی سے پکڑ لے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کا منہ نہیں کھول سکتی۔

لگڑ بگڑ

اس صفحے پر ایک عام لگڑ بگڑ کی تصویر ہے ــــ یہ بالعموم رات کے وقت ہی نکلتا ہے ــــ دن میں کسی غار یا کھوہ میں چھپا رہتا ہے۔

جسمانی اعتبار سے بے ڈول ــــ اور کریہہ المنظر جانور ہے ــــ انسان سے قدرتی طور پہ بہت زیادہ ڈرتا ہے۔

میں ابھی ان ہڈیوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ کہیں دور سے مور کے بولنے کی آواز آئی ــــ میں نے بغور اس کی آواز کو سنا ــــ اس میں خطرے والی بات کوئی نہیں تھی ــــ محض تفریحاً آواز کی گئی تھی ــــ اطمینان اور خطرے کی آوازوں میں ممیز فرق ہوتا ہے۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک بہت گھنے اور بڑے درخت کے نیچے مزید ہڈیاں پڑی ملیں، یہ بھی کسی جانور کی ہی تھیں ــــ اور بہت دنوں کی تھیں۔

اس سے قریب ہی تیسرے جانور کی ہڈیاں ملیں ــــ یہ نر سانبھر کی ہڈیاں تھیں، اس کا خشک شدہ سر اور اس سر کی زینت نہایت عمدہ سینگ بھی پڑے تھے، میں نے سوچا اگر موقعہ ملا اور تیندوے سے بخیر و خوبی معاملہ نمٹ گیا تو انشاءاللہ یہ سینگ ساتھ لیتا جاؤں گا کسی کو نذر کرنے کے لیے نہایت عمدہ شئے ہوتی ہے۔

یہ کہنا تو ممکن نہیں تھا کہ یہ ہڈیاں تیندوے کے مارے ہوئے جانوروں کی تھیں یا اس علاقے میں کوئی شیر بھی تھا ــــ سانبھر کی ہڈیاں دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اچھا بڑا جانور تھا ــــ اتنے بڑے جانور عام طور سے شیر کا ہی شکار ہوتے ہیں ــــ چیتے اتنے بڑے جانوروں پر حملہ نہیں کرتے۔ لیکن جس چیتے کا اس وقت مجھے مقابلہ درپیش تھا وہ چھوٹا چیتا نہیں تھا ــــ بہت بڑا چیتا تھا جیسا کہ آئندہ صفحہ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کی تصویر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی پیمائش آٹھ فٹ سات انچ تھی۔ قد کی بلندی — شانے کی ناپ کی رو سے — تین فٹ ساڑھے چار انچ وزن کا صرف تخمینہ کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ میرے پاس تولنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ غالب کم و بیش ڈیڑھ دو سو کیلوگرام وزن رہا ہوگا۔ اس کی لاش دو آدمیوں کو اٹھانے میں خاصی دقت ہوتی تھی۔

غرضیکہ یہ کام چیتے ہی کا تھا۔

وہیں کچھ دور چل کر اور ہڈیاں ملیں۔ جو نسبتاً کم عمر کے جانور کی تھیں، ایک اور جگہ ایسی ہڈیاں ملیں جو دو ایک روز قبل کھائے ہوئے جانور کی ہی تھیں۔

اب یہ امر طے کرنا دشوار نہیں تھا کہ چیتے نے اس جگہ کو اپنی طعام گاہ بنا رکھا ہے۔ چاروں طرف دیکھنے سے ماحول کی مناسبت اور موزونیت بھی یہی غمازی کرتی معلوم ہوئی — اور سب سے نمایاں بات یہ کہ اس علاقے میں نہ تو بندر ہی تھے نہ پرندے — کچھ اکا دکا نہایت چھوٹی چھوٹی چڑیاں بیشک تھیں — وہ بھی کم تعداد میں۔

اس علاقے میں اب ہڈیوں کے ڈھانچے ہی تلاش کرنے لگا ایک جھاڑی کے جھنڈ میں انسانی ہڈیوں کے ٹکڑے ملے — اور نزدیک ہی کانٹوں میں الجھے ہوئے سر کے لانبے لانبے بال —

یہ کسی عورت کے جسم کی ہڈیاں تھیں۔

رضیا کی بیوی کی لاش کے ٹکڑے تو مل چکے تھے۔ یہ کوئی اور بدقسمت عورت تھی — پھر بھی چیتے کی جانفشانی اور احتیاط حیرت انگیز تھی۔ جائے وقوعہ سے اس جگہ تک نہایت محتاط اندازے کے مطابق بھی کم از کم دس میل کا فاصلہ ضرور رہا ہوگا۔ میرے علم میں مجروح کے گاؤں کے علاوہ نزدیک ترین آبادی دس بارہ میل پر تھی۔ لاش کو دس میل سفر صرف اس لیے تو نہیں کیا جا سکتا کہ ماحضر صرف طعام گاہ میں ہی تناول کیا جائے۔

کچھ تو اسے انسانی واردات سے خوف تھا۔ کچھ تعاقب میں آنے والوں

غل شور سے ڈرایا ہوگا — اور چیتا لاش اٹھائے اٹھائے آخر اپنی مخصوص جگہ آکر ہی رکا —

البتہ یہ حیرت کی بات تھی کہ اس مقام کے آس پاس اور بھی انسانی ہڈیاں پڑی ملیں جو زیادہ پرانی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدم خور نے کئی اور وارداتیں بھی کیں جن کا ہمیں علم نہیں تھا۔

یقیناً اس گاؤں کے علاوہ بھی آبادیاں تھیں —

مجھے بتایا گیا تھا کہ وہاں سے بارہ میل مشرق کی طرف سات آٹھ گھروں پر مشتمل ایک زراعتی آبادی تھی اس سے دو میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں بیس گھر تھے۔ اور وہاں سے چھ چھ سات سات میل کے فاصلوں پر اور بھی پہاڑی آبادیاں تھیں کسی آبادی میں دو تین ہی گھر تھے۔ کسی میں ذرا زیادہ رہے — نو دس بارہ — بس اس سے زیادہ بڑا گاؤں تو ہوتا ہی کم ہے۔

اور میرا ماتھا ٹھنکا۔

اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ آدم خور یقیناً وقتاً فوقتاً ہی شکارگاہ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ کبھی کسی گاؤں پر حملہ — کبھی کسی دوسری آبادی کی تاخت و تاراج —

ہمیں تو صرف ایک ہی مقام کی وارداتوں کا علم تھا —

افسوس کہ مجھے اس وقت — اس طعام گاہ سے دوسری آبادیوں تک فاصلوں کا علم نہیں تھا۔ ورنہ میں وہاں بھی جا کر معلومات حاصل کرتا۔

تلاش کرنے سے وہاں جھاڑیوں میں اور چٹانوں کے درمیان دراڑوں میں دس بارہ سے بھی زیادہ انسانی جسموں کی ہڈیاں ملیں — ان سب کو جنگل کے مردار خوروں نے ٹکڑے کر کے بکھیر دیا تھا اور سب کی سب خشک تھیں — لیکن کچھ ہڈیاں ایسی تھیں جن میں ابھی بو برقرار تھی — اور ایسی ہڈیوں کو زیادہ پرانی نہیں کہا جا سکتا ...

[illegible] ہڈیاں بھی ملیں جو ابھی نم تھیں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

یا اللہ۔۔۔

یہ آدم خور کس سرعت کے ساتھ انسانی زندگیوں کو نیست و نابود کر رہا تھا۔ جو ہڈیاں تھیں۔۔۔ وہ دو تین ہفتے سے زیادہ پرانی نہیں ہو سکتیں۔۔۔ ان میں سخت سڑاند تھی۔۔۔ اور میں نے اس وادی میں اُترتے ہی جو سڑاند محسوس کی وہ ان ہڈیوں سے ہی پھیل رہی تھی۔

زمین کہیں نرم تھی کہیں سخت۔۔۔ ہر طرف چیتے کے پیروں کے نشانات تھے۔ اور زیادہ قابل توجہ بات یہ کہ یہاں چرندوں کے کھروں کے نشانات قطعاً مفقود تھے۔

میں ہر قسم کے خطرے سے مقابلے کے لیے آمادہ تھا۔۔۔!

سارے حواس پوری طرح مستعد۔۔۔

میں نے سوچا اگر میں اس جگہ کسی درخت پر بیٹھوں تو رات کو چیتے کے ادھر آنے یا گذرنے کا بہت قوی امکان تھا۔۔۔ نہایت اچھا خیال تھا۔

گھڑی دیکھی۔۔۔ دوپہر کے دو بجے تھے۔۔۔ مجھے وضو کی ضرورت تھی۔۔۔ ذرا دور پر ایک پہاڑی چٹانوں کے سنگلاخ سینے سے پاک صاف پانی رِس رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف اچھی طرح دیکھ کر اطمینان کر لینے کے بعد رائفل پتھر سے ٹکا کر کھڑی کی اور نہایت پھرتی کے ساتھ وضو کر لیا۔۔۔ ویسے بھی تھکاوٹ اور دشت پیمائی کے دوران وضو بڑا خوش گوار اثر پیدا کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ وضو کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ طبیعت میں شگفتگی پیدا کرتا ہے۔

وضو کے بعد میں رائفل ہاتھ میں لے کر ایک پہاڑی سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایسے موقعے سے کہ دونوں جانب اور سامنے کسی جگہ سے حملہ نہ ہو سکے۔۔۔ اسی طرح کھڑے کھڑے میں نے دو رکعت قصر ظہر کی نیت کی اور اشارے سے نماز ادا کر لی۔ رخ بھی کعبے کی طرف تو نہیں تھا۔۔۔ لیکن نیت تو یہی تھی کہ منہ کعبے کی طرف ہے۔

"منہ میرا طرف کعبے شریف کے۔"

اللہ تعالیٰ سب دیکھنے، جاننے اور سننے والا ہے۔ اور بڑا ہی رحیم و کریم اور معاف کرنے اور درگذر کرنے والا۔

نماز کے بعد میں نے شکاری تھیلے سے کھانا نکالا۔ کھانا یہ تھا کہ حسن نے ایک موٹی روٹی پکا کر اس کے بیچ میں کچھ سبزی اور کچھ گوشت کی بے ہڈی کی بوٹیاں رکھ کر اس کو لپیٹ دیا جیسے سینڈوچ بنا دیا ہو۔۔۔ اس کو ایک کاغذ میں لپیٹ دیا تھا۔۔۔ میں نے وہ آدھی کھائی۔۔۔ پھر پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مصری کی دو تین ٹکڑیاں منہ میں ڈال لیں۔۔۔ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے ڈنر میں وہ لذت نہیں آسکتی جو اس وقت کھانا کھانے کے دوران میں نے محسوس کی۔۔۔

ذرا دیر ایک پتھر پر بیٹھ کر سستانے کے بعد میں نے طعام گاہ ترک کی اور ایک نہایت چھدرے اور کھلے ہوئے خطے میں نکل آیا۔۔۔ یہاں دونوں جانب پہاڑیاں جو بھی تھیں بالکل سنگلاخ۔۔۔ ان پر درخت اور جھاڑی نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔۔۔ جو کچھ دو چار درختوں کی قطار سی تھی وہ صرف وسط میں اور وسط پھیل کر ایک نہایت وسیع و عریض میدان میں تبدیل ہو گیا تھا۔۔۔ جو حدِ نگاہ تک پھیلتا چلا گیا تھا، اس میدان میں بلند گھاس بھی تھی اور جنگل بھی۔۔۔ ایک دو میل کے فاصلے پر پہاڑ بھی تھے اور وہ پہاڑ بالکل سبز تھے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ دائیں جانب کی پہاڑی جو بالکل ٹھوس پتھر کی تہوں سے بنی ہوئی تھی زیادہ بڑی بھی نہیں تھی اور اس پر سو دو سو گز چٹانی خطے کے بعد پھر سبزہ شروع ہو گیا تھا۔۔۔

میں بلا ارادہ اسی طرف مڑ گیا۔۔۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو کئی سو فٹ بلند عمودی چٹانی دیوار جیسی پہاڑی کی بلندی۔۔۔ اور ایسی عجیب چکنی چٹان جیسے کسی نے اس کو چھیل کر صاف کر دیا ہو۔۔۔ ذرا ہی دور چل کر میں ٹھٹک گیا۔ پھر دائیں جانب ایک گھاٹی نما درہ تھا۔۔۔ لیکن تنگ۔۔۔ اور اس کے سامنے کی ریت پر چیتے کے پیروں کے بیشمار نشانات۔۔۔ ان سب سے ظاہر ہوتا تھا کہ چیتا اس علاقے میں بکثرت آمد و رفت رکھتا ہے۔۔۔

کہیں وہ درہ آگے چل کر تنگ نہ ہو جاتا ہو۔۔۔!؟

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

تصویر میں صاف نظر آتا ہے کہ یہ درہ آگے چل کر کس قدر تنگ ہو گیا تھا۔ میں اس قسم کے دروں اور دراڑوں میں گھسنے کے وقت بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتا ہوں۔۔ کیونکہ ذرا سی غلطی مہلک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔۔ آخر کار میں نے درّے میں گھسنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے رائفل کو تو خیر کب سے آمادہ کیا ہوا تھا۔۔ کمر میں لگے ہوئے خنجر کو بھی بٹن کھول کر تیار کر لیا کہ خدا جانے کس وقت کیا صورت حال پیش آجائے۔۔ اگرچہ میں کسی جانور سے خنجر بدست مقابلے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

بسم اللہ کر کے درّے میں قدم رکھا اور فوراً ہی احساس ہو گیا کہ یہ تیندوے کی قیامگاہ ہے۔ اور میں سیدھا اس کے غار کے دہانے کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ اس طرح گویا میں وہ کام کرنے جا رہا تھا جو نہ تو عقلمندی کا تقاضا تھا نہ کامیابی کا ضامن۔۔ میں نے ٹھہر کر اطراف میں نظر کی۔۔ اگر ان چٹانوں میں بیٹھنے کی کوئی جگہ مل جائے تو وہیں بہ فراغت بیٹھ کر چیتے کے نکلنے یا گذرنے کا انتظار کرنا ہی بہتر تھا۔ محض اتفاق کی بات ہے کہ میں قدرت کی رہنمائی میں اس جگہ تک پہنچ گیا۔۔ ورنہ یوں چیتے یا شیر کے غار کا مل جانا آسان بات نہیں ہے۔

مجھے ایک ایسی جگہ نظر آہی گئی۔۔

سطح زمین سے کوئی دس فٹ بلندی پہ ایک پتھر کے گر جانے سے غار تو نہیں گڑھا سا بن گیا تھا۔ اگر میں کسی طرح اس میں پہنچ کر سما جاتا تو بہ آرام رات بھر بیٹھا رہ سکتا تھا۔۔ قبل اس کے کہ میں اس پہ چڑھنے کی کوشش کرتا میں نے درّے میں اور اندر تک جا کر دیکھا۔۔

آگے درہ اور تنگ ہو گیا تھا۔

اور پھر عین وسط میں۔ دہانے سے کوئی پچیس گز دور چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھنڈ میں وہ غار بھی نظر آگیا جس میں چیتے کا ہونا عین ممکن تھا۔

تصویر میں یہ جھنڈ صاف نظر آرہا ہے۔ افسوس کہ اس زمانے میں میرے پاس

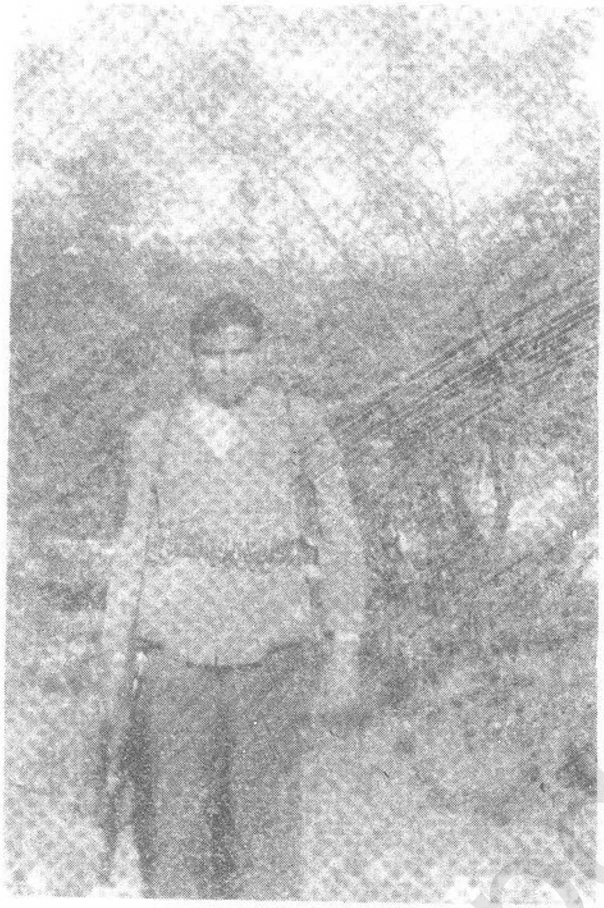

تیتر کے شکار پہ

وہ قیمتی اور اعلیٰ قسم کا کیمرہ نہیں تھا جو اب ہے، ورنہ تصویریں اور واضح ہوتیں اور پھر یہ تصویر ہے بھی کم از کم بیس بائیس سال پرانی میں نے تو اس حال میں بھی اس کو محفوظ ہی رکھا ورنہ کسی اور کے پاس تو خراب ہو چکی ہوتی۔۔ اس تصویر کے پس منظر میں جو کنواں سا نظر آتا ہے وہ چھوٹی جھاڑیوں اور درختوں کا جھنڈ ہے اسی کے عقب میں وہ غار ہے جو اس موذی کا مسکن تھا۔

اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے بعد میں نے باہر واپس آکر اپنے بیٹھنے کی جگہ منتخب

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کہ وہ جگہ پر چڑھنے کی کوشش شروع کی ۔ چٹانیں بالکل سنگلاخ اور عمودی ۔ کہیں کہیں دراڑیں تھیں ان میں انگلیاں ڈالنا سخت خطرناک ہو سکتا تھا اکثر بھورا سانپ جو سخت زہریلا ہوتا ہے ایسی ہی دراڑوں میں گھس کر بیٹھتا ہے ۔

میں نے چھری نکال کر اس دراڑ میں ڈالی جس میں انگلیاں پھنسانا تھیں ۔ اور ادھر اُدھر ہلایا ۔ میرے خیال میں میدان صاف تھا ۔ چھری میان میں رکھ کر رائفل کا سیفٹی کیچ لگایا ۔ اچھی طرح چاروں طرف دیکھا ۔ اطمینان کر لیا کہ چیتا آس پاس موجود نہیں ہے ۔ اور اللہ کا نام لیکر ذرا اونچا ہو کر انگلیاں دراڑ میں پھنسائیں ۔ ایک دو انچ کی جگہ پر پیر ۔ یعنی جوتے کی ٹو رکھی اور چڑھ گیا ۔ اس سے اوپر ایک اور دراڑ تھی ۔ اب اتنا وقت اور موقعہ نہیں تھا کہ میں چھری ڈال کر امتحان کرتا ۔ بسم اللہ کر کے اس دراڑ کو پکڑا اور نہایت سخت محنت کے بعد آخر اس گڈھے پر چڑھ گیا ۔

لیکن ۔

اس گڈھے پر چڑھ جانے کے بعد مجھ کو وہاں بیٹھنے کی مشکل کا اندازہ ہوا ۔ ڈیڑھ پونے دو فٹ چوڑی اور کوئی تین فٹ لانبی سنگی جگہ پر سمانا نہ تو آسان تھا نہ آرام دہ ۔ لیکن اس کے علاوہ بھی جگہ کی ضرورت تھی اور جگہ کہیں نہیں تھی ۔

اب کوئی چارۂ کار نہیں تھا ۔ وہیں بیٹھنا تھا ۔

میں کس طرح سکڑ کر سمٹ کر اس جگہ میں سمایا یہ بیان کرنا ممکن نہیں ۔ بس بیٹھ ہی گیا ۔ اور اس قدر پھنس کر پشت پہاڑ سے لگی ہوئی ۔ اور دونوں گھٹنے باہر نکلے ہوئے ۔ پہلو بدلنے کی گنجائش نہیں ۔ شکاری تھیلا بمشکل بغل کے قریب دبایا ہوا ۔ ہاتھ کو حرکت دی تو کہنی پہاڑ کے پتھر میں لگی ۔ اتنی زور سے کہ میں نے آنکھیں بھینچ لیں ۔ کہنی کی چوٹ ہوتی ہے بڑی تکلیف دہ ۔

بہر حال ۔

رائفل کا سیفٹی کیچ نہیں کھولا ۔ صرف اس ڈر سے کہ شاید کسی وقت

میں نیچے ہی گر جاؤں ۔

وقت کس آہستگی سے گذر رہا تھا ۔ یہ کوئی مجھ سے پوچھے ۔ سہ پہر کے بعد تو میں بیٹھا ہی تھا، عصر کی نماز وہیں بیٹھے بیٹھے پڑھی ۔ مغرب بھی وہیں پڑھی اور پھر عشاء کی بھی ۔ عشاء کے بعد مجھے پیاس لگی ۔ لیکن مجبوری تھی ۔

آنکھوں میں نہاں ایک سمندر لیے پھرنا
اے تشنہ لبوں اپنا مقدر لئے پھرنا

اس علاقے میں کامل سکوت تھا ۔ نہ وہاں درندے اور چرندے موجود تھے نہ ہی پرندے ۔ پرندوں کے رہنے کے لیے تو خیر وہاں درخت تھے ہی نہیں ۔ لیکن طعام گاہ کے نزدیک جو درخت تھے ان پر بھی پرندوں نے بسیرا نہیں کیا ۔

اندھیرا ہوا تو درے کے اندر بہت گہری تاریکی پھیل گئی ۔ لیکن جو علاقہ کھلا ہوا تھا وہاں ستاروں کی روشنی بھی کافی تھی ۔

عشاء کی نماز کے بعد مجھے بھوک لگی تو میں نے ٹال دیا ۔ سوائے اس کے کہ چند بادام اور مصری کے ٹکڑے لے لئے ۔ رات کو میں ویسے بھی بہت ہلکا کھانا کھاتا ہوں ۔ اکثر غائب کرتا رہتا ہوں ۔ رات کو کھانا نہ ملے تو شب بیداری آسان ہو جاتی ہے ۔ اور اس وقت جبکہ میں بغور درے پر نظریں جمائے تھا ۔ اس خطے میں جہاں ہڈیاں پڑی تھیں ۔ کسی جانور کی ہڈیاں چبانے یا کوئی بڑی ہڈی توڑنے کی کوشش کرنے کی آوازیں آتی رہیں ۔ میں جانتا تھا کہ یہ جنگل کے مردار خور ہوں گے ۔

تمام رات آنکھوں میں کاٹی ۔

کوئی جانور ادھر سے نہیں گذرا ۔ تا آنکہ سپیدۂ سحری نکلنے کو ہو گیا میں نے فجر کی نماز پڑھی ۔ اور ابھی وظیفہ ہی پڑھ رہا تھا کہ ریچھ کے بولنے کی آواز آئی ۔ دور سے ۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ کھول لیا ۔

چند ہی لمحوں بعد درے کے اندر جہاں ابھی اندھیرا تھا زور زور سے سانس لینے کی آواز آئی ۔ یہ ریچھ کے سانس کھینچنے کی آواز تھی ۔ پھر میں اس آواز کو سمجھ گیا ۔ ریچھ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا — زمین سونگھ کر چیتے کی بو لے رہا ہو گا۔ لیکن وہ ظالم ادھر آیا ہی نہیں —

تعجب تو یہ کہ ذرا دیر بعد وہ سونگھنے کی آواز عین میرے آشیانے کے تلے آئی — گویا وہ اندر آ رہا تھا — اور پھر وہ آواز سرک کر اندر کی طرف چلی گئی — گویا ریچھ غار کی طرف جا رہا تھا — یہ تو بڑی عجیب بات تھی۔

اب میں پھر شک میں مبتلا ہو گیا —

واقعی چیتا وہاں تھا بھی کہ نہیں — کہیں وہ ریچھ کے غار نہ ہوں — میں ریچھ کو بے سبب ہلاک بھی نہیں کر سکتا تھا — کیوں مارتا —

اب روشنی ہو گئی۔

ریچھ صاف نظر آ رہا تھا — وہ جا بجا پتھروں، جھاڑیوں اور زمین کو سونگھتا آہستہ آہستہ اندر کی طرف جا رہا تھا — جس جگہ جھاڑیوں کا جھنڈ بن گیا تھا وہاں پہنچ کر وہ ذرا ٹھہرا — اور تھوتھنی اٹھا کر چاروں طرف سونگھا — پھر سر جھکا کر زمین سونگھنے لگا — اب وہ ہلکی آواز سے غرا بھی رہا تھا — مجھ سے کوئی بلیں گز پر رہا ہوگا — ہلکا اور کم —

اور دو ہی لمحوں بعد غار کے اندر سے چیتا دھاڑ کر نکلا اور ریچھ سے گڈ مڈ ہو گیا — ریچھ بھی کوئی کم نہیں ہوتا — وہ بھی چیخ چیخ کر اور بلبلا بلبلا کر چیتے پر حملے کرنے لگا — چیتے کو دیکھتے ہی میں نے اس کا نشانہ لے لیا تھا — لیکن مسلسل حرکت اور خونریز لڑائی کی وجہ سے نشانہ جما نہیں تھا — ایکبار گتھم گتھا ہو کر چیتا سامنے آیا — اس کی پشت میری طرف تھی — میں نے گردن کے ذرا نیچے دونوں شانوں کے درمیان کی جگہ کا نشانہ لیا اور فائر کرنے میں دیر نہ کی — الحمدللہ گولی صحیح لگی — اور چیتا وہیں گر گیا۔

ریچھ دھماکے سے خوف زدہ ہو کر پہلے تو غار کے اندر کی طرف بھاگا۔ پھر چونکہ آواز کی گونج سے سمت کا تعین نہیں کر سکا اس لیے واپس باہر کی طرف بھاگا — اور میں اس سے کوئی تعرض نہ کرتا — لیکن افسوس — بدبختی کہ اسی وقت میں نے ایجکشن چلا کر فائر شدہ کارتوس نکال پھینکا اور دوسرا اس کی جگہ چیمبر میں آ گیا — یہ حرکات ریچھ

نے دیکھیں اور نجانے اسے کیا سوجھی کہ دونوں پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر پنجے اٹھائے مجھ کو نوچنے — اب میں کیا کرتا — اس کے سینے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا — اتنے قریب سے گولی کے دھکے نے اس کو تقریباً چار فٹ پیچھے پھینک دیا — اور وہ معمولی سی حرکت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

میں نے چیتے کی طرف دیکھا — اس کے جسم میں بھی کوئی حرکت نہیں تھی — گولی نے اپنا کام پورا کیا تھا — ایسی حالت میں کہ اس پر بھی کوئی پندرہ گز سے فائر ہوا — تین سو چھتر ہالینڈ اینڈ ہالینڈ کی گولی سے کیسے بچ سکتا تھا — بہرحال میں نے پھر بولٹ کو حرکت دی اور کارتوس چیمبر میں لگا لیا۔

آدھا گھنٹہ میں وہیں بیٹھا رہا — دونوں میں سے کسی نے حرکت نہیں کی تو میں نے جیب سے ڈور نکال کر رائفل کا سیفٹی کیچ لگا کر ڈوری میں باندھی اور نیچے لٹکا دی — اس کے بعد میں اترنے کی کوشش میں لگ گیا — دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد میں پہلے تو مجبوراً لٹکا — اور جب یہ اندازہ کر لیا کہ نیچے کوئی ایسا پتھر نہیں جس پر گر جاؤں تو کود گیا اور کودا تو پیر ایک گول پتھر پر پڑا — توازن بگڑا اور میں سیدھا ریچھ کی لاش پر ہی گرا۔ گرتے ہی گھبرا کر اٹھا — لپک کر رائفل اٹھائی اور سیفٹی کیچ کھول دیا — اس ڈر سے کہ ریچھ حملہ کرے گا —

مگر ریچھ نے حرکت نہیں کی —

چیتا بھی بے حرکت پڑا تھا — میں نے کئی پتھر پھینک کر چیتے کے مارے — کوئی جنبش نہیں ہوئی — اس طرح اطمینان کر لینا بہت ضروری ہے — یکبارگی نزدیک جانا بہت خطرناک ہوتا ہے۔

اب میں اطمینان سے حوائج ضروریہ سے فراغت میں مصروف ہو گیا۔ اور کوئی آدھے گھنٹہ بعد چشمے پر سے پانی پیا — جو نہایت شیریں تھا۔ بادام اور مصری کا ناشتہ کیا — اور ٹہلتا ہوا گاؤں کی طرف واپس چلا — چیتے اور ریچھ کی لاشوں پر میں نے جھاڑیاں ڈال دی تھیں —

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

آدھے راستے میں ہی احسن اور کئی گاؤں والے مل گئے۔ اور ہم سب پھر وہاں واپس آئے جہاں دونوں پڑے تھے۔ ان لوگوں نے دونوں لاشیں ایک جگہ رکھ دیں تو میں نے فوٹو کھنچوایا۔ اس کے بعد گاؤں والوں نے دونوں لاشیں اپنے قبضے میں لے لیں جب ہم واپس ہوئے تو چار آدمی تیندوے کو اُٹھائے تھے اور تین آدمی ریچھ کی لاش لے جا رہے تھے۔ وہاں سے کوئی دو میل آگے ہی چتیلوں کا ایک منڈا ملا، اور میں نے دیہاتیوں کے اصرار پر ایک چتیل مار دیا تاکہ اس کا گوشت گاؤں والوں میں تقسیم کیا جا سکے۔

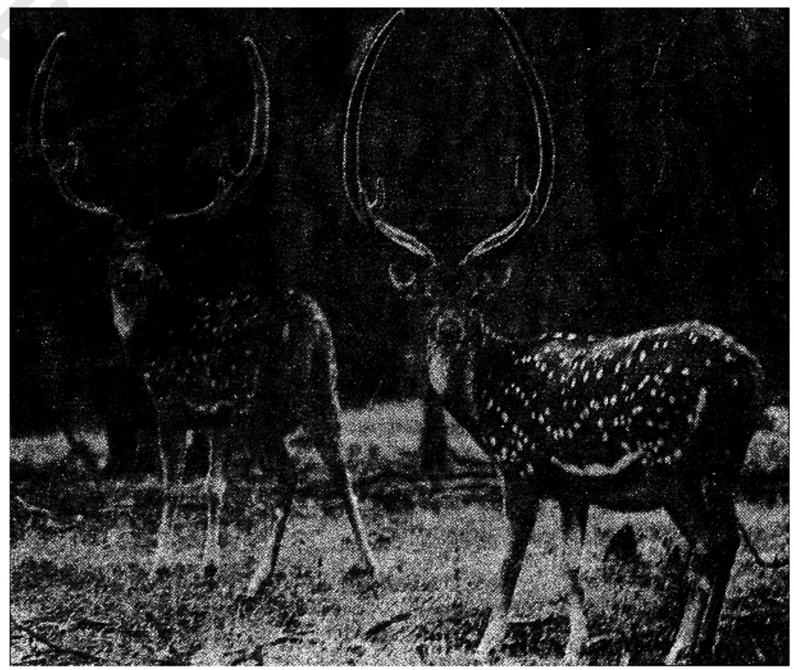

چتیل

نگنڈے کا لنگڑا آدم خور

قیام پاکستان سے پہلے کے ہندوستان میں بہت سی ریاستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان ریاستوں کے معرض وجود میں آنے کی تاریخ بیان کرنا اس کتاب، یا اس واقعے کے مقاصد میں شامل نہیں ہے لیکن یہ کہنے میں ہرج نہیں کہ ان ریاستوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ میں صرف پہلے طبقے کا ہی ذکر کروں گا۔

پہلی قسم ان ریاستوں کی ہو گی جو صدیوں سے قائم تھیں۔ یہ لوگ وہ تھے جن کو ہندوستان کے بادشاہوں نے مختلف مقاصد کے تحت جاگیریں عطا کی تھیں۔ جاگیریں اس لیے عطا کی جاتی تھیں کہ وہ جاگیردار۔ جیسے بادشاہی دربار سے منصب بھی عطا ہوتا تھا۔ ایک مقررہ تعداد کی فوج تیار کر کے ان کو ملکی ضروریات کے پیش نظر آمادہ جنگ رکھے ان کو ہتھیار فراہم کرے اور اگر ضرورت ہو تو وسائل نقلیہ کا بھی انتظام کرے۔ اس زمانے کے وسائل نقلیہ۔ ہاتھی، گھوڑے، خچر، گدھے۔ اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز شئے۔ اونٹ۔ ہوا کرتے تھے۔ جس کے بارے میں نجانے کس نے پوچھ لیا۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ اور آج تک یہ سوال پوچھا

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

جارہا ہے مگر اونٹ ہے کہ سینکڑوں سے بھی زیادہ سال گذر جانیکے باوجود اس کا جواب نہیں دے سکا — توقع یہ بھی ہے کہ آئندہ بھی اس سوال کا جواب اونٹ کی نسلوں سے بن نہیں پڑے گا۔

جب کوئی معرکہ پیش تو بادشاہ جاگیرداروں — یا منصبداروں کو ان کی سپاہ کے ساتھ طلب کر کے جنگ میں شمولیت کا حکم دیتا۔

ان القاب کا اعادہ غیر ضروری ہے جو ان کو دربار شاہی سے عطا ہوتے تھے۔

ان جاگیرداروں کی ایک قسم صوبے دار بھی تھی — صوبہ حکومت اسلامی ہند کے ایک بڑے علاقے پر مشتمل ہوتا تھا — مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو بعض صوبے دار خود مختار حکمران بن بیٹھے —

ان خود مختار ہوجانے والے ابن الوقت قسم کے صوبے داروں میں سے ایک مشہور زمانہ خاندان (آصفیہ) آصف جاہی تھا۔ جو دکن پر قابض ہوگیا اور وقت گذرنے کے ساتھ ہی بڑی طاقت اور شان و شوکت پیدا کر لی — اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ انگریزوں کی اعانت اور اپنے ہم قوموں اور ہموطنوں سے بغاوت کے انعام میں۔ ایسٹ انڈین کمپنی نے دکن کی ریاست کو بحال رکھا — اور وہ خطابات ودیعت کیے جو کسی اور راجے یا نواب کو نہیں دیئے تھے — دکن کی نظامت شاہی میں بدل گئی — اور آخر ہندوستان کی بزرگ ترین اسلامی ریاست کا درجہ حاصل کر لیا۔ اور نظام دکن دنیا کے متمول ترین اشخاص میں شمار ہوئے۔ عروج کے دنوں میں ریاست دکن میں اسلام کو فروغ ملا — اور نظام دکن اپنی جبین ناز پر خادم اسلام کا مایہ ناز نشان لگائے ہر موقعے پر فیاضانہ احساسات کا مظاہرہ کرتے رہے جس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اسلامیان ہند کو ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کو ہوتا — حتیٰ کہ مرکز اسلام کعبۃ اللہ کی خدمات کا شرف بھی نظام دکن کو حاصل رہا — دکن کی نظامت نے ہر ممکن طریقے سے اسلامی اداروں کی مالی معاونت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہند اسلامی کی ممتاز شخصیات کی سرپرستی — ریاست دکن کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ نظام کے

شخصی اور ذاتی زکوٰۃ اور خیرات فنڈز سے بیشمار حاجتمندوں کی مدد کیجاتی — گو صف حاجتمنداں میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جن کی حاجت روائی قطعاً غیر ضروری تھی — اس کے علاوہ دکن کے خزانۂ عامرہ کے منہ بھی اسلام کی خدمت کے لیے کھلے رہے۔

لیکن — وہ لوگ جو راجے، مہاراجے اور نواب کہے جاتے تھے، ان میں سے بہت سے راجے، مہاراجے اور نواب نظام کے تنخواہ دار ملازم تھے۔

آخر — ہندوستان میں حکومت برطانیہ کا جنازہ تیار کرنے میں بھی دکن نے نمایاں خدمات انجام دیں — اور جب حکومت بھارت وجود میں آگئی تو میر عثمان علیخان آصف جاہ، نظام دکن کے بجائے کٹھ پتلی بن گئے جسے چند موقعہ پرستوں نے خوب نچایا — دکن کی تاریخی رسم ہی یہی تھی — پھر —!

ہندو حکومت ہند اس کا وجود برداشت نہ کر سکی اور ریاست ختم کر دی گئی —

البتہ یہ کہدینا ضروری ہے کہ ریاست دکن کو طاقت کے زور پر ختم کیا گیا — اب یہ کہ دکن کمزور تھا — یا العدروس نے بغاوت کی — یا کوئی اور وجہ ہو — قصور تو نظام کا ہی تھا — ہمیشہ کمزور ہی خطاوار ہوتا ہے — اس کی سب سے بڑی خطا ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ کمزور ہوتا ہے۔

نظام حیات میں کمزوری ایک ناقابل معافی جرم ہے۔

امرتسر میں سکھوں کی مقدس ترین عبادت گاہ کی بے آبروئی — سکھوں کی کمزوری کا شاخسانہ —!

بیت المقدس کی بیحرمتی — مسلمانوں کی عمومی کمزوری کی سزا —!

دونوں شدید کمزوریوں کا افسوسناک نتیجہ ہیں —

پھر معاملہ دکن تک نہیں رہا — کچھ اور ایسی مسلم ریاستیں جنھوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق قبول کیا تھا — ہندوستان کی طاقت ور حکومت کی مملکت طلبی کی ہوس پر قربان ہوئیں — ان میں جونا گڈھ اور مانا ودر قابل ذکر ہیں — لیکن

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

جس عظیم مملکت سے ان ریاستوں نے الحاق کیا تھا وہ کمزور تھی — ہندوستان نے اس کمزوری کا فائدہ اُٹھایا۔

کچھ عرصہ بعد پاکستان اور ہندوستان، دونوں جگہ پر نوابی اور راجگی اختتام پذیر ہوئی۔ پاکستان میں تو صرف چند ہی ریاستیں تھیں — جیسے بہاولپور، سوات وغیرہ، البتہ ہندوستان میں ان ریاستوں کی تعداد سینکڑوں تک تھی — ان میں سے بیشتر وہ زمیندار یا جاگیردار تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام نہاد سرکاری انگریزوں کی امداد کر کے ان کی ملک گیر حکومت کے قیام میں اعانت کی۔ اس خدمت عظیم کے معاوضے میں جاگیرداروں کی جاگیریں اور تعلقے بحال کئے گئے بلکہ ان میں اضافہ کیا گیا۔ مزید علاقے ان کو عطا کئے گئے — کچھ جدید جاگیریں بھی وجود میں آئیں کئی نئے تعلقے پیدا ہوئے۔

حیدرآباد دکن کی ریاست بڑے جاہ و جلال کی ریاست تھی۔ پہلے تو وہاں کا حکمران — یعنی نظام دکن — برطانوی حکومت کا "فرزند دلبند" ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اس فرزند کو داخلی آزادی حاصل تھی جو کسی اور ریاست کو حاصل نہیں تھی — اس کا اپنا سکہ تھا۔ جس کو وہاں کی زبان میں 'حالی' کہتے تھے۔ اس کی اپنی ریلوے تھی، اس کی اپنی فوج تھی۔

فوج کا ذکر آتا ہے تو عجیب مضحکہ سا معلوم ہوتا ہے —

اگر موجودہ دور کے حالات کے تحت سوچا جائے اس نظامی فوج کو MERCENERIES کی "فوج ظفر موج" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں خالص دکنی بہت کم تھے — افسران کی زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نیم انگریز بن کر نکلتے تھے۔ یا ہندوستان کے تعلقداروں، نوابوں کے خاندانوں کے جوان — NCOS اور جوانوں میں زیادہ تعداد "چاؤشوں" کی تھی — چاؤش دکن کی اصطلاح میں اس سیاہ فام قوم کا نام ہے جو عرب کے فرار شدہ عربیوں کی نسل سے وجود میں آئی — یہ قوم اپنے دوغلے پن کی وجہ سے نہ تیتر تھی نہ بٹیر —

"ماں ہے بٹیر باپ کلنگ — بچے ان کے رنگ برنگ"

اسی قوم کا ایک فرد ترقی کرتے کرتے سپہ سالار کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچا۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس حد تک کامیاب تھا کہ میر لائق علی اور سید قاسم رضوی جیسے مجاہدوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ عین لڑائی کے وقت جبکہ ہندو افواج اپنے تمام تر اسلحہ کے ساتھ دکن پر حملہ آور ہو رہی تھیں — اس فرض شناس شخص نے اپنی کاریگری کا حق نباہ دیا — اور ایسی صفائی کے ساتھ حکومت ہند سے ساز باز کر لی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اور اس ساز باز کے نتیجے میں دکن کی "فوج ظفر موج" اپنی بیرکوں میں آرام فرماتی رہی — اور قاسم رضوی کے جانفروش مجاہد — مکمل اسلحہ اور صحیح رہبروں کے بغیر اپنی جانیں قربان کرتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ دکن کی مسلح افواج مزاحمت کرتیں تو ہندی فوج کے دانت کھٹے ہو جاتے — یقیناً اگر یہ مزاحمت چند روز جاری رہتی تو کچھ ایسی طاقتیں تھیں جو دکن کی امداد کو آ پہنچتیں اور شاید حالات وہ نہ ہوتے جو اس وقت ہوئے۔ وہ شخص جس نے دکن کو فروخت کیا، وہ افتخار صادق اور رشک جعفر — العدروس تھا — اور اسی چاؤشی نسل سے تھا جو دکن میں پائی جاتی تھی — اب یہ کہ عدروس کے علاوہ کوئی اور بھی سازش میں شریک ہو سکتا ہے ایک جدا بات ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

یہ شعر شاہ نعمت اللہ ولی کے نام سے منسوب ایک طویل فارسی نظم کا ہے اور ضرب المثل بن گیا ہے۔

یہ طویل نظم ایک عرصہ گذرا کہ ہندوستان میں شائع ہوئی۔ اور اس وقت کے مسلمانوں میں بڑی مقبول ہوئی تھی، کیونکہ اس میں گذشتہ بیشمار ایسے واقعات کی "پیشنگوئی" کی گئی تھی جن کا براہِ راست مسلمانوں سے تعلق تھا اور جو واقعی وقوع پذیر ہو چکے تھے۔ کہنا یہ تھا کہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی جب وہ واقعات رونما نہیں

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

ہوتے تھے۔ اسی طرح اس میں بعض آئندہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات کی پیشین گوئی بھی تھی۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ان میں سے بیشتر واقعات کے بارے میں پیشین گوئیاں درست ثابت نہیں ہوئیں۔ آئندہ کی خبر کسی کو نہیں۔

مثلاً اس میں اشارۃً نہرو کے مسلمان ہو جانے کی پیشین گوئی بھی تھی۔ اگر اس جیسا خالص اسلام دشمن اور کون ہوگا۔ بہت سے لوگ اس پیشین گوئی پر یقین کرتے ہوئے بہت پر امید رہے کہ بس اب نہرو کی کایا پلٹ ہوئی۔

بہرحال۔ یہ قصہ جو میں شروع کرنے کو ہوں۔ اسی دکن سے متعلق ہے۔ اور ۱۹۵۸ء کے موسم بہار کا واقعہ ہے۔ ان دنوں پاکستان اور ہندوستان کے مابین سفر کچھ ایسا دشوار نہیں تھا۔ تین ماہ کا ویزا بآسانی مل جاتا تھا۔ اور اس میں کسی مشکل کے بغیر توسیع بھی ہو جایا کرتی تھی۔

یہ واقعہ نلگنڈے سے اٹھارہ میل جانب جنوب مشرق۔ جنجالی کے علاقے کا ہے یوں تو دکن کے جنگلات ہمیشہ سے مشہور رہے۔ لیکن جنجالی کو انتہائی دشوار گذار۔ گھنے اور خطرناک جنگلوں سے معمور ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حیدرآباد سے نلگنڈے جانے کے لیے سڑک کا راستہ تھا اور اچھی سڑک تھی جس پر نہایت اچھی بسیں بھی چلتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ تقریباً آدھے راستے پر ایک ریستوران تھا جہاں بسیں ضرور ٹھہرتی تھیں۔ جو لوگ کاروں اور جیپوں سے سفر کرتے تھے وہ بھی یہاں ٹھہرتے۔ اس جگہ کا نام نارکٹ پلی ہے۔ اور اس ریستوران کی خصوصیت وہ عجیب وغریب لذیذ گلاب جامنیں ہوا کرتی تھیں جو وہاں ملتی تھیں۔ ڈاکٹر حسینی بولتے تھے کہ اب بھی وہ ریستوران ہے اور گلاب جامنیں بھی ملتی ہیں۔

سفید چینی کی شفاف پلیٹ میں دو نہایت جاذب نظر۔ شیرے میں بھیگی گلاب جامنیں اور تھوڑا سا شیرا۔ اس پر خالص دودھ سے نکالی ہوئی سفید رنگ کی بالائی پڑی ہوئی۔ نہایت چمکدار اور صاف چمچی۔ اور قریب رکھا ہوا گلاس میں سے جھانکتا سفید رومال۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں وہاں سے جب بھی گذرتا ٹھہر کر

چینتل

گلاب جامنیں ضرور کھاتا۔ اور ایک کپ چائے پیتا۔

اب مجھے یہ یاد نہیں کہ بسیں نلگنڈے سے آگے کہاں جاتی تھیں۔ ضرور آگے کوئی بڑی جگہ رہی ہوگی۔

حیدرآباد شہر کو مقامی حضرات۔ بلدہ۔ کہتے تھے۔ یہاں کی کئی چیزیں مشہور تھیں۔ مثلاً عثمان ساگر، موسیٰ ندی۔ چہار مینار۔ بلکہ چار مینار۔ مکی مسجد۔ عجائب گھر کا آئس کریم۔ اور سب سے عجیب شئے "جھٹکا"۔ جو تانگے کی خالص مقامی شکل ہوتی تھی۔ اس میں بیٹھنے کے لیے عقبی حصے کی طرف چھوٹا سا دروازہ ہوتا تھا۔ اور چاروں طرف سے موٹر کار کی طرح بند۔ کھڑکیاں سی بنی ہوئی اور اوپر چھت۔ دکن کے جھٹکوں کے گھوڑے بڑے نحیف اور مظلوم نظر آتے تھے۔

http://updf.weebly.com

میر صاحب میرے بڑے ہی مخلص دوست تھے جنھوں نے اسی زمانے میں تلم پلّی میں نہایت شاندار کوٹھی بنوائی تھی — ویسے اس جگہ نئی کوٹھی سے ملحق ان کی پرانی کوٹھی بھی تھی جس میں ان کے بیان کے مطابق "ستاویس" "کمراں" تھے — بیس "کمراں" محلسرا کے اور سات "کمراں" دیوان خانے کے اور دیوان خانے کے مردوں کو محلسرا میں جانے کی اجازت "نکو" تھی۔

میر صاحب کوئی دو سال سے ہر خط میں — خط وہ پابندی سے ہر جمعے کو لکھتے تھے۔ مجھے جنجالی کے ایک آدم خور شیر کے واقعات، حرکات، واردات، اور ہلاکت آفرینیاں اتنی تفصیل کے ساتھ لکھ رہے تھے کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں — بعض حضرات کو منظر کشی کا ملکہ حاصل ہوتا ہے — میر صاحب میں بھی یہ وصف تھا — اور انھوں نے مجھے اس آدم خور شیر کے بارے میں اتنی خبریات فراہم کر دی تھیں کہ جب میں نے اس کے شکار کا ارادہ کیا تو کسی مزید معلومات کی احتیاج نہیں رہی۔

تین ماہ کا ویزا لیا — اپنی رائفل ساتھ لیجانے کی اجازت حاصل کی — اور بذریعہ ٹرین لاہور سے امرتسر آیا — یہاں ریلوے مجسٹریٹ نے میری رائفل کے لیے چھ ماہ کا لائسنس بنا دیا اور میں بمبئی جانے والی گاڑی میں اسی شام نو بجے سوار ہو گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کی گاڑیوں میں بھی فرسٹ کلاس ہوا کرتا تھا اور نہایت آرام دہ۔ مجھے ایک کونے میں نشست ملگئی تھی۔ جس میں صرف ایک برتھ اور تھی جو کہ خالی جا رہی تھی — ٹرین روانہ ہو گئی تو دیوار پر لکھے ہوئے نوٹس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے دروازہ اور دروازے کے قریب کی کھڑکی لاک کر دی۔

دوسرے روز دوپہر کو ٹرین بلھارشاہ پہونچی یہاں گاڑی بدلنا ہوتی تھی۔ چنانچہ میں جس بوگی میں تھا وہ گاڑی سے کاٹ کر الگ کھڑی کر دی گئی۔ آدھ گھنٹے بعد گرینڈ ٹرنک میل آ پہنچا اور میری بوگی اس میں لگا دی گئی۔ دس منٹ بعد ہم پھر ملدے کی طرف چل پڑے — یہاں سے ریلوے لائن بڑے ہی شاداب اور خوبصورت

پہاڑی علاقوں سے گذرتی ہے۔ یوں تو شادابی جھانسی کے بعد سے شروع ہو جاتی ہے اور دندھیاچل کی ساری رعنائیاں اپنی قدرتی اصلیت کے ساتھ ہر طرف بکھری نظر آتی ہیں راستے میں بیشمار ندیاں، نالے اور دریا پڑتے ہیں۔ لیکن بلھارشاہ کے بعد کا علاقہ بڑا رنگین ہے اور دلچسپ بھی۔ جب ٹرین وہاں سے روانہ ہوئی تو میں کھڑکی کے پاس بیٹھا رہا۔

صبح گیارہ بجے کے قریب ٹرین حیدرآباد کے کاچی گوڑہ ریلوے اسٹیشن پر رکی میں دروازہ کھول کر کمپارٹمنٹ میں کھڑا تھا میر صاحب نے مجھے اور میں نے میر صاحب کو دیکھ لیا تھا — ٹرین رکی تو وہ اور ان کے دو عدد ملازم آ گئے۔ میرا سامان سمیٹا — میں نے اپنی رائفل شانے پر لٹکائی، اور ہم میر صاحب کی جیپ پر آ بیٹھے — اس وقت میر صاحب نہایت روانی کے ساتھ آدم خور کو لنگڑے کے لقب سے نوازتے ہوئے اس کے تاخت و تاراج کے قصے سنا رہے تھے۔ اور ان بیانات کے دوران ہی میری خیریت بھی دریافت کرتے جاتے تھے — مثلاً

"حضرت عجب شیر ہے۔ لنگڑا — بول کے بولے عجب لنگڑا ہے — کتنے ہی آدمی کھا گیا۔

ڈھائی سال کا عرصہ ہوتا حضرت — اور وہ لنگڑا انسانوں کا صفایا کرتا حضرت۔ اب تک اس نے دو سو آدمی کھائے حضرت — امی تو خیریت سے نا — لنگڑے کا کیا حال۔ سناؤں حضرت — بس آفت بولتے — آفت — بہنوں کی خیریت بولو نا حضرت۔"

اس دکنی اردو اور خلط ملط دریافت خیریت سے لطف اندوز ہوتا میں حضرت میر صاحب کی نئی کوٹھی پہنچ گیا میرے لیے دو کمرے نہایت خصوصیت کے ساتھ درست کرائے تھے — میں یہ نہ سمجھ سکا کہ دو کمروں کا کیا مقصد تھا۔ میں تو تنہا تھا — بیگم کو ساتھ نہیں لایا تھا — نئی کوٹھی میں زنانے اور مردانے حصوں کی علیحدگی کا اہتمام نہیں تھا۔ یہ جدید عمارت تھی اس لیے قدیم خیالات اور تقسیم و تفریق کو بھی مٹانا تھا۔

"میر صاحب — یہ تو مردانہ حصہ ہو گا۔"

"نکو بولے حضرت — اس کوٹھی میں نہ زنانہ نہ مردانہ — سب ساتھ ہوتا۔"

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

"ہیں ہنسنے لگا ۔ !"

"دھمام کرلو حضرت ۔۔ وہ تو کچن ہی میں ہوتیں ۔"

دو روز میں نے وہاں رہ کر بھابھی صاحبہ کے ہاتھ کے پکائے بگھارے بینگن ۔۔ بریانی ۔۔ دال کا پینا اور نجانے کیا کچھ کھایا ۔۔ دونوں دن ناشتے میں میری فرمائش کے مطابق ۔۔ کھچڑی اور آم کا کھٹا ہی رہا ۔۔ گو بھابھی نے اس میں کھٹے قیمے ، دو تین قسم کے اچاروں ، انڈے اور میٹھے کا اہتمام بھی کیا ۔

دوسرے روز صبح ابھی میں ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھک میں آیا ہی تھا کہ میر صاحب نہایت جوش و خروش کے عالم میں وارد ہوئے ۔

"کیا لوتے حضرت ۔۔ یہ آج کا اخبار ہے ۔۔ حضرت ۔ لنگڑے نے ایک اور واردات کر دئیے حضرت ۔۔ یہ دیکھو ۔۔"

میں نے اخبار لے لیا ۔

صفحہ اول پر ہی خبر تھی ۔۔ جنجالی کے لنگڑے آدم خور نے ساری حفاظتی تدابیر اور رکاوٹوں کے باوجود ، ایک گاؤں کی چوپال میں گھس کر ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کو پکڑ لیا اور لوگوں کے شور و غل کو نظر انداز کرتا قریب ہی نالے میں اُتر گیا ۔ گو نالے تک بھاگ کر جانے کے لیے اس کو گاؤں کی دو گلیوں سے گذرنا پڑا ۔۔ نالہ گاؤں کے ساتھ ہی ملا ہوا ہے ۔

"کیا شیر زیادہ تر اسی گاؤں پر حملہ آور ہوتا ہے ۔۔ ؟"

میں نے پوچھا

"دیکھو لو حضرت ۔۔ دس بارہ گاؤں ہوتے ۔۔ کبھی کسی گاؤں پر گرتا ۔ حضرت کبھی کسی پر ۔۔"

"اچھا ۔۔"

میں نے سوچا پھر میر صاحب نے کس مقام کو ہیڈ کوارٹر بنانے کا فیصلہ کیا ہے ۔۔ اور میں نے ان سے پوچھ ہی لیا ۔

"جنجالی میں رہتے ۔۔" انھوں نے جواب دیا ۔

گویا جنجالی ہی ہیڈ کوارٹر ہوگا ۔۔

تیسرے روز صبح ہم میر صاحب کی جیپ پر سوار نارکٹ پلی ہوتے ہوئے نلگنڈے پہنچے ۔۔ یہاں میر صاحب کے دوست ، محمد ناظر صاحب ہمارے میزبان بنے ۔۔ ان کا مکان نلگنڈے کے آخری سرے پر تھا ۔ اس طرح کہ سامنے ہی پہاڑی پر شکستہ قلعہ ان کے صحن سے صاف نظر آتا تھا ۔ میں اس قلعے سے پہلے کا آشنا ہوں ۔ اسی قلعے کی شکستہ دیوار کے بارے میں میری ایک آزاد نظم بھی ہے ، جو ضیافت طبع کے لیے لکھے دے رہا ہوں ۔ یہ نظم میرے دوسرے مجموعہ کلام "ریشۂ حنا" میں شامل ہے ۔ اور کچھ احباب نے مجھے بتایا کہ نظم بری نہیں ۔۔ عام طور سے میں آزاد نظم نہیں کہتا ۔ نجانے یہ کیسے ہوئی ۔

یہ اک قدیم ، شکستہ ریختہ دیوار
دبی ہوئی تھی ہزاروں برس کی مٹی میں
کیا ہے کشف اسے ماہروں کے ہاتھوں نے ۔
پھر اس کے ٹکڑے جو بکھرے ہوئے تھے ڈھونڈے ہیں
جہاں سے اکھڑے تھے ٹکڑے وہیں پر رکھے ہیں ۔
اور اس کے پیکر زخمی کو احتیاط کے ساتھ
جگہ جگہ سے سنوارا ہے ، اور بنایا ہے ۔
نتیجتاً کوئی صورت نکل ہی آئی ہے
وہ صورت آئینہ دار حیات رفتہ ہے
اس آئینے میں کئی قافلے ہیں لمحوں کے
اس آئینے میں کئی صورتوں کا پرتو ہے ۔
یہ اک قدیم شکستہ ریختہ دیوار
یہ ایک قصر فلک بوس کا ہی حصہ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

اسی کے سائے میں جاہ وجلال پلتا تھا
اسی کے سائے میں دروزہ زندگی کے لیے
سکندری کے نشانات کھولے جاتے تھے۔
یہیں پہ قیصر و دارا کا طمطراق بھی تھا۔
اگرچہ ہے یہ شکستہ وریختہ دیوار
اک عہد رفتہ کی تاریخ اس میں پنہاں ہے
یہ ایک بھولی ہوئی داستاں کا ٹکڑا ہے

جنجالی ——! ایک پہاڑی کے دامن پر آباد گاؤں تھا — اور —!

عجب دشوار جگہ تھی — واقعی اسم بامسمٰی — آبادی پہلے تو صرف اٹھائیس گھروں پر مشتمل تھی — جس میں ایک ضلعدار کا گھر بھی تھا — ایک دالان اور کمرے پر مشتمل کچہری تھی۔ اس کے علاوہ آبادی کے کنارے ایک سنگین عمارت کو پولیس اسٹیشن کا رتبہ ملا تھا۔ جس کے ساتھ ہی سات سپاہیوں، ایک افسر اور ایک تھانیدار پر مشتمل پولیس کے کوارٹر تھے۔ پولیس فورس کے سپاہی ڈنڈوں اور بے دھار کی تلواروں سے مسلح تھے — تھانیدار کے پاس فیروز شاہی دھماکے کی قسم کی بھرمار بندوق تھی — اور تھانیدار نے مجھے بتایا کہ تھانے کی "میگزین" یعنی اسلحہ خانے میں، دو عدد بھرمار بندوقیں — کئی برچھیاں اور ایک عدد دھار دار تلوار بھی تھی۔

کیا یہی وہ ہتھیار تھے جو العدروس کی فوج کے پاس تھے —؟!

بیچارے میر لائق علی اور سید قاسم رضوی ان ہتھیاروں کے بھروسے پر بھارت کی حکومت سے ٹکر لینے چلے تھے —! غالباً یہ کہا جائے گا کہ بدر کی جنگ میں مسلمانوں کی کیا حالت تھی — چہ عجب —!؟

گاؤں کے مشرق میں — آبادی سے صرف دو سو گز دور — ایک ندی تھی — جو گہری تو بالکل نہیں تھی — لیکن وسعت پندرہ بیس گز سے زیادہ ہی رہی ہو گی۔ پانی نہایت شفاف۔ اور پایاب — سارے عرض میں چھوٹے چھوٹے گول مٹول پتھر یا ت پھیلے

سؤر

ہوئے تھے۔ کہیں خشک ریت اور پتھر — کہیں پانی یہ حالت سارے ہی عرض کی تھی — بلکہ ایک آدھ جگہ تو وسط میں چھوٹے موٹے شریفے یا کروندے کے درخت بھی نکل آئے تھے۔

ندی کے اس پار —
گویا ندی کے مشرقی کنارے پر، ندی کی وسعت ختم ہوتے ہی جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو ہر قدم پر گھنے سے گھنا ہوتا گیا تھا —

شمال کی طرف گاؤں والوں کے کھیت تھے — جو بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے، مغرب میں وہ پہاڑی — بلکہ پہاڑی سلسلہ تھا جس کے دامن پر جنجالی کی آبادی تھی۔

جنوب میں بھی کچھ کھیت تھے اس کے بعد جنگل — اور ادھر یہ صورت تھی کہ جا بجا جنگل اور پہاڑیوں کے درمیان جہاں بھی کسی قدر مسطح خطہ ملا وہاں گاؤں والوں نے درخت کاٹ دیئے اور جھاڑ جھنکاڑ صاف کر کے کھیتی شروع کر دی تھی — اس طرح ایک کھیت کہیں تھا — دوسرا اس سے دور — درمیان میں ایسا جنگل کہ دونوں کھیتوں کے مابین کوئی رابطہ قائم نہ رہ سکے — یہ صورت حال شیر کی آدم خوری کے لیے نہایت موزوں اور زراعتی کاموں کے لیے نہایت خطرناک تھی — ان ہی کھیتوں میں سے اس آدم خور کو کم از کم گیارہ شکار ہاتھ آئے تھے۔

جنجالی کی آبادی اس وقت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وجہ سے کہ آس پاس کے وہ کسان جو جا بجا جنگلوں میں بس گئے تھے۔ آدم خور کی تباہ کاریوں سے عاجز آ کر اپنی زمین ترک کر کے جنجالی میں آ بیٹھے تھے تاکہ زندگی تو باقی رہے۔ یہاں انھوں نے حسب عادت جنگل کو کسی کسی جگہ صاف کر کے کھیتی شروع کر رکھی تھی۔ ندی کی قربت کی وجہ سے جنجالی

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کی زرعی زمینیں زیادہ بارآور تھیں۔

ضلعدار کا وہاں قیام تو نہیں رہا تھا — کبھی کبھی آنا ضرور تھا۔ تھانیدار مسلمان اور نمازی پرہیزگار آدمی تھا اور وہی اس مقام کا سربراہ۔

ہمارے قیام کے لیے ضلعدار کا مکان کھول دیا گیا کیونکہ اس عمارت کو ریسٹ ہاؤس بھی کہا جا سکتا ہے — قیام کے لیے اچھی جگہ تھی — پہاڑ سے بالکل قریب آبادی سے کسی قدر بلندی پر واقع —

بہار کا زمانہ تھا اس لیے چاروں طرف شادابی ہی شادابی تھی۔ درخت خوب گھنے سبز اور پھل پھول سے لدے ہوئے۔ جھاڑیاں بھی شاداب اور جہاں بھی زمین مٹی کی تھی وہاں خوب لہلہا کر سبزہ نکل رہا تھا — اس علاقے کے درخت بھی تناور اور گنجان تھے۔ سال کے درخت زیادہ نظر آئے — لیکن املی، کیتھ، نیم، برگد اور پیپل بھی جابجا نظر آتے رہے — بانس کے جنگل بھی کہیں کہیں ایسی جگہوں پر نظر آئے جہاں کسی قدر ڈھلان اور پانی کی قربت رہی ہو۔ کھیتوں میں گندم، جوار اور باجرہ کاشت کیا گیا تھا اور فصلیں نکل آئی تھیں۔ ان کھیتوں پر نیل گائے اور دوسرے چرندے بھی خوب حملے کر کے تباہی پھیلاتے ہیں اور کسانوں کو ان آفات سے بھی نمٹنا ہوتا ہے — نیل گائے تو جس کھیت میں گھس جائیں اس کو کاملاً تباہ کر دیتے ہیں اگر ان کا منڈا دس پندرہ جانوروں پر مشتمل ہو تو رات بھر میں عام رقبے کا ایک معمولی کھیت غرق کر دیتے ہیں۔ ان سے کھیتوں کو بچانے کے لیے مختلف تدابیر کے علاوہ کتے۔ یا خود کسان کی کھیت کے قریب ساری رات موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ جن کھیتوں میں اس وقت فصلیں تھیں، ان میں دیہاتیوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی تھی۔ جو تمام رات جاگ کر آگ روشن رکھتے اور شوروغل بھی کرتے رہتے تاکہ چرندے دور رہیں۔ دو چار خارش زدہ کتے بھی اس کام میں شریک تھے۔

کتا اچھا خاصا کارآمد جانور ہے انسان کا بہترین وفادار دوست، لیکن افسوس کہ بعض اہم مصلحتوں کی بنا پر اسلام نے اس کو نجس قرار دے دیا — جو یقیناً اچھا ہی ہے۔ اب یہ کہ اصحاب کہف کا کتا تو نہایت پاکیزہ اور خوش نصیب کتا ہے جو تاریخ کا ایک

کردار بن گیا — اسی کی نسل کے باقی کتے مطعون و ملعون ہوئے۔

رات کے گیسو سمٹ گئے تو — صبح کی جبین سعادت پُرنور جلوہ فگن ہونے لگا۔ ہوا نہایت پاک صاف اور فرحت بخش تھی — صبح سویرے بیدار ہونے والے پرندوں کے نغموں سے فضا معمور ہوئی تو ماحول میں نغمگی سی پیدا ہو گئی۔ اور اس نغمگی کے دوران مویشی کے بولنے کی آوازیں یوں لگتی جیسے آرکسٹرا کے تسلسل میں کوئی آرگن بجا دیا جائے۔

دیہات اور جنگل کا پرسکون ماحول شہروں کی اس گہما گہمی سے کتنا مختلف ہوتا ہے زندگی دونوں جگہ اپنی ساری جدوجہد کے ساتھ مصروف عمل ہے لیکن دونوں جگہ کا ماحول تقریباً ایک دوسرے کے برعکس ہوتا ہے۔

میں فجر کی نماز پڑھ کر شکاری لباس زیب تن کر رہا تھا — میر صاحب کے خادم ہیرن — نے باورچی خانے کو گرم کر رکھا تھا اور اس کے برتنوں سے فساد کی آوازیں بھی ماحول کی نغمگی کا جزو بنتی جا رہی تھیں — مجھے گمان ہوا کہ میر صاحب محو خواب ہوں گے ویسے بھی ان کو ساتھ لے جانا میرے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ وہ شکاری تو کہے جا سکتے ہیں لیکن شیر کا شکار ان کے لیے مفید نہیں۔ یہ خود ان کو بھی معلوم ہے۔

میں نے اپنی رائفل اٹھائی — کارتوس چیمبر میں لگا دئے — اور گھوما تو سامنے میر صاحب آتے نظر آئے — وہ بھی شکار پر جانے کے لیے کاملاً آمادہ — برجز — لانگ بوٹس جو صد بار زدگی رہے ہوں گے۔ خاکی بش کوٹ ہاتھ میں رائفل۔

"میر صاحب —" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔!"

"حضرت — کیا بولتے —" انھوں نے نہایت مسرت کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ آپ کہاں جا رہے ہیں — ؟"

"تمھارے ساتھ —"

میں نے رائفل میں سے کارتوس نکال کر ایک طرف رکھی — ٹوپی اتار دی — بش شرٹ کے بٹن کھولنے لگا۔

"حضرت — کچھ بھی کر دو — میں تو ساتھ جاؤں گا — آج نہ جاؤ — کل — پرسوں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں تو ساتھ جاتا حضرت۔

ہم دونوں کی باتوں سے فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ذرا دیر بعد جب میں جنگل جانے کے لیے نکلا تو میر صاحب ساتھ چلے اور میرے پاس ایسی کوئی ترکیب نہیں تھی کہ ان کو جانے سے روک سکتا۔ ان کے علاوہ گاؤں کا ایک نہایت مضبوط و بلند قامت جوان۔ راوا۔ بھی تھا جس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ میرا شکاری تھیلا، ٹنا ٹے، گن اور پانی کی بوتل بھی لے کر چلے علاوہ ازیں ہماری راہ نمائی کے فرائض بھی انجام دے شکار میں اگر کوئی ایسا آدمی ساتھ ہو جو مقامی حالات اور جنگل کے راستوں کے علاوہ ندی نالوں، کھوہ اور غاروں سے واقفیت رکھتا ہو تو کام میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اس علاقے میں ہمارے وارد ہونے سے صرف دس روز پہلے ہی شیر نے ایک بوڑھے کو پکڑا تھا۔ یہ خبر اخبار میں تاخیر سے شائع ہوئی اور میں نے بھی پڑھی جس کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ یہ بات میرے لیے تعجب خیز تھی۔ اس لیے کہ شیر کبھی نہ کوئی بوڑھا، لاغر اور بیمار جانور شکار کرتا ہے نہ آدمی۔ جس طرح قصاب ایک نظر میں ہی جانور کی صحت، عمر اور خوبی کا اندازہ کر کے عمدہ جانور کا انتخاب کرتا ہے اسی طرح شیر بھی اپنی غذا کے معاملے میں محتاط ہے اور ہمیشہ ایسے جانور کا انتخاب کرتا ہے جس میں صرف چمڑا اور ہڈیاں ہی نہ ہوں بلکہ لذت دینے والا گوشت بھی ہو۔ بڈھے آدمی۔ اور وہ بھی دیہات کے بڈھے آدمی میں۔ گوشت تو برائے نام ہی رہا ہوگا۔

پھر شیر نے اس کو کس سبب سے پکڑا۔؟!

لطف یہ کہ اس بڈھے کی ہڈیاں گڈیاں بھی نہیں ملیں، بالعموم شیر کا شکار ہونے والے کی لاش کے بچے کھچے حصے، سر، ہڈیاں، وغیرہ مل جاتی ہیں۔ کبھی کبھی اگر جنگل کے دوسرے مردار خور جانور ضیافت نہ اڑائیں تو ادھ کھائی لاش بھی مل جاتی ہے، مگر ان بڑے میاں کا تو کچھ بھی دستیاب نہیں ہوا۔ گویا شیر ان کی ہڈیاں اور کھوپڑی کھا گیا۔

گاؤں سے نکل کر۔ راوا۔ ایک نالے کے کنارے کنارے ہو لیا۔ اور سب سے پہلا جانور جو ہم نے اس روز دیکھا وہ ایک زبردست نر سور تھا۔ ہماری جگہ اگر کوئی

عیسائی شکاری ہوتا تو یقیناً سور کو سجدہ کرتا۔ اور اس کے دیدار کو اپنی کامیابی کا شگن سمجھتا۔ لیکن وہی جانور جو عیسائی کے لیے مبارک ہے، مسلمان کے لیے نحس ہے۔ مجھے بارہا تجربہ ہوا ہے جس بار میں نے صبح صبح اس گندے جانور کو دیکھ لیا اس روز تمام دن حسب معمول محنت اور کوشش کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ میں اس منحوس کو دیکھتے ہی اپنے پروگرام میں تبدیلی کر چکا۔ شیر کا نشان نہ ملنے کا یقین ہونے کے ساتھ ہی میں نے سوچ لیا کہ کم از کم اس روز کچھ ایسے مقامات کا تعین کر لوں جہاں جلدی ہی گارا۔ یا کھلا گا۔ باندھا جا سکے۔

اس روز صرف یہی کام ہوا۔

شام کو میں نے میر صاحب سے کہا۔

"بھائی میر صاحب۔ کسی طرح کم از کم دو جانوروں کا انتظام کر دو۔ جو میں شیر کو کھلا سکوں۔"

"حضرت صبح انتظام ہو جائے گا۔"

"شکریہ۔"

"بھینس ہو یا کچھ اور حضرت۔"

"بھینس۔ گدھا۔ گھوڑا۔ کچھ بھی ہو۔"

"اگر کچھ نہ ملے حضرت۔ تو بندہ حاضر۔"

میر صاحب بولے

"ہاں۔ تم کو تو شیر کھائے گا بھی نہیں۔ تمہارا گوشت کڑوا ہوگا۔"

میر صاحب ہنسنے لگے۔

صبح میں گشت کے لیے تیار ہو کر نکلا تو بڑی اطمینان بخش خوشخبری سنی، میر صاحب بدستور محو استراحت تھے، غالباً گذشتہ روز کا بیس پچیس میل کا گشت ان کے ذوق شکار پر خاصا حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا میں اس روز راوا کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ تنہا شکار میں بے انتہا خوبیاں ہیں، جبکہ نقص صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

اگر دوران شکار کوئی حادثہ ہو جائے تو مدد کوئی نہیں مل سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور مدد پر اعتماد کرنا بھی نہیں چاہیئے۔

میں گاؤں کے کھیتوں کی طرف نکلا — یعنی شمال کی طرف — کھیتوں کے درمیان جو حد فاصل ہوتی ہے اس کو یہ لوگ مینڈ کہتے ہیں — میں مینڈ پر ہی چلتا رہا — ان ہی پر جگہ جگہ اچھے بڑے اور گھنے درخت بھی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ رقصاں تھے — کہیں کہیں جھاڑیاں بھی تھیں — کھیتوں میں لوگ اپنے کاموں میں مشغول نظر آئے لیکن تنہا کوئی نہیں تھا۔ ہر جگہ کم از کم چار آدمی ضرور تھے جن میں سے کم از کم دو آدمی نگرانی پر مامور تھے — اور مسلح —

عام طور سے شیر کسی ایسے شخص پر حملہ نہیں کرتا جو ہوشیار ہو — آدم خور کو تو نظریں پہچاننے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے وہ ایسے کسی شخص کے نزدیک نہیں آتا جو اس سے مقابلے کے لیے آمادہ ہو — غالباً اس کو اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ ہونے والے حادثے کا علم ہوتا ہو گا —

قصہ یوں مشہور ہے کہ ایک شیر نے اپنے نوجوان بیٹے کو نصیحت کی کہ دنیا میں صرف انسان سے بچنا ضروری ہے، اور کسی سے قطعاً خوف کی ضرورت نہیں — نوجوان نے سوچا آخر دیکھنا تو چاہیئے کہ انسان ہے کیا شئے۔ جس سے دور رہنے کی نصیحت اس شد و مد کے ساتھ کی گئی ہے — اور وہ انسان کی تلاش میں چل پڑا — پہلے اس کی ملاقات گھوڑے سے ہوئی — جس کی تیز رفتاری — متناسب قامت اور کنوتیاں بدن نا بڑا مرعوب کنندہ تھا۔ شیر نے اس کو سلام کیا اور کہا کہ اے حضرت انسان آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی — گھوڑا ہنس کر بولا — میں بھلا انسان کہاں — میں تو اس کا غلام ہوں۔ شیر کو تعجب ہوا — پھر تلاش میں نکلا تو اونٹ ملا اس سے بھی یہی سوال و جواب ہوا۔ آگے چلا تو ہاتھی ملا — اس سے بھی یہی معاملہ رہا۔

آخر میں ایک جگہ اس کی ملاقات انسان سے ہو ہی گئی — یہ ایک بڑھئی کا لڑکا تھا جو ایک شہتیر کو آرے سے چیر رہا تھا۔ جتنا حصہ چیرا جا چکا تھا اس میں اس نے

لکڑی کی میخیں لگا رکھی تھیں۔ شیر نے اس لڑکے سے بھی سوال جواب کیا — اور یہ معلوم کر کے کہ وہ انسان ہے اس کو خوب ڈرایا دھمکایا — لڑکے نے اس سے کہا تم شہ زور جانور ہو۔ میری مدد کر دو — شیر تو اور پھول گیا — بولا بتاؤ — لڑکے نے کہا یہ شہتیر مجھ سے نہیں کٹ رہا ہے — ذرا اس دراڑ میں پنجے ڈال کر اس کو چیر دو — شیر نے مسکرا کر بڑے غرور کے ساتھ کہا — بس اتنی سی بات — ابھی لو — اس نے بڑھ کر شہتیر کی دراڑ میں پنجے پھنسا کر جو زور کیا تو لکڑی ذرا سی پھیلی اور جو میخیں لڑکے لگائی تھیں وہ نکل گئیں۔ شہتیر کے دونوں حصے مل گئے اور شیر کے پنجے اس میں پھنسے کے رہ گئے۔ شیر تو تکلیف اور درد سے تڑپ گیا۔

اس قصے میں حقیقت وغیرہ تو خیر ہے نہیں لیکن جو بات اس سے سمجھائی گئی ہے وہ نہایت خردمندانہ ہے۔

تو آدم خور شیر اس راز سے واقف ہوتا ہو گا — یہی وجہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت میں حملہ نہیں کرتا جب وہ ہوشیار ہو — جانتا ہے اگر اس حال میں سامنے آ گیا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا — اس لیے صرف دھوکے سے ہی مارتا ہے۔ چھپ کر حملہ کرتا ہے غفلت میں وار کر جاتا ہے۔ غفلت تو یوں بھی بری عادت ہے اور زندگی کے ہر موقعے پر غفلت کرنے والا نقصان میں رہتا ہے۔

کھیت جس جگہ ختم ہوئے وہاں سے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کا ملا جلا کنج سا بن گیا ہے، کچھ جنگل کی خود رو بیلوں نے بھی جھاڑیوں کو اپنے شکنجے میں لیکر گھنا کر کے ان کے گرد جال بن دیا ہے — مجھے بتایا گیا کہ بڈھے کو ان ہی جھاڑیوں میں سے شیر نے اس وقت پکڑا جب وہ حوائج ضروری سے فراغت کے لیے آڑ میں گیا۔ چنانچہ میں بھی ان جھاڑیوں میں گھسا — مجھے کسی ایسے نشان کی تلاش تھی جو میرے شکوک و شبہات کو یا تو دور کر دے، یا قوی کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس بڈھے کی ہلاکت کا قصہ مشکوک معلوم ہوا۔ شیر ساٹھ سال سے اوپر عمر کے بڈھے کو ہرگز نہیں پکڑ سکتا — پھر مجھے ضمناً یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بڈھے کا کچھ رشتے داروں سے زمین کی ملکیت کے سلسلے میں خاندانی تنازعہ تھا — اور یہ کہ اس کی

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

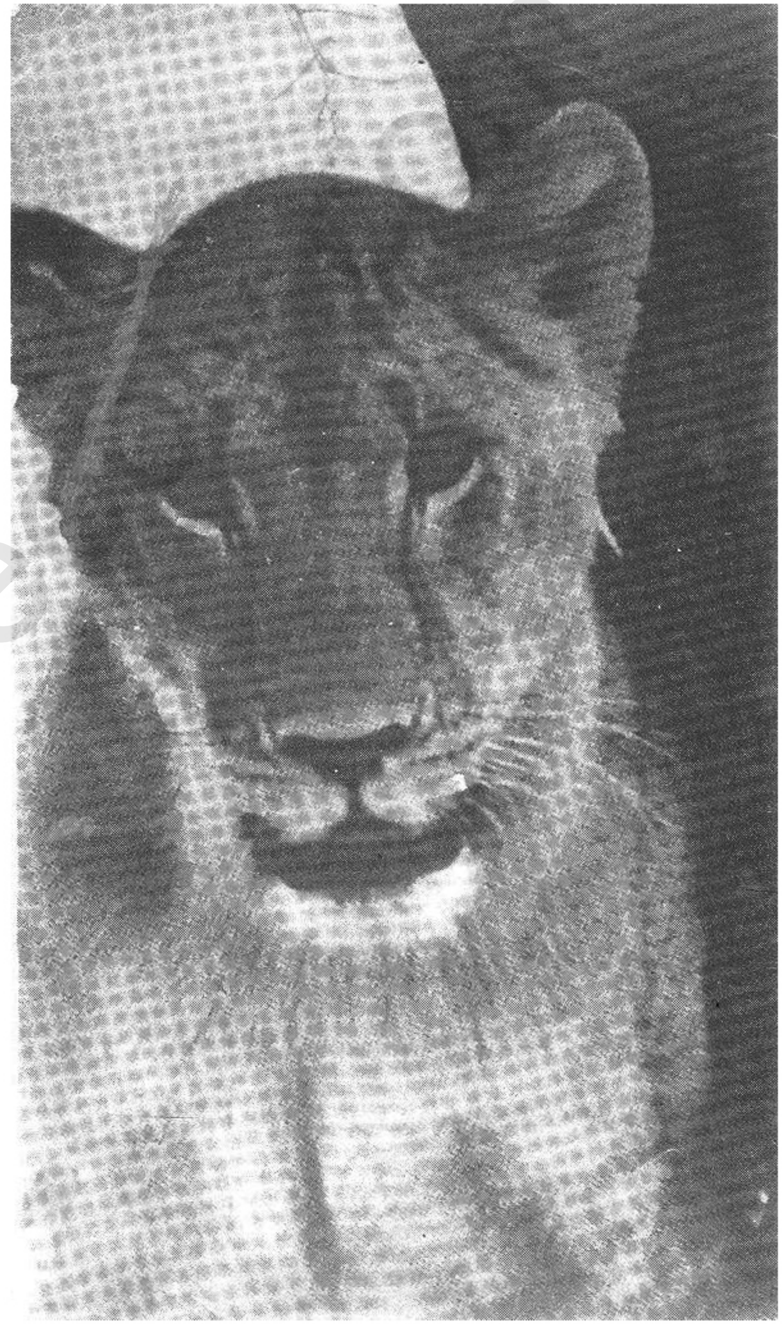

موت کے بعد ان مخالف رشتے داروں نے بڈھے کے وہ میں کھیت جو ندی کے ساتھ ساتھ ہیں دبا لیے۔ زمین کے لیے بڑے بڑے فساد ہوتے ہیں۔ جتنی بڑی بڑی جنگیں لڑی گئیں سب زمین ہی کے لیے تو تھیں۔

جھاڑی میں گھس کر نشانات تلاش کرنے کا کام میں نے خاصے وقت میں انجام دیا۔ ایک جگہ بڈھے کی دھوتی یا پگڑی، یا چادر۔ کسی کپڑے کی دھجی کانٹے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی لٹھیا بھی جوں کی توں پڑی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ کہ زمین پر کوئی نشان نہیں تھا۔ پھر اس گنجان جگہ سے نکل کر میں نے تقریباً نصف گھنٹہ مزید صرف کیا کہ نزدیک سے اور کوئی نشان نظر آئے۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور مجھے اس وقت کسی کے دو شعر یاد آئے۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا قیام ہوتا ہے

پھر بڈھے کی دھوتی کی صرف ایک ہی دھجی کیوں۔ اور بھی دھجیاں ہونا چاہیے۔ وہ جھاڑیاں ہی ایسی تھیں۔

میں اسی رخ سے جنگل میں داخل ہو گیا۔ ادھر درختوں کی کثرت ہے اور درخت ایسے جو آسمان کو چھو رہے تھے۔ شادابی کا یہ عالم کہ پتے ایک دوسرے سے یوں گلے لگ گئے تھے جیسے ڈرتے ہوں اگر الگ ہوئے تو پھر ایسے بچھڑیں گے جیسے فیض نے کہا ہے۔

اب کے بچھڑیں گے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

ایک گھنٹہ ہوشیاری، احتیاط اور تجسس کے ساتھ جنگل میں ٹہلتا ہوا میں گاؤں سے چار پانچ میل تو ضرور نکل آیا ہوں گا۔ اتنا فاصلہ جنگل ہی جنگل تھا۔ البتہ کہیں کہیں

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

گھاس کے قطعے بھی تھے، اور بعض مقامات پر بڑے بڑے پتھر بھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پتھر عین وسط جنگل میں کس طرح پہنچے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پچاس ساٹھ لال منہ کے بندروں کا ایک جتھا میرے ساتھ گرم سفر تھا۔ میں بڑی دیر سے یہ محسوس کر رہا تھا۔ نزدیک تو وہ نہیں آئے لیکن ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ مجھ سے نزدیک ترین بندر کوئی بیس گز پر رہا ہوگا۔ سارے ہی زمین پر، اور پھیلے ہوئے۔ ان کے انداز سے کسی قسم کی جارحیت یا خوف بھی عیاں نہیں تھا۔ لیکن میں جنگل کے کسی ایسے جانور پر قطعی اعتبار نہیں کرتا جو ذرا بھی مضرت رسانی کی اہلیت رکھتا ہو۔ اتنے بہت سے بندر اگر شرارت پر آمادہ ہو جائیں تو خاصی دشواری پیش آسکتی ہے۔

میں نے فی الفور تو کوئی اقدام نہیں کیا۔ صرف ان کی نقل و حرکت کو کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اور چلتا رہا۔ البتہ اس غول بیابانی کا جلو میں ہونا میری حفاظت کے نقطۂ نظر سے بہت سودمند تھا۔ شیر اگر آ بھی جائے۔ تو کم از کم اس سمت سے حملہ نہیں کر سکتا۔ یا اگر آس پاس بھی آجاتا تو بندر ضرور دیکھ کر خوف کی آواز کرتے اور بھاگتے۔ میں لکھ چکا ہوں گو شیر بندر کو نہیں پکڑتا۔ لیکن بندر کی تو روح فنا ہوتی ہے شیر سے بھی اور چیتے سے بھی۔

آخر اس جنگل کا سرا آگیا۔ یہاں ایک نالہ شرقاً غرباً رخ پر واقع تھا۔ گہرائی بھی پانچ چھ فٹ اور وسعت یعنی چوڑائی بارہ پندرہ فٹ رہی ہوگی۔ کنارے بیشتر پتھریلے اور چٹانی تھے۔ میں نے کنارے پر کھڑے ہو کر دونوں طرف دیکھا۔ کسی جگہ نالہ پار کرنے کے لیے مناسب مقام بظاہر نہیں تھا۔ پھر یہ کہ دور تک دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ چالیس پچاس گز کے بعد نالہ جنوب کی طرف گھوم گیا تھا۔ میں نے گھوم کر عقب میں دیکھا۔ بندر موجود تھے اور اطمینان سے جا بجا زمین پر بیٹھے کچھ تو ایک دوسرے کے بالوں میں سے جوئیں چن چن کر کھا رہے تھے، کچھ اِدھر اُدھر کھانے دانے کی فکر میں تھے۔

مجھے یقین ہے کہ شیر اس اطراف میں نہیں تھا۔

میں نے نالے کے اندر جھانکا۔ کچھ نہیں تھا۔ ایک مقام پر جہاں دونوں طرف کے کنارے کسی قدر مناسب تھے۔ میں نالے میں اترا۔ اور نہایت سبک خرامی کے ساتھ دوسری طرف چڑھ گیا۔ الحمدللہ کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

دوسرے کنارے پر آتے ہی محسوس ہوا کہ وہ پہاڑی کا دامن ہے۔ چھوٹے بڑے پتھر۔ مٹی اور ریت، اور بیچ میں چھوٹی بڑی پہاڑی کانٹے دار جھاڑیاں۔ درخت کم اور چھوٹے۔ زمین نسبتاً بلند ہوتی گئی اور میں بڑھتا رہا۔ بندروں کا جتھا دوسرے کنارے پر ہی رہ گیا۔

سامنے نظر کی تو پہاڑ۔ دائیں طرف بلند تر پہاڑ۔ بائیں جانب نالہ جو پہاڑی کے دامن کے ساتھ گویا اس پہاڑی کے گرد گھوم گیا تھا۔ لہٰذا میں سیدھا اوپر ہی چڑھتا گیا۔ وہاں کوئی آڑ یا کمین گاہ نہیں تھی۔ جا بجا کچھ چٹانیں ضرور تھیں مگر اتنی بڑی نہیں کہ ان کے پیچھے شیر چھپ سکتا۔

اگرچہ شیر کمین گاہ میں بیٹھنے کا زبردست ماہر ہے۔ اپنے سر کے برابر حجم کے پتھر کو آڑ بنا کر ایسا دبکتا ہے کہ نظر نہیں آتا۔ اتنا چھوٹا گڑھا جس کے متعلق گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اس میں کوئی جانور بیٹھ سکتا ہے اس میں بھی شیر دبک جاتا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ۔

میں آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے اس چھوٹی پہاڑی چوٹی پر چڑھنے میں بیس منٹ لگے۔ لیکن سست رفتاری صرف سانس پھولنے سے بچنے کے لیے تھی۔ پہاڑی پر چڑھنے سے قلب کی حرکات کا تیز ہو جانا اور تنفس کا اسی مناسبت سے بڑھنا ایک قدرتی عمل ہے۔ سانس پھولا ہوا ہو تو ایسی حالت میں نشانہ لینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں احتیاط کر رہا تھا۔ اور آخر کار چوٹی پر پہنچ گیا ایسی حالت میں کہ اگر اچانک فائر کرنا ہوتا تو میں آمادہ ملتا۔

پہاڑی چوٹی سطح مرتفع تھی۔ کوئی سو گز تک اسی طرح میدانی کیفیت، اس کے بعد جنگل اور پہاڑی جو اس پہاڑی سے بھی بلند تھی جس پر میں کھڑا تھا۔ البتہ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں جس پہاڑی پر تھا وہ ننگی تھی اور سامنے جو بلند تر پہاڑی تھی وہ سبز درختوں کا دلکش لباس پہنے۔

مجھے پہاڑی پر چڑھتے اور حرکت کرتے تو ہر وہ جانور دیکھ چکا ہوگا جو اطراف میں رہا ہو۔ اگر شیر کہیں ہوگا تو اس نے بھی دیکھ لیا ہوگا۔ وہ پہاڑی کا دامن جس پر سے گذر کر میں اوپر بیس منٹ میں آیا تھا، بالکل کھلا ہوا تھا۔ یہاں سے میں نے گھوم کر نیچے اس خطے پر نظر ڈالی جس سے ابھی میں گذر رہا تھا۔ کوئی سو گز نشیب ضرور ہوگا۔ نالہ صاف نظر آتا تھا مگر وہاں سے اس کی وسعت بہت حقیر معلوم ہوتی تھی۔ بلندی پر پہنچنے کے بعد پستی کی چیزیں حقیر سی نظر آتی ہیں۔ اس کو فریب نظر کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس صورت حال میں حقیقت نہیں ہوتی۔

میں اس جگہ ایک بڑی چٹان سے ٹک کر کھڑا ہو گیا اور چند منٹ کھڑا رہا تاکہ جسم پر پہاڑی چڑھنے کا جو کچھ بھی اثر ہوا ہے وہ زائل ہو جائے تاہم میری نگاہوں سے کوئی ایسی جگہ پوشیدہ نہیں تھی جہاں شیر کے موجود ہونے کا شبہ ہو۔ دراصل اس مقام سے چاروں طرف پچاس ساٹھ گز تک کوئی ایسی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ ذرا دیر بعد میں سطح مرتفع سے گذر کر اس پہاڑی دامن کے جنگل میں داخل ہو گیا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس پہاڑی پر درخت تو نہیں تھے لیکن خوب گنجان جھاڑیاں تھیں۔

اور میں جنگل میں داخل ہوا ہی تھا کہ نیل گائیوں کا ایک منڈا مجھے دیکھ کر بھاگا۔ اور سیدھا سطح مرتفع سے گذرتا نالے کے مخالف سمت میں اترا چلا گیا۔ غالباً تیس چالیس جانور رہے ہوں گے۔ نیل گائے بڑا ہی شکم پرور جانور ہے۔ رات دن کھائے جاتا ہے اور اس تیزی سے ہضم کر کے دوبارہ غذا کی فکر میں لگ جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو اس کے شکار کی طرف متوجہ کرے۔ نہ اس کی کھال اچھی ہوتی ہے، نہ سینگ ہی ٹرافی کے زمرے میں آتے ہیں۔ نہ اس کو مارنا ہی لازمی ہے۔ حتیٰ کہ گوشت بھی بے لذت اور موٹا ہوتا ہے۔ میں نے نیل گائے بہت کم شکار کیا ہے اور جو دو چار دفعہ مارا بھی وہ اپنے کیمپ والوں

کے لیے یا گاؤں والوں کے لیے گوشت مہیا کرنے کے مقصد سے۔ ایسی حالت میں کہ ان ہی جنگلوں میں چیتل، چکارا، جنگلی بکری، مینڈھا۔ پاڑا وغیرہ بہ آسانی ملتے ہوں وہاں نیل گائے کون مارے گا۔ اور میں تو ویسے بھی بے ضرورتاً کسی جانور کو کبھی نہیں مارتا صرف گوشت کھانے کے لیے جانور کو ہلاک کرنا میرے مقاصد میں ہرگز شامل نہیں رہا۔ جس قدر مصارف شکار پر ہوتے ہیں اس کے چوتھائی سے بھی کم رقم میں شہر میں ہی کئی جانور خریدے اور خوب گوشت کھایا جا سکتا ہے۔

جنگل میں درختوں کی ایک گھنی قطار سی دور تک چلی گئی تھی۔ اس کے بعد پھر کھلی جگہ تھی۔ میں اس جنگل کے کنارے پہنچا تو سامنے، بلندی پر۔ ایک نہایت خوبصورت سانبھر بے فکری کے ساتھ کھڑا جھاڑیوں کی کونپلیں چن کر کھا رہا تھا۔ اس کے سینگ بھی نہایت خوبصورت تھے اور منظر بھی نہایت دلکش۔ افسوس کہ اس وقت میرے پاس اتنا اچھا کیمرہ نہیں کہ میں فوٹو کھینچ سکتا اگلے صفحے پر جو فوٹو ہے وہ میرا کھینچا ہوا نہیں۔ اور اس خاص جانور کا بھی نہیں۔ لیکن میں نے جس منظر میں سانبھر دیکھا تھا، اس کا کسی قدر تاثر اس فوٹو سے پیدا ہو سکتا ہے۔

میں نے ایک شاخ پر رائفل کا کندہ آہستہ سے مارا۔ سانبھر نے سر اٹھا کر آواز کی طرف اور چشم زدن میں ہی بھاگ لیا۔

آہستہ آہستہ میں نے پہاڑ کی چوٹی بھی سر کر لی۔ اس کے بعد نشیب تھا اور گھاٹی سی بن گئی تھی بلکہ وادی کہنا چاہیئے کیونکہ اس کی وسعت خاصی تھی۔ یہاں بھی درخت کم، سبزہ زار زیادہ تھا۔ اور اس سبزہ زار میں ہرنوں کا ایک بڑا منڈا سکون کیساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کا بافراغت وہاں موجود ہونا شیر کی عدم موجودگی پر دلالت کرتا تھا۔ درختوں پر جو کچھ بھی دو چار پرندے تھے ان کے اطمینان سے بھی خطرے کی عدم موجودگی ظاہر ہوتی تھی۔

میں وہاں دو ہی لمحے رکا تھا دو عدد کوّے نہایت ترش و تلخ آواز میں شور کر کے میرے گرد منڈلانے لگے۔ میں نے ہاتھ ہلا کر ان کو بھگانے کی کوشش

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

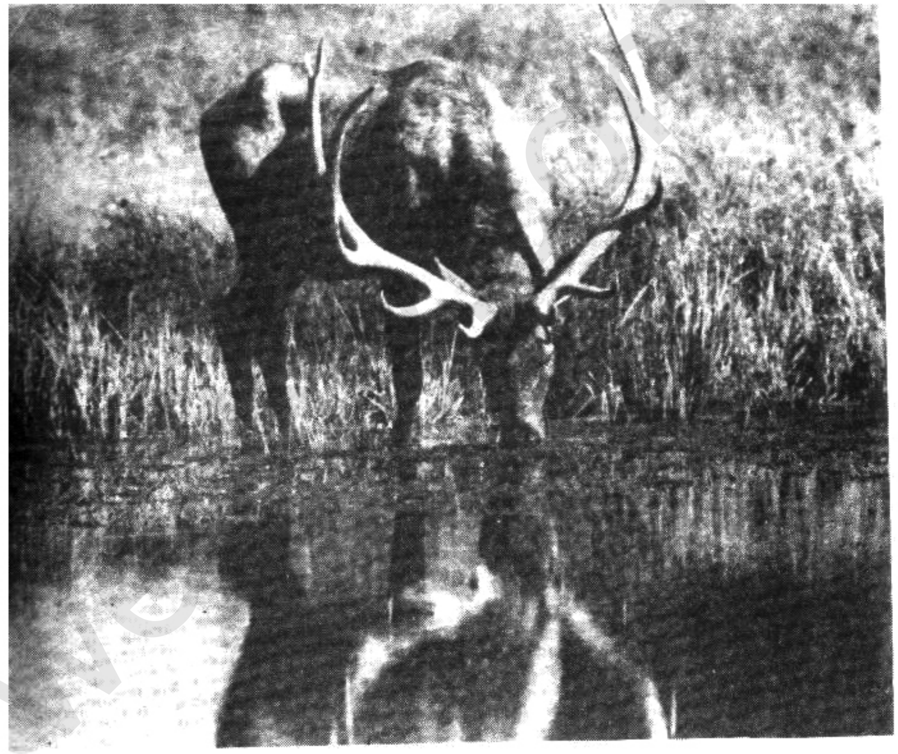

سانبھر

کی۔ رائفل دکھا کر ڈرانے کی سعی کی لیکن انہوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور ایسا معلوم ہوا کہ ان حرکات نے ان کو مزید برافروختہ کر دیا۔ چنانچہ میں وہاں سے ہٹ کر ایک دوسرے درخت کے سائے میں آگیا۔ یہاں بھی انھوں نے میرا تعاقب کیا۔ اور ایسا بری طرح شور کیا ہوا تھا کہ سارا جنگل سر پر اُٹھا لیا۔ ہرن جو گھاس کھانے میں با اطمینان مشغول تھے ان کی آوازوں سے چوکنا ہو کر کسی اور طرف بھاگ لیے۔

ابھی میں ان کوؤں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں ہی تھا کہ کسی نزدیکی درخت پر سے چار پانچ پہاڑی مینائیں بھی آگئیں اور جس درخت تلے میں

متمکن تھا اسی کی ایک شاخ پر جم کر شور شروع کر دیا۔ گویا کوؤں کے کورس میں مینائیں بھی شامل ہو گئیں۔

میں نے چھوٹا پتھر زمین سے اُٹھا کر ان کی طرف پھینکا۔ مینائیں اُڑیں اور نزدیک ہی کی دوسری شاخ پر بیٹھ کر شور کرنے لگیں۔

آوازیں کوؤں کی بھی کرخت ہوتی ہیں۔ اور میناؤں کی بھی خصوصاً اگر جنگل کی تنہائی اور سکوت میں ہوں تو ان کی تلخی اور سمع خراشی بدرجہا شدید ہوتی ہے میں تو ویسے بھی مترنم شاعر ہوں اور کرخت آواز میری ترنم شناس سماعت پر بار ہوتا ہے کوؤں کی کائیں کیسے اچھی لگے گی۔

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو جن میں پیا ملن کی آس

اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں ان کو نظر انداز کر کے اپنی پیشقدمی جاری رکھوں۔ چنانچہ میں وہاں سے بتدریج گھاٹی میں اتر گیا۔ کوّے اور مینائیں میرے ہمراہ تھے۔ سبزہ زار سے گذرنا کچھ اتنا مستحسن نہیں لیکن میں نے ابھی ابھی وہاں ہرنوں کو پھیلے دیکھا تھا اس لیے بے خطر کسی قدر تیز قدموں سے چلتا سبزہ زار سے گذر کر درختوں کے سائے میں چلا گیا۔

افسوس کہ جلوس ساتھ تھا۔

میں نے سیدھا گھنے جنگل کا رخ کیا اور ایسی جھاڑیوں میں گھس گیا جہاں بالعموم نہیں جانا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر کوّوں اور میناؤں سے نجات مل گئی۔ میں نے اطراف پر نظر ڈالی۔ جھاڑیاں خوب گھنی تھیں، اور چوٹی سے جڑ تک پتیوں میں لدی ہوئی۔ اوپر کچھ بیلیں پھیل گئی تھیں جن کی وجہ سے نہ صرف گنجانی بڑھ گئی تھی بلکہ سایہ بھی ہو گیا تھا۔ اور میں نے زمین پر نظر کی تو پاگھ۔

شیر کے پنجوں کے واضح نشانات، اور ان نشانات سے صاف معلوم ہوتا تھا وہ ذرا ہی دیر پہلے وہاں بیٹھا رہا ہو گا۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ان جھاڑیوں سے نکل کر نسبتاً کھلی جگہ پر آ گیا، ہر طرف بغور دیکھ کر اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ شیر اطراف میں ہے یا نہیں۔ نزدیک یا آس پاس ایسی جگہ نہیں تھی جس کے بارے میں اطمینان کیا جا سکتا ہو۔ جنگل کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ شیر کسی جگہ بھی چھپا ہو سکتا تھا۔ جھاڑیاں ہر طرف تھیں۔ چٹانیں بھی تھیں، دراڑیں بھی ہوں گی۔ میں نے اس وقت اپنے کو ایک اضطراری حالت میں محسوس کیا۔ دفاع کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہے ان میں سے صرف رائفل میرے پاس تھی۔ جبکہ شیر کا پلہ اس وقت بھاری تھا۔ اس کو مجھ سے دس بارہ گز پر ہی چھپنے کے لیے بیشمار مقامات حاصل تھے، اور کہیں سے بھی حملہ کر سکتا تھا۔ میں نے پسپائی کو ترجیح دی نہایت آہستگی اور احتیاط و ہوشیاری کے ساتھ جنگل سے واپس ہوا۔ اور اس کھلے سبزہ زار میں داخل ہو گیا جہاں ہرن کچھ دیر پہلے تک تھے۔

میں نے ابھی سبزہ زار میں قدم رکھا ہی تھا کہ دونوں کوے اور مینائیں شور کرتی میرے سر پر منڈلانے لگیں۔ جیسے وہ نمودار ہونے کے انتظار میں ہی رہی ہوں۔ یہ صورت حال میرے لیے خاصی ناقابل برداشت تھی۔ لیکن میرے پاس اس کا علاج کوئی نہیں تھا۔ میں سبزہ زار کے وسط میں آ کر نہ صرف ٹھہرا بلکہ ایک مناسب جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ میرے چاروں طرف گھاس تھی اور غالباً میں اطراف و جوانب کے دیکھنے والوں کی نظر سے چھپ گیا۔ مینائیں اور کوے بھی مجھ کو اطمینان سے بیٹھتا دیکھ کر ایک طرف نکل گئے۔

میں اپنی جگہ پر سکون سے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ نزدیک ہی شیر موجود ضرور ہے اور ایسی حالت میں کہ میں چلتے چلتے یکبارگی غائب ہو گیا۔ اگر وہ دیکھ رہا ہے تو اس کو خاصی فکر ہو گی اور ممکن ہے محض تجسس اس کو سامنے آنے پر مجبور کر دے تو مجھے فائر کا موقعہ مل جائے۔ ویسے میں کسی جانب سے غافل نہیں تھا۔ یہ بات توجہ بھی تا سکتا ہے کہ شیر اگر حملہ کرنے اس وقت نہ آتا تو ہرگز سامنے اس زاویے سے

تو نہیں آتا جس سے میں آیا تھا۔ یقیناً اس کی فطری چالاکی اس کو کسی ایسی جانب سے حملے کی ترغیب دیتی جدھر سے حملے کا مجھے شبہ بھی نہ ہو۔ اسی لئے میں اس سمت کی مخالف جانب زیادہ محتاط نظروں سے نگراں تھا۔

مجھے یہ تو ہرگز نہیں معلوم تھا کہ جو کوے اور مینائیں میرے لمحات تلخ کئے ہوئے تھے وہی میرے معاون ثابت ہوں گے۔ اس طرح چھپ کر بیٹھے بیٹھے کوئی آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ میں جانتا تھا کہ شیر کہیں نہ کہیں آس پاس ضرور موجود ہے۔ دیکھ بھی رہا ہو گا۔ اور اب دونوں کے صبر و استقامت کا امتحان تھا۔ میرے دونوں پیر تقریباً سن ہوئے جا رہے تھے۔ ضروری تھا کہ میں پہلو بدلوں لیکن ذرا سی حرکت بھی اس وقت ممکن نہیں تھی۔

شیر کی نظر خاصی کمزور ہوتی ہے۔ درختوں یا جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا ہوا انسان یا جانور اس وقت تک اسے نظر نہیں آتا جب تک کوئی حرکت یا جنبش اس کی جگہ نہ بتا دے، پچاس یا سو گز سے تو قطعی انسان یا درخت میں تمیز نہیں کر سکتا۔ فاصلے سے جانوروں کو محض حرکت کی وجہ سے دیکھ لیتا ہے۔

تاہم صرف اس واہمے کے تحت شیر کے نزدیک جانا یا ایسی حالت میں بے حرکت بیٹھے رہنا جب شیر قریب آ رہا ہو کسی جاندار کے لیے ممکن نہیں۔

میں نے نہایت آہستگی اور بے آواز طریقے سے اپنا ایک پیر سیدھا کیا۔ پھر دوسرا۔ اس کے علاوہ کوئی تدبیر نہیں تھی۔ کچھ نہ کچھ حرکت تو ضرور ہوئی ہو گی۔ اور آدھا گھنٹہ گذرا۔

پھر یکبارگی ہی میرے دائیں جانب، جدھر بے شجر پہاڑی تھی اسی طرف سے کوؤں اور میناؤں نے زبردست غل مچایا۔ اور یہ خطرے کا غل تھا۔ بالکل ناقابل یقین۔ شیر کا اس طرف ہونا قطعاً بعید از قیاس۔

میں ادھر گھوما۔ مینائیں اور کوے ایک ہی جگہ پر منڈلا رہے تھے، اور یکبارگی چٹانوں کی آڑ سے شیر نکلا، اور نہایت تیز رفتاری سے کتے کی طرح

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بھاگتا سبزہ زار میں داخل ہوا۔ میں نے اسی وقت اس کا نشانہ لے لیا۔ مگر گھاس میں آجانے کے بعد وہ کبھی کبھی نظر آتا وہ بھی بس جھلک سی۔ گھاس آڑ کر لیتی مجھ سے فاصلہ چالیس پچاس گز تھا۔ وہ سیدھا جنگل کی طرف گیا اور اس تیز رفتاری سے کہ سارا فاصلہ میں رائفل سے اس کو کور کئے رہا لیکن فائر نہ کر سکا۔ اور وہ جنگل میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میناؤں اور کووں نے بھی شور غل چھوڑ کر کسی اور طرف رخ کیا۔ صرف میں گھاس میں بیٹھا رہ گیا۔

اور بیٹھا ہی رہا۔ کچھ دیر اور صبر کرنے میں مضائقہ نہیں تھا۔ یقیناً شیر کو میری

موجودگی کا قطعاً علم تھا، لیکن اس نے میری طرف رخ نہیں کیا۔ جنگل میں گھس گیا۔ ممکن ہے اس کا ایک بار پھر تاک لگانے کا ارادہ بن جائے۔ یہ کچھ بعید از قیاس بات نہیں۔ مجھے اس قسم کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا اور شیر کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا پڑی تھی۔ جس کے نتیجے میں اسی کو ترک تعاقب کر کے فرار ہونا پڑا۔

وہ ہرن جو اس سبزہ زار میں چرتے رہے تھے آہستہ آہستہ واپس آگئے اور ان کا سب سے آگے والا ہرن مجھ سے صرف تیس چالیس گز کے فاصلے تک آ کر ایک نسبتاً اونچی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دوسرے ہرن بھی نزدیک ادھر اُدھر ٹھہر کر چرنے لگے۔ ان کو اب تک نہ میری بو پہنچی تھی نہ نظر آیا تھا۔ میں بیٹھا بھی تھا اس طرح کہ گھاس میں بالکل ہی مل کر گم ہو گیا تھا۔ حرکت بھی نہیں تھی۔

اس حالت میں بھی ذرا وقت گذرا۔

میں اس وقت بغور جنگل کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک بار درخت کے تنے کی آڑ سے شیر نے سر نکالا، اور سبزہ زار کی طرف دیکھا۔ میں نے فوراً رائفل اٹھا کر نشانہ لیا۔ ہرنوں نے یہ حرکت دیکھی اور ہراساں ہو کر بے ترتیبی سے بھاگے۔ ان میں سے ایک ہرن بے تحاشا بے ترتیب حالت سے بھاگتا میرے اور شیر کے درمیان سے گذرنے کو دوڑا۔ میں نے شیر کے سر کا نشانہ لیا اور ٹریگر پہ زور بڑھایا۔ اور گولی جو رائفل سے شیر کے سر میں گھسنے کو نکلی تھی سیدھی ہرن کے شانوں میں اتر گئی۔ اتنے قریب سے چار سو پچاس ایکسپریس کی گولی کھا کر ہرن اپنی جگہ سے کوئی تین گز پیچھے گرا۔ منظر بدل گیا۔ نہ شیر تھا نہ ہرن۔ مجھے افسوس تو بہت ہوا۔ لیکن یہ صورت حال میرے قابو سے باہر تھی۔ ہرن اب بھی تڑپ رہا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ چھرا نکال کر ہرن کو حلال کیا۔ اب اس کو گاؤں لے جانے کا مسئلہ درپیش ہوا۔

جنگل میں ہرن کو چھوڑ دینا ہی اس مسئلے کا حل تھا۔ میں نے اس کو کھینچ کر ایک جھاڑی میں رکھ دیا اور اس پہ مزید گھاس پھونس ڈال دیا تاکہ محفوظ رہے اور گاؤں

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کی طرف واپس ہوا۔

رائفل کا فائر ہو جانیکے بعد اس علاقے میں کسی جانور کا ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ چہ جائیکہ آدم خور شیر۔ وہ تو نہ جانے کدھر کا کدھر نکل گیا ہوگا۔ اور عین قرین قیاس تھا کہ ہفتوں اس علاقے کا رُخ بھی نہیں کرنیگا۔ اگرچہ عام بھولے بھالے شیر اور چیتے چند گھنٹوں کے بعد فائر کی آواز فراموش کر دیتے ہیں اور اکثر اسی جگہ واپس آجاتے ہیں جہاں ان کو ڈرایا گیا ہو۔ آدم خور شیر جس علاقے میں ایک بار خطرہ سمجھ چکا ہو وہاں کافی عرصے تک واپس نہیں آتا۔

گاوں کے باہر ہی میر صاحب سر سے پاؤں تک مسلح میرے منتظر ملے۔

"حضرت مزاج تو اچھا ہوتا نا۔"

"ہاں۔ شکریہ۔"

"حضرت میرے کو صبح چھوڑ دیا۔ حضرت میرے کو کیوں نہیں جگا دیا۔؟"

"تم کو آرام کی ضرورت تھا۔

پھر میں نے ان کو سارا واقعہ بتایا۔ جس جگہ میں نے ہرن مارا تھا وہ جگہ گاؤں سے چھ میل دور تھی۔ اگرچہ میرے اندازے کے مطابق نو میل رہی ہوگی۔ بہرحال۔ راوا کی سرکردگی میں دس جوانوں کی ایک مسلح پارٹی روانہ کی گئی جو شام سے ذرا پہلے ہرن اٹھا کر لے آئی۔ اور اس کا گوشت تقسیم ہو گیا۔

میر صاحب نے ایک ناکارہ بھینسا جو قد و قامت میں نہایت فدوی تھا۔ خرید کر گارے کے لیے آمادہ کیا ہوا تھا اور اگلے روز صبح ہم گاؤں سے اس کو ساتھ لے کر نکلے۔ میں نے مشرقی سمت اختیار کی جدھر گاؤں کی آبپاشی کرنے والی ندی بھی ہے۔ جہاں اس روز گاؤں کی عورتیں با جماعت لباس شوئی میں مشغول تھیں اور چھ مسلح جوانوں کی ایک جماعت ان کی حفاظت پہ مامور برچھے لیے چوکس موجود تھی۔

میرے ساتھ میر صاحب کے علاوہ ان کا ایک ملازم۔ اس کے علاوہ

راوا اور گاؤں کے چار نہایت مضبوط جوان جن کے بارے میں یہ اطمینان بھی کر لیا تھا کہ وہ درخت پر چڑھنے میں بہت مشاق ہیں۔ ان میں سے ایک شخص ایک کھٹولہ بھی سر پر رکھے تھا۔ یہ کھٹولہ راوا نے مہیا لیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ جب لاٹ صاحب اس علاقے میں شکار کے لیے آئے تھے تو دو ہی کھٹولا ان کے لیے راوا نے درخت پہ باندھ کر مچان تیار کیا تھا۔ اور لاٹ صاحب نے اس شکار کے چھ دنوں میں دو شیر مارے تھے۔ میرے دریافت کرنے پہ اس نے بتایا کہ وہ شیر محکمہ جنگلات کے ______ لوگوں نے ایک جگہ روک کر خوب گوشت اور جانور کھلا ئے تھے۔ یہ کام لاٹ صاحب کے آنے سے تین ماہ پیشتر سے کیا گیا۔ آخر شیر اس مقام پہ غذا بافراغت مہیا ہونے کے عادی ہو کر وہیں رہ پڑے۔ اسی علاقے کے نزدیک ہی مچان بنائی گئی۔ اور جنگل کا ہانکہ کیا گیا تو ان دونوں میں سے ایک شیر نکلا جس کو لاٹ صاحب نے درخت پر سے فائر کر کے مار لیا۔ تیسرے دن دوسرا شیر بھی اسی طرح پیش کیا گیا اور وہ نہایت خوش ہو کر واپس گئے۔

لہٰذا وہ کھٹولا بڑا متبرک تھا۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا
بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ندی کے پار جنگل۔ جنگل کے پار پہاڑ۔ پہاڑ کے پار وادی۔ اور اس وادی میں درختوں کی تعداد زیادہ۔ مجھے گارا باندھ کر بیٹھنے کے لیے یہ جگہ بڑی مناسب لگی۔ گاؤں سے فاصلہ بھی تین چار میل سے زیادہ نہیں تھا۔ اور اس وادی میں چتیل بھی بکثرت نظر آئے۔ کئی جگہ ان کی مینگنیوں کے انبار بھی ملے۔ چتیل کی مینگنیاں بکری سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ جیسا صفحہ کے سامنے والی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے البتہ ذرا بڑی ہوتی ہیں۔

چتیل جن جنگلوں میں رات کو قیام کرتے ہیں وہاں شیر اور چیتے حسب ضرورت چکر لگاتے اور اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

ایک بہت عظیم الجثہ برگد کے درخت پر کھٹولا باندھ دیا گیا اور میرے حکم کے مطابق ایک شخص اس پر بیٹھ کر طرح طرح سے جنبش اور حرکات کرتا رہا۔ میں صرف یہ دیکھنا اور اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ کھٹولا کسی قسم کی چوں چاں نہ کرتا ہو۔ اسی درخت سے بیس گز کے فاصلے پر کھلی جگہ پر ایک پگڈنڈیوں کے اتصال سے چار پانچ گز ہٹ کر بھینسے کو نہایت مضبوطی سے باندھ دیا گیا۔ اس مقام پر کسی مناسب شئے کی عدم موجودگی کی وجہ سے لکڑی کا ایک مضبوط کھونٹا گاڑنا پڑا۔ جو خاصا مضبوط تھا۔ رسا بھینسے کے پیر میں باندھا گیا۔ اس کے بعد آس پاس کی زمین درخت کی ایک ہری شاخ کے ذریعے برابر کر دی گئی۔ اور ہر وہ شئے جو کسی طرح جانوروں کے لئے شک کا باعث بن سکتی تھی ہٹا دی گئی۔

جب سارا کام ختم ہو گیا تو میں نے میر صاحب کی طرف دیکھا

"بسم اللہ —"

"بسم اللہ — کیا مطلب حضرت — کیا بولتے — ؟"

"مچان پر چڑھ کر بیٹھ جاؤ —"

"اور تم — حضرت تم کدھر لوبل کر جاتے —"

"میں شیر کو تلاش کر کے تمھارے پاس لاتا ہوں —"

ذرا سی رد و قدح کے بعد وہ راضی ہو گئے اور درخت پر چڑھ کر مچان پر بیٹھ گئے ان کے ساتھ راوا بھی بیٹھا۔ میر صاحب کے پاس تین سو چھبیس ہالینڈ اینڈ ہالینڈ میگنم تھی۔ راوا کے پاس تلوار۔ ایک شاٹ گن بھی میر صاحب کے ساتھ مچان پر بٹھائی گئی — وہ دیہاتی جو ساتھ آئے تھے گاؤں کی طرف واپس گئے۔ اور میں ان کے جانے کے بعد جنگل میں داخل ہو گیا۔ میر صاحب کو میں نے تاکید کر دی تھی جب تک میں واپس نہ آجاؤں اس وقت تک وہ درخت سے کیا۔ مچان سے باہر قدم نہ رکھیں۔ مچان اتنی بلندی پر اور درخت کے تنے سے ہٹا کر اس طرح بندھی تھی کہ اس تک کسی جانور کا جانا ممکن نہیں تھا۔ الا یہ کہ کسی چیتے کو میر صاحب سے چھیڑ چھاڑ کی سوجھتی۔

جنگل بھی عجیب سا تھا۔ جو درخت پرانے ہو کر سوکھ جاتے ہیں وہ کبھی کبھی آندھی سے گر جاتے ہوں گے۔ کیونکہ میں جب مچان کی جگہ سے کوئی آدھ میل نکل آیا تو ایسی جگہ آگئی جہاں بانسوں کے جنگل بھی تھے — اور بہت سے گرے درختوں کی خشک شاخیں جا بجا پھیل گئی تھیں — ایک پایاب نالے کے اندر بھی درختوں کے خشک تنے اور بڑی بڑی ڈالیں ایک جگہ پھنس کر رک گئی تھیں۔ ان سے بند سا بن گیا تھا۔ غالباً بارش کے زمانے میں جب پہاڑی نالہ بھرا ہو گا تو یہ خشک تنے اور شاخیں بیکر وہاں آ پھنسے اور رک گئے۔ لکڑیوں کے اس ڈھیر کے نیچے سے دو لومڑیاں مجھے دیکھ کر نکلیں اور بھاگ کر جھاڑیوں گھس گئیں۔

لومڑی

لومڑی شب بیدار جانور ہے۔ لیکن بعض گھنے اور ویران جنگلوں میں دن کے وقت بھی لومڑیوں کو آتے جاتے دیکھا گیا ہے — اس جانور کی مکاری ضرب المثل ہے شیخ سعدیؒ شیرازی نے البتہ اس کو ایک عقلمند اور دور اندیش جانور ثابت کرتے

http://updf.weebly.com

ہوئے اس سے منسوب کر کے ایک واقعہ گلستان میں بیان کیا ہے۔ شیخ سعدی کی کتاب کو رد کرنا آسان نہیں۔ خواہ ان کا یہ شعبہ رہا ہو یا نہیں۔ اگر انھوں نے اس کو دور اندیش خیال کیا ہے تو میں ان کی بات تسلیم کر لیتا ہوں خواہ دنیا کچھ بھی کہتی رہے۔ اس کی عقلمندی کی یہی کیا کم دلیل ہے کہ اپنے بھٹ کے لیے ہمیشہ ایک سے زیادہ راستے رکھتی ہے اور ہر راستہ بالکل پوشیدہ۔ کبھی کبھی سانپ اس کے بھٹ میں گھس آتا ہے اور مارا جاتا ہے۔ ورنہ اور کوئی چھوٹا جانور ادھر رخ نہیں کرتا اس کی بو ہی ان کو بھگانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

میں خشک لکڑیوں کے اس جنگل سے گذرتا آگے بڑھتا گیا۔ ایک خشک پہاڑی نالے کے کنارے کسی پرانے درخت کا جلا ہوا تنا پڑا تھا۔ غالباً اس پر بجلی گری تھی اسی سے جل کر گرا ہوگا اس کی سیاہ راکھ بھی پھیل گئی تھی۔ اور اس راکھ میں کسی جانور کے لوٹنے کے نشانات تھے۔ ادھر ادھر اور دیکھا تو شیر کے ماگھ بھی نظر آئے۔ یہ بات اب ظاہر تھی۔ شیر کو نرم مٹی اور راکھ وغیرہ میں لوٹنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ اور اس شوق کا باعث کچھ تو وہ چیچڑ مکھیاں اور حشرے ہوتے ہیں جو شیر کی کھال میں چپکے رہ کر خون چوستے ہیں، اور کچھ پسّو، یا جوئیں جو کبھی کبھی ہو جاتے ہیں۔ باریک مٹی ان کا اچھا علاج ہے۔ مٹی میں لوٹنے سے اس کے جسم کے بہت سے حشرے بھاگ جاتے ہیں۔

بالعموم شیر نہایت صفائی پسند جانور ہے، سارا جسم چاٹ چاٹ کر وقتاً فوقتاً صاف کرتا رہتا ہے۔ کسی گندی جگہ سے گذر بھی نہیں کرتا ان عادتوں کی وجہ سے بیشتر شیر صاف ستھرے، مکھیوں اور کیڑوں سے پاک صاف رہتے ہیں اور اس پاکیزگی اور صفائی کی ایک اہم ضرورت باریک مٹی میں لوٹنے سے بھی پوری ہوتی ہے۔ ایک انگریز شکاری نے اپنی کتاب میں سیاہ شیر کا تذکرہ کیا ہے جس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ اور کئی شکاریوں نے اس شبہے کا ذکر کیا ہے کہ جس شیر کو اس شکاری نے دیکھ کر سیاہ شیر کی موجودگی کا یقین کر لیا وہ کسی جلے ہوئے درخت کی راکھ میں ملوث

ہونے کی وجہ سے کالا بھجنگ نظر آیا ہوگا۔

میں اس جلے ہوئے درخت کو دیکھنے کے بعد دوسری طرف نکل گیا۔ کوئی سو گز چلنے کے بعد میں ایک عمیق نالے کے کنارے پہنچا۔ کنارے نسبتاً بلند تھے کیونکہ سنگلاخ چٹانوں سے مرکب تھے اور جگہ جگہ چھوٹی جھاڑیاں اور جنگلی بیلیں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے کنارے پر چڑھ کر نالے میں جھانکا۔ تہہ خشک اور ریتلی تھی۔ چوڑائی اس مقام پر یقیناً بیس پچیس فٹ ہوگی۔ گہرائی دس بارہ فٹ سے زائد تھی اور ابھی میں بغور دیکھ ہی رہا تھا کہ نالے کے اندر سے ہلکی سی آواز آئی۔ نہایت ہلکی۔ آواز میں نے ضرور سنی۔ سماعت کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ ہر شخص صاحب سماعت ہوتا ہے لیکن شکاری کی حس سماعت میں تجزیے کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر سکوت اور توجہ سے سنا جائے تو جنگل خاموش نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہ آوازیں ہلکی اور جنگل کے ماحول میں بہت خوبی سے مل جل کر ایک سکوت کا سا ماحول پیدا کر دیتی ہیں۔ جنگل میں مسلسل جاری رہنے والی ان آوازوں کو ایک عام شخص نہ محسوس کرتا نہ اس کا تجزیہ ممکن ہے۔ شکاری بھی ان آوازوں کو اسی طرح سنتا ہے اور جانتا ہے کہ جنگل خاموش اور ساکن ہے، اس کے باوجود ادھر کوئی آواز سنی ادھر اس کی قوت تجزیہ نے فیصلہ کیا اور اس کو آواز کی نوعیت، اصلیت اور سمت کا اندازہ بتا دیا۔

میں نے آواز سن لی۔ لیکن آواز کی صحیح نوعیت کے بارے میں تجزیہ نہ ہو سکا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں ساکت و جامد رہ گیا۔ صرف آنکھوں کی پتلیاں متحرک تھیں۔ اس وقت میں اس ساکت جنگل کی ساری گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ بیشمار آوازیں جو جنگل کی خاموش فضا کا جزو بن کر تحلیل ہو گئی تھیں۔ میں اب ان کو علیحدہ علیحدہ انفرادی طور پر سن رہا تھا۔ پرندوں کی نہایت پرسکون اور ہلکے ترنم کی آوازیں۔ ان میں سے بیشتر پرندوں سے میں آشنا تھا۔ مثلاً لال، بیے، بلبل، ہتھی، وغیرہ۔ حشرات الارض۔ جیسے جھینگر، گبریلے، بھنٹے، کرمل وغیرہ۔ درختوں کے پتوں کے مس کرنے کی آواز۔ ہوا کے پتوں کے درمیان سے گذرنے کی آواز۔ پانی کے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

پانی کے پتھروں پر بہنے کی آواز — پتھروں کے پانی کے بہاؤ میں لڑھکنے اور رجا بجا ہونے کی آواز —

کتنی ہی آوازیں تھیں —

اور نالے میں سے وہ آواز پھر آئی — اس بار زیادہ واضح تھی اور میں فوراً اس نتیجے پر پہنچا کہ ہڈی توڑنے کی آواز تھی — اس آواز کا سمجھنا اتنا آسان بھی نہیں۔ جس طرح کتا کوئی بڑی ہڈی دانتوں میں دبا کر توڑتا ہے تو آواز ہوتی ہے۔ ویسی ہی۔ لیکن اس سے گہری — جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ آواز کرنے والے کا منہ بڑا ہو گا۔

اس آواز کا فاصلہ پچاس گز سے زیادہ نہیں ہو گا۔ نالے کی پتھریلی دیواروں کی وجہ سے زیادہ گونج کر زیادہ فاصلے تک سنی جا سکی۔

عمیق نالہ — دونوں طرف کنارے عمودی — اور ٹھوس چٹانوں جیسے — ان پر لٹکی ہوئی جنگلی بیلیں — اور جھاڑیاں — جگہ تو نہایت مناسب تھی۔

میں غور کرتا رہا — آواز کس جانور کی تھی — ؟

شیر — ؟

چیتا — ؟

ریچھ — ؟

لگڑ بگڑ — ؟

سیاہ گوش — ؟

سمت کا بھی تعین ہو گیا — اور میں آمادگی کے ساتھ حرکت میں آ گیا۔ چند ہی قدم چل کر نالے کے اندر بہ آسانی اترنے کی جگہ بھی مل گئی — میں نالے میں اترنے کے خلاف ہونے کے باوجود — بے تکلف وہیں سے اتر کر نالے میں گھس گیا۔ شیر کے شکار میں یہ حرکت خاصی خطرات کی حامل خیال کی جاتی ہے۔ اس تامل کی وجہ ظاہر ہے۔

میں جس جگہ سے اتر کر نالے میں داخل ہوا وہاں سے دونوں جانب کوئی چالیس

گز تک صاف اور کھلی سطح تھی۔ جس سمت میں بڑھ رہا تھا اس طرف چالیس گز کے بعد نالا بائیں جانب گھوم گیا تھا۔ میں آہستہ اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ قدم قدم چلتا یہ فاصلہ طے کر کے موڑ تک آیا، اور نالے کی تہہ کے قریب دیوار سے نکل کر پھیلی ہوئی جھاڑی کی آڑ لے کر میں نے بہت آہستگی کے ساتھ جھانکا۔

سامنے نالے کی سطح کوئی آٹھ دس گز ہی کھلی ہوئی تھی اور وہاں کوئی جانور نہیں تھا۔ اس جگہ سے نالہ پھر دائیں جانب مڑ گیا تھا اور ادھر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے چند لمحے تامل کر کے غور کیا — اس کے بعد بسم اللہ کر کے نکلا اور نہایت احتیاط اور کمال آمادگی کے ساتھ یہ فاصلہ طے کر کے موڑ تک آ گیا — یہاں میں نے وہی ہڈی توڑنے کی آواز نہایت واضح سنی اور بالکل نزدیک — یقیناً جو جانور بھی تھا موڑ کے ادھر ہی تھا۔ میں نے رائفل پر ایک نظر ڈالی — اور ہمیر چڑھا دیے۔

میں چند منٹ موڑ کے ساتھ ساکت و جامد کھڑا رہا — البتہ چاروں طرف اچھی طرح دیکھ لیا۔ ہر طرف سکوت ہی طاری تھا — غالباً اس طرح مجھے پانچ منٹ گزر گئے ہوں گے۔ اب میں نے نہایت آہستگی کے ساتھ باہر جھانکا — سامنے ہی نالے کی کھلی سطح تھی اور یہی کل بارہ پندرہ گز تک — اس کے بعد نالہ پھر بائیں جانب پہاڑی کے عین وسط کو چیرتا گھوم گیا تھا، اور اس سطح پر ایک جھکی ہوئی چٹان کے سائے میں ایک آدمی کی ننگی اور ادھ کھائی لاش پڑی تھی جانور آس پاس نہیں تھا۔

شیر — ؟

آدم خور — ؟!

یقیناً — وہ اس کی ضیافت اڑا رہا تھا — اور وہیں موجود بھی ہو گا۔ ممکن تھا کھانے کے وسط میں پہنچ کر چند قدم ٹہلنے — پانی کے دو چار گھونٹ پینے نزدیک ہی کسی طرف گیا ہو — یا یہ بھی ممکن اس کو میری آمد کا شبہ ہو گیا ہو

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

آہٹ مل گئی ہو — آدم خور شیر کو شکاری کی قربت کا احساس بہت جلدی اور بہ آسانی ہو جاتا ہے۔

اب یہ بھی سوال تھا — اس کو انسانی شکار کہاں سے ملے۔ جنجالی سے — ؟

ہماری روانگی سے اب تک زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا — اور اگر شیر نے ہماری روانگی کے بعد جنجالی کا کوئی آدمی پکڑا تو اتنے کم وقت میں لاش وہاں لانا اور ما حضر تناول کرنا بھی ممکن نہیں — میں لاش سے زیادہ دور نہیں تھا — اور صاف دیکھ سکتا تھا — لاش میں سے خاصا حصہ کھایا گیا تھا — میرے اندازے کے مطابق اتنی لاش اگر شیر بہت پھرتی کے ساتھ بھی کھائے تو ڈیڑھ دو گھنٹے کا وقت لگنا چاہیئے۔ گاؤں سے اس مقام تک کوئی دو گھنٹے کا فاصلہ تھا — اس طرح تقریباً چار پانچ گھنٹے پہلے کا شکار ہونا چاہیئے۔ ہمیں گاؤں سے نکلے ہوئے ابھی چار گھنٹے گذرے تھے، اس لیے شیر نے یہ شکار جنجالی سے حاصل نہیں کیا۔

پھر کہاں سے ملا — کون بدبخت اس کا لقمہ بنا — ؟

میں نے پھر جھانک کر لاش کی طرف دیکھا — اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ محض اللہ کی عنایت تھی —

نالے کا کنارا اس جگہ بارہ تیرہ فٹ بلند تھا — ایک نہایت چھوٹا سا کنکر کنارے سے سیدھا مجھ پر گرا اور وہ بھی عین رائفل کی نال پر، میں نے اوپر دیکھا۔ اور جیسے میری روح پرواز کر گئی —

آدم خور شیر — !

عین کنارے پر — اس کوشش میں کہ اس کو ذرا قدم جمانے کو جگہ ملے تو سیدھا مجھ پر جست کر کے دبا لے اور اس حالت میں کہ بس کودنے ہی کو تھا۔

میں نے رائفل اٹھائی اور فائر کر دیا — گولی تو اس کے نزدیک سے نکل گئی ہو گی — اتنا زبردست دھماکہ ہوا کہ سارا نالہ آواز کی شدید لہروں اور بازگشت سے گونج گیا — پہلے فائر کے بعد میں نے رائفل کا زاویہ درست کر کے شیر کا نشانہ

لینا چاہا لیکن وہ کمبخت ایک ہی جست میں نظر سے غائب — اور کنکروں کی مجھ پر بارش ہو گئی — یا یہ کہا جائے کہ وہ ہٹتے وقت کنکروں کی بوچھاڑ کرتا گیا۔

شیر — اور خصوصاً آدم خور شیر — کی تلاش کے دوران نالے کے اندر داخل ہونا اسی مصلحت کی بنا پر قطعاً ممنوع ہے — وہ تو اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص فضل ہے اور ہمیشہ باری تعالیٰ جل شانہ' میری حفاظت فرماتا اور مدد فرماتا ہے — اگر کنکر لڑھک کر نہ گرتا تو مجھے خبر بھی نہ ہوتی کہ وہ موذی جو ابھی ابھی ایک انسان کے گوشت کی ضیافت اڑا کر شکم کی آگ بجھا رہا تھا — اس قدر لالچی اور اتنا حریص ہے کہ ذرا سی آہٹ پا کر ما حضر سے ہٹا تو اس ترکیب سے کہ مجھ پر تاک لگا کر دوسرے شکار کے لیے آمادہ ہو گیا — ابھی ابھی پیٹ بھرا تھا — اور شکم پری کے لیے لاش کا نصف حصّہ باقی بھی تھا لیکن ایک اور انسان کو مارنے پر آمادہ ہو گیا۔

یہ حرکت ہرگز شکم پری کے لیے نہیں تھی — محض عداوت کی بناء پر تھی۔ وہ اپنے دشمن کو پہچانتا تھا اور محض جنگ کے لیے آیا تھا — دشمن کو ہلاک کرنے کے ارادے سے۔

میں نے فائر شدہ کارتوس نکال کر دوسرا لگا دیا — اب شیر کی موجودگی کا خیال بھی بیکار تھا — سیدھا لاش کی طرف آیا — اور اسی وقت —

ایک فائر ہوا — پھر دوسرا فائر ہوا — اور راوا نے شور مچایا — باگھ۔ باگھ ساتھ ہی میر صاحب کی آواز آئی — شیر — یہ گیا — یہ گیا — بھاگ گیا — حضرت نقوی صاحب — بھائی قمر صاحب — شیر ادھر ہے — بھاگ گیا — گولی نہیں لگی۔

اور پھر سناٹا ہو گیا —

اس تمام حادثے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جنگل میں کیا ہنگامہ ہوا ہو گا۔

جانور تو جانور — پرندے تک شور کرتے سراسیمہ ہو کر اس علاقے سے بھاگ لیے — بندروں کی چیں چاں — خوں خاں — دور ہوتی گئی — مور کے چلّانے کی آواز آتی رہی — مجھے شیر کے بھاگ جانے کا قلق ہوا — میری رائفل کا فائر ہی اس کو بدحواس کرنے کے لیے کیا کم تھا — میر صاحب نے بھی اندھا دھند دو فائر

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

اس پر چھونک مارے۔ افسوس یہ کہ دونوں خالی۔ جب میرا فائر صرف تین چار گز۔ بلکہ اس سے کم فاصلے سے خالی گیا تو میر صاحب کو کیا مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ گویہ واقعہ ہے کہ میں نے نشانہ نہیں لیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اب مجھے اپنے فائر کا اثر شانے پر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اتنی تیزی سے رائفل اُٹھا کر فائر کیا کہ شانے پر مضبوطی سے جمانے کا وقت نہیں تھا۔ ایسی حالت میں رائفل کے ریکوائل کا زبردست جھٹکا شانے کی ہڈی پر آیا اور ضرب کی شدت سے درد ہونے لگا۔

نالے سے نکل کر میں میر صاحب کے درخت کی طرف واپس ہوا۔ لاش اپنی جگہ پر پڑی تھی اور میں اس کو دیکھ چکا تھا اب وہاں میرا ٹھہرنا بھی غیر ضروری تھا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا ذرا ہی دیر میں مجھے میر صاحب اور راوا زمین پر نظر آئے۔ وہ دونوں میری واپسی سے پہلے ہی درخت سے اتر آئے تھے اور یہ ان دونوں کی نہایت زبردست غلطی تھی۔ آدم خور شیر بزدل نہیں ہوتا صرف چالاک ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ فائر ہو جانے کے بعد وہ اس علاقے سے بھاگ ہی گیا ہو۔ اس کا کہیں نزدیک ہی ہونا عین قرین قیاس تھا۔ یہ بھی چالاکی پر دلالت ہوئی۔ ممکن ہے اس کو فائر کے بعد شکاری کے لاپرواہ ہو جانے کا تجربہ ہو اور وہ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اپنے دشمن کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے وارد ہو جائے۔ ہمارے موجودہ حالات میں یہی ہو رہا تھا۔ فائر کے بعد میں گویا بے توجہی اور لاپرواہی کے ساتھ لاش کو دیکھتا رہا پھر نالے سے نکل کر بظاہر نہایت عدم توجہی کے ساتھ مچان والے درخت تک آیا۔ تاہم۔ یہ بات میں نے صرف مثالاً لکھی۔ نہ میں فائر سے پہلے بے خبر تھا نہ فائر کے بعد بے توجہ ہوا۔ مجھے پہلے دو بار تجربہ ہو چکا تھا اور دونوں بار آدم خور سے واسطہ تھا جو فائر کے بعد نزدیک کی ہی ایک جھاڑی میں دبک گیا۔ اور جب ہم لوگ اس خیال سے لاپروا ہوئے کہ وہ بھاگ گیا ہوگا اس وقت وہ حرکت کرتا نظر آگیا اور مارا گیا۔ اگر اس وقت اس پر نظر نہ پڑ جاتی تو حتماً وہ کسی نہ کسی کو صدمہ

پہنچاتا۔

میں نے میر صاحب اور راوا دونوں کو فہمائش کی۔ اور دونوں نے ہی اپنی غلطی تسلیم کی۔ میں نے ان کو اپنا سارا افسانہ سنایا اور ان سے پوچھا کہ فائر کیوں کیے۔ میر صاحب صرف شیر کو دیکھ لینے اور اس پر اندھا دھند دو فائر کر دینے کی وجہ سے بہت جوش کی حالت میں تھے۔ بتایا کہ شیر بھاگتا ہوا ان کے درخت سے صرف پچیس تیس گز کے فاصلے سے گذرا۔ شیر کو اتنے قریب سے گذرتے دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔ راوا نے بھی ان کو اکسایا اور انھوں نے پہلا فائر کیا تو شیر ایک لمحے کو پلٹا۔ انھوں نے دوسرا فائر کیا۔ وہ بھی خالی گیا اور شیر رُخ بدل کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ خیر گذشت آنچہ گذشت۔ بھینسا اسی طرح بندھا کسی قدر حیرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اور منہ چلائے جا رہا تھا۔

اب وہاں ٹھہرنا غیر ضروری تھا۔ میں نے راوا سے کہا کہ وہ آگے چلے اس کے پیچھے میر صاحب اور ان دونوں سے کوئی دس قدم پیچھے میں۔ راوا نے میری ہدایت کے مطابق اس جھاڑی میں شیر کے ماگھ تلاش کر لیے جس میں وہ دوسرے فائر کے بعد گھسا تھا اور ان کے رُخ کا تعین ہی نہیں کر لیا بلکہ نشانات کی مدد سے تعاقب میں بھی چل پڑا۔ راوا اور میر صاحب دونوں نے وہ ہی نتیجہ اخذ کیا جو میں نے کیا تھا۔ یعنی متوفی جنجالی کا آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ راوا کا خیال تھا۔ اسی طرف آٹھ میل کے فاصلے پر دس بارہ گھروں پر مشتمل ایک زرعی آبادی ہے وہاں سے شیر کو شکار ملا ہوگا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا لاش کا باقی ماندہ حصہ واپسی کے وقت نالے میں ہی دفن کر دیں گے اور اگر اس کی تلاش میں لوگ آئے تو ان کو دفن کی جگہ بتا دی جائے گی، اُٹھا کر گاؤں لے جانا، کم از کم ہمارے لیے غیر ضروری عمل تھا۔

شیر کے نشانات قدم نالے ہی کی طرف گھوم گئے تھے چنانچہ ذرا دیر میں ہی ہم پھر نالے کے کنارے کھڑے تھے۔ یہ جگہ غالباً لاش سے کوئی دو سو گز شمال کی جانب تھی۔ اور یہاں سے نالہ ایک نیم دائرے کی شکل میں اس طرح گھوم گیا تھا کہ اگر ہم لوگ

http://updf.weebly.com

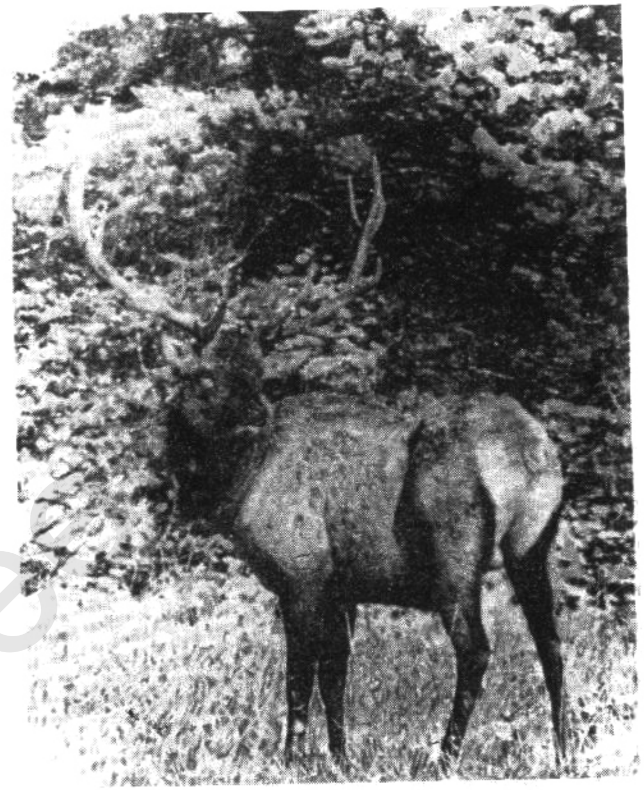

اس مقام سے نالہ پار کرتے تو کوئی سو گز چلنے کے بعد ہی ایک دفعہ پھر پار کرنا پڑتا۔ میں نے راوا کو ہدایت کی کہ وہ کنارے کنارے ہی نیم دائرے کے ساتھ چلے ــــ شیر وہاں سے نالے میں اُترا تھا۔ لیکن میں آدم خور شیروں کی خصلت سے واقف ہوں۔ اس کو فائر ہونے کے بعد خوف بھی ہوگا اور عجلت بھی، اس کے باوجود اس کی فطری چالاکی اور عیاری اسے نالے سے باہر بھی ضرور لائی ہوگی۔

یہ قیاس درست بھی نکلا ــ

ہم جب نالے کے نیم دائرے کے ساتھ گھوم کر جنوب میں آگئے تو ایک جگہ نشانات ملے۔ یہاں بھی شیر بھاگتا ہوا گذرا تھا۔ جس طرف اس کے نشانات کا رُخ

اِدھر چھوٹی بڑی پہاڑی ٹیکریاں تھیں جن پر درختوں نے خوب گھنا جنگل بنایا ہوا تھا۔ درمیان میں بانسوں کے درخت بھی نظر آتے تھے، شیر سیدھا اسی طرف گیا تھا ــ راوا نے بھی بے چوں وچرا وہی راستہ اختیار کیا، میں نے اطراف کے درختوں پر بھی نگاہ ڈالی ــ نہ تو وہاں بندر تھے نہ پرندے ــ ابھی فائر ہوئے دیر بھی کتنی گذری تھی ــ جب ایک بار جانور ڈر کر بھاگ جائیں تو واپس آتے آتے دیر لگتی ہے،

ہم ابھی جنگل کی طرف بڑھ ہی رہے تھے۔ راوا ہم تینوں کا پیش رو ہونےکی وجہ سے مجھ سے کوئی دس گز آگے تھا۔ یکبارگی ٹیکریوں کے گھنے جنگل میں سے نیل گایوں کا ایک بہت بڑا منداسبراسیمہ و بدحواس بھاگتا ہوا نکلا، اور سیدھا ہماری ہی طرف اس طرح اور اتنی جلدی کہ راوا تو ان کے درمیان ہی پھنس گیا، میر صاحب بھی ــ اور میں نے فائر کرنا یا ان بدبختوں کو مارنا توقطعاً لازم نہیں تھا ــ دونوں ہاتھ ہلا کر ان کو بھگا اور ڈرانے کی کوشش کرنے لگا، مگر ان کی تعداد اتنی تھی اور پیچھے سے آنے والے جانوروں کا اتنا دباؤ کہ بس وہ رخ بدلتے بدلتے سر پر آگئے۔ کچھ نیل دوڑتے میں رُخ بدلنا چاہتے تھے، کچھ کناروں سے دباؤ ڈال رہے تھے۔ نتیجتاً اس جگہ کچھ عجیب گڈمڈ اور خلط ملط کی کیفیت پیدا ہو گئی ــ مجھ کو کئی جانوروں نے گھیر لیا اور میری اس کوشش میں کہ کہیں زمین پر گر کر ان کے کھروں میں نہ روندا جاؤں رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ مجھے وہ منحوس جانور کدھر کا کدھر لے گئے ــ اور بس مشکل ہی اپنے پیروں پر کھڑا رہا۔ میرے ساتھ اس قسم کی ایک صورت حال دیہہ گاؤں کے شکار میں ہو چکی تھی۔

جس طرح وہ اچانک آئے تھے، اسی طرح اچانک مطلع صاف اور جانور غائب ہوگئے۔ میں جانتا ہوں اس منڈے میں سو ڈیڑھ سو جانور ضرور ہوں گے۔

سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ میر صاحب کے ہاتھ سے ان کی تین سو تھرٹی میگنم لے لی۔ کارتوس دیکھے تو میر صاحب کا سر پھوڑ دینے کو جی چاہا۔ جو آخری کارتوس انھوں نے فائر کیا تھا اب تک وہی چیمبر میں تھا۔ خدا کے بندے نے اتنی عقل بھی استعمال نہیں کی تھی کہ اس کو بدل لیتا ــ ویسے ابھی میگزین میں

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

تین کارتوس تھے ۔ میں نے ان سے دو کارتوس لیکر، فائر شدہ کارتوس نکال پھینکا۔ نئے کارتوس لگائے اور سیفٹی کیچ لگا دیا۔

راوا نے بڑھ کر میری رائفل اُٹھائی ــــ افسوس کہ وہ بیکار ہو گئی ــــ کنداینل گاؤں کے کھروں تلے آکر عین گرفت کے مقام سے ٹوٹ گیا تھا۔

شکار میں حسب موقعہ وضرورت اعمال وافعال کی عادت ایک مدت میں پڑتی ہے ۔ پھر توجہ اور زود عملی بھی شکار کے لوازمات میں سے ہے ۔ رائفل یا بندوق کا ہاتھ میں تیار ہونا سب سے زیادہ اہم بات ہے ۔ میر صاحب نے کارتوس تبدیل نہیں کیا تھا اگر ایسے میں فوری فائر کی ضرورت ہوتی تو کیا ہوتا ــــ میں نے ان کو یہ بات نہایت تاکید کے ساتھ سمجھائی ــــ اور بندوق ان کے ہاتھ میں دیدی۔

یقینی بات ہے کہ نیل گائے شیر سے ہی ڈر کر بھاگے ہوں گے۔

اس کے بعد ہم لوگ سیدھے ہی چلتے رہے اور آخر سفر کا اختتام اسی آبادی میں ہوا جس کا راوا نے تذکرہ کیا تھا ۔ یہاں پہنچ کر شیر کی ہلاکت آفرینی میں ایک آدمی کے اضافے کی تصدیق ہو گئی ــــ جو لاش ہم نالے میں چھوڑ کر آئے تھے وہ اسی گاؤں کے ایک شخص کی تھی ۔ ہماری نشاندہی کے مطابق پندرہ بیس جوان ایک پلنگ لیکر لاش واپس لانے کے لیے روانہ ہو گئے ۔

اس آدمی کی ہلاکت کی داستان مختصراً یہ ہے کہ وہ کھیت میں کام کرنے صبح جلدی نکل گیا، روزانہ تو کسان گروہ کی شکل میں جاتے تھے ۔ اس کے علی الصباح تنہا نکل جانے کی وجہ کوئی نہیں بتا سکا ۔ جب کسانوں کی جماعت گاؤں سے نکلی تو انھوں نے کھیت کے کنارے متوفی کا سامان پڑا پایا ــــ اور معاملہ فوراً ہی واضح ہو گیا ــــ

اب جو مر گیا اس کے لیے دُعائے خیر کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ جو زندہ تھے ان کو میں نے احتیاط کی ہدایت کی ۔ وہ لوگ کنڑی زبان بولنے والے تھے، اردو کا ایک آدھ لفظ ہی جانتے ہوں گے ۔ راوا نے میری ہدایات کا کنڑی میں ترجمہ کر کے ان کو بات سمجھا دی ــــ

ہم لوگ وہاں کچھ دیر ٹھہر کر آرام کرتے رہے، اس کے بعد جنجالی کی طرف واپس ہو لیے ــــ وہ دن بھی ناکامی کے ساتھ ختم ہوا ۔ لیکن اتنا پر واثق دن ۔

وہ بھینسا جو گارے کے لیے باندھا گیا تھا، اس کو مقررہ جگہ سے ہٹایا نہیں گیا ۔ مجھے یقین تھا ایک نہ ایک دن شیر ادھر رخ ضرور کرے گا ــــ اور عین ممکن تھا بھینسے کے نزدیک سے گزرنے یا اس کو ہلاک کرنے کے دوران شاید مجھے موقعہ دیدے کہ میں خلق خدا کو اس وبا سے نجات دے سکوں ۔

اور وہی ہوا ــــ

ساتویں روز مجھے اطلاع ملی کہ شیر بھینسے سے کوئی پچاس گز کے فاصلے سے گذرا اور اس کو دیکھ کر وہاں ٹھہر رہا ــــ

نویں روز میں نے اس مقام کا خود معائنہ کیا ــــ اس دن کی گذشتہ رات کو شیر بھینسے سے صرف دس گز کے فاصلے پر ایک جھاڑی میں بیٹھا رہا تھا ۔ اور میرے اندازے کے مطابق کئی گھنٹے بیٹھا رہا ہو گا ــــ

گیارہویں روز دوپہر سے ذرا پہلے وہ لوگ جو بھینسے کی خبر خبر کے لیے جاتے تھے بدحواس واپس آئے ہیں اور میر صاحب باہر ہی تھے ــــ معلوم یہ ہوا کہ بھینسا غائب ہے ــــ وہ کھونٹا جس میں بھینسا باندھا گیا تھا اکھڑا ہوا ہے ۔ اور غائب بھی ــــ یعنی بھینسا کھونٹے سمیت غائب ــــ اطراف کی زمین پر شیر کے پنجوں کے نشانات واضح تھے ۔

میں نے میر صاحب کی تین سو چھتر میگنم سنبھالی ــــ بارہ کارتوس کوٹ کی جیب کے اوپر کے لوپس میں لگائے ــــ اور تنہا نہایت تیز قدم جنگل میں گھس گیا ۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ میر صاحب نے ساتھ جانے کو ایک بار بھی نہیں کہا ۔ غالباً وہ شیر کی حرکات سے گھبرا گئے تھے ۔

میں جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو واردات کی ساری کہانی نرم زمین پر صاف لکھی نظر آئی جسے میں نے بہ آسانی پڑھ لیا ــــ بھینسے کو شیر نے مارا ــــ اور اس کا گلا

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

دبا کر وہیں بیٹھا رہا۔ غالباً پھنسنے کی جان دیر میں نکلی اور جاں کنی کے عالم میں اس نے حرکت کی ہوگی۔ چنانچہ شیر نے اس کو تین چار زبردست جھٹکے دیئے پھر اس کو وہاں سے جانا چاہا تو رسا مانع ہوا، اس کو بھی شیر نے جھٹکے دے دے کر اکھاڑ لیا۔ اور لاش کھینچ کر لے گیا۔ گھسیٹے کا رُخ صاف نمایاں تھا اور نالے ہی کی طرف تھا۔ وہاں سے نالہ ہی قریب ترین اور محفوظ ترین طعام گاہ تھی۔

میں گھسیٹے کے نشانات دیکھتا ذرا دیر میں ہی نالے کے کنارے آ پہنچا۔ لیکن اس بار میں فوراً ہی نالے میں داخل نہیں ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ نالے میں اترنے سے پہلے وہ جگہ معلوم کر لوں جہاں شیر نے اس کو کھایا ہوگا۔ اس کام میں گدھ بڑی معاونت کرتے ہیں۔ میں نے پہلے ادھر ہی نظر ڈالی۔ فی الحال کوئی گدھ یا پرندہ اطراف میں نہیں تھا۔ جس جگہ سے شیر نالے میں اترا تھا۔ اس کے نشان میں نے دیکھ لیے اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ نالے میں اتر کر شیر نے شمال کی جانب حرکت کی۔ چنانچہ میں نالے کے کنارے کنارے، جھاڑیوں اور پتھروں کی آڑ لیتا، شمال کی طرف ہی چلا۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس عیار سے میرا مقابلہ ہے وہ غیر معمولی حد تک چالاک ہے۔

میں کنارے کنارے چلتا کوئی دو میل نکل گیا۔ اس تمام فاصلے میں نالہ متعدد دفعہ ادھر اُدھر گھوما۔ مڑا۔ اور میں بھی ساتھ گھومتا رہا۔ البتہ اتنی دور آنے کے بعد مجھے شک ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ یقیناً شیر نالے میں ہے۔ یا ممکن ہے نالے سے نکل کر کسی طرف گیا ہو۔ پار نکل گیا ہو۔

میں وہیں سے نالے میں اتر گیا۔ گہرائی پندرہ فٹ سے کم نہ ہوگی۔ نالے کی سطح اندر دونوں طرف تیس تیس چالیس چالیس گز تک نظر آتی تھی اور شیر کا کوئی نشان نہیں تھا۔ زمین ریتلی تھی شیر گذرا ہوتا تو یقیناً نشانات رہ گئے ہوتے۔ کوئی کارآمد نشان نہیں تھا۔ میں نالے کے دوسرے کنارے پر نکل گیا۔ اور جس طرح آیا تھا اسی طرح کنارے کنارے واپس چلا۔ یہ پیش قدمی بھی اتنی دشوار ہوتی ہے جس سے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ہی حواس درست ہو جاتے ہیں۔ زمین پر نشانات

کی تلاش، ساتھ ہی اطراف کی طرف قطعاً آمادگی کے ساتھ نگران رہا۔ اور مستقل اعصابی تناؤ۔ شکاری ہی اس کیفیت کا تحمل کر سکتا ہے۔

غرضیکہ میں اس کنارے پر بھی چلتا تقریباً اس جگہ آ گیا جہاں سے شیر کے نالے میں اترنے کے نشانات تھے۔ ذرا ہی سی کوشش سے مجھے نالہ پار کرنے کا موقعہ پھر مل گیا۔ اور اب میں عین اسی جگہ آیا جہاں سے شیر نالے میں اترا تھا۔ میں دونوں کناروں پر دو دو میل جا چکا تھا۔ کوئی نشان نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔ شیر کے نکلنے کے نشانات میں نے نہ دیکھے ہوں گے۔

اب یہ ضروری تھا کہ میں نالے میں ہی اتروں۔

میں نے بسم اللہ کہہ کر نالے میں قدم رکھا ہی تھا کہ میرے عقب سے مور کے چیخنے کی آواز آئی۔ خطرے یا خوف کی آواز۔

میں پھرتی کے ساتھ گھوما۔ اور نزدیک ترین جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ اور گھٹنے ہی ایسا بے حرکت ہو گیا جیسے۔ بے جان لاش۔ یا مجسمہ۔

مور چیخ کر خاموش ہو گیا۔ غالباً خطرے کی جگہ سے دور چلا گیا ہوگا۔ کیا شیر اُدھر تھا۔

جس طرف سے آواز آئی تھی میں ادھر دیکھتا رہا۔ پیچھے کی جانب سے حملے کا خطرہ نہیں تھا اس طرف نالے کا کنارا ایسا تھا جس پر شیر تو کیا پہاڑی بکرا بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔

امریکی پہاڑی بکرا بھی عجیب جانور ہے۔ بے وجہ ایسی ایسی سیدھی، عمودی اور صاف چٹانوں پر چڑھتا ہے جہاں بعض اوقات خود اس کے کھر بھی پھسل جاتے ہیں اور پھسلنے کی صورت میں سینکڑوں فٹ گہرائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ ایک امریکی بکرے کی تصویر اگلے صفحے پر دیکھی جا سکتی ہے۔

میں اپنے چاروں طرف بیس تیس گز تک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ اور جانتا ہوں اتنے فاصلے کے اندر کوئی جانور حملہ کرے تو میں مدافعت کر سکتا ہوں۔ مور کے چیخنے کی

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

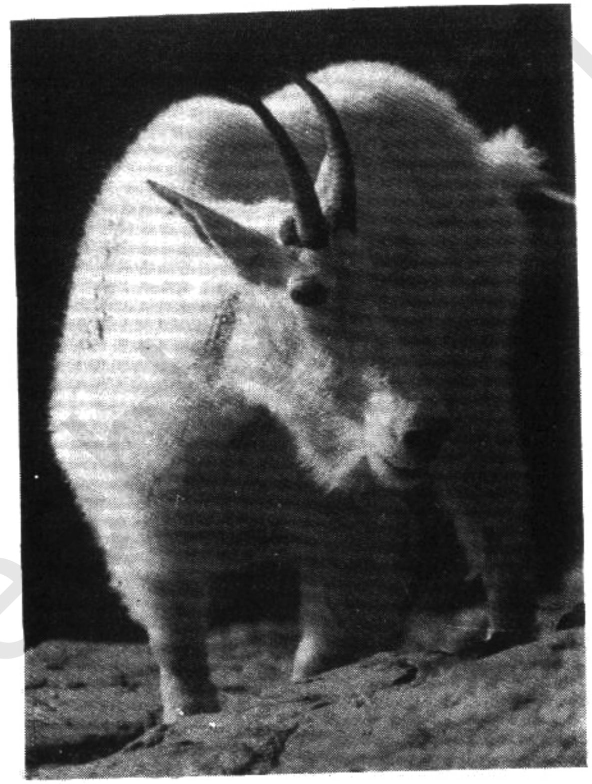

امریکہ کا پہاڑی بکرا جس کا شکار بہت دشوار خیال کیا جاتا ہے۔

آواز بے سبب نہیں ہوتی ۔ شیر یا چیتے کو دیکھ کر ہی چیختا ہے، اگرچہ واحد مور ایک ایسا خوش قسمت پرندہ ہے جس کو وقتاً فوقتاً شیر کی قربت کا شرف حاصل ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح انسان کے دانتوں میں گوشت کے ٹکڑے پھنس جاتے ہیں اور خلال کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح شیر کے دانتوں میں بھی کبھی کبھی گوشت کے ضرورت سے زیادہ ریشے پھنس جاتے ہیں ان ریشوں کو نکالنے کیلئے خلال کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہیں۔ اب شیر خلال ایسے نہیں کر سکتا کہ تنکا لے کر بیٹھے اور خلال کر کے ریشے نکالے۔ اس کی یہ ترکیب کرتا ہے کہ کسی ایسی جگہ نمودار ہوتا ہے جہاں مور کی موجودگی کا علم ہو۔ ایسی جگہ پہنچکر آرام سے زمین پر لیٹ کر منہ پھیلا دیتا ہے۔ ممکن ہے کچھ آواز بھی کرتا ہو۔ ذرا ہی دیر میں مور نزدیک آجاتا ہے۔ اور اپنی چونچ سے شیر کے دانتوں میں پھنسے ہوئے ریشے نکال کر دانتوں کی صفائی کر دیتا ہے۔

کام ختم ہوتے ہی دونوں اپنا اپنا راستہ پکڑتے ہیں۔ بس دوستی ختم۔ اس دوستانہ تعلق کے باوجود شیر کو دیکھ کر مور ضرور شور کرتا ہے۔

میں ہر طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

سامنے۔ تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر بانس کے کم قامت درختوں کے جھنڈ کے وسط سے یکبارگی شیر نے سر نکال کر باہر جھانکا اور قبل اس کے کہ میں رائفل اُٹھا کر فائر کر سکتا۔ جھاڑیوں میں پیچھے ہٹ گیا۔ یہ گویا چشم زدن سے بھی کم عرصے میں ہوا۔ لیکن مجھے متعجب کرنے کے لیے کافی تھا۔

من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال

میں سمجھ رہا تھا شیر نالے میں ہے۔ اور شیر نالے کے باہر، بلکہ تقریباً اس جانب جدھر سے گذر کر میں نالے تک آیا تھا۔ اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آگئی۔ اگرچہ نہ اس کو میری کمین گاہ یا گذرگاہ کا علم ہوا نہ مجھے اس کے بارے میں۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے بیخبر۔ لیکن ایک دوسرے کے نزدیک تھے۔ میں غافل بھی نہیں رہا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

اور ابھی دیر نہیں گذری تھی۔

جس جگہ شیر نے اپنی جھلک دکھائی تھی اس سے کوئی دس گز جانب شمال اسی قسم کی ایک گھنی جھاڑی میں سے شیر نے ایک بار پھر سر نکال کر جھانکا۔ مجھ کو زاویہ بدل کر رائفل اس طرف لانے میں ایک دو ثانیے ہی لگے ہوں گے کہ شیر نے سر غڑاپ سے پیچھے کھینچ لیا۔ اور فائر نہیں ہو سکا۔

میں نے سوچا۔ آخر یہ درندہ چاہتا کیا ہے۔؟

اس طرح مزید دس منٹ گذرے۔

اب کے بار۔ عین جنوب کی جانب کوئی بیس گز کے فاصلے پر، میری نظر ایک

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

جھنڈ پر پڑی تو ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے کوئی حرکت دیکھی ہو۔ صاف نہیں دیکھی لیکن شبہ سا ضرور ہوا — میں اس جھنڈ کو بغور دیکھنے لگا — وہاں نہ صرف یہ کہ سبزی ہی تھی بلکہ گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے جا بجا اندھیرے کے دھبے بھی اتنی دور سے سیاہ سے نظر آرہے تھے — اس مقام کا زاویہ بالکل مختلف تھا اور ادھر رائفل گھما کر فائر کی پوزیشن میں لانے کے مجھ کو خاص حرکت کرنا پڑتی۔

بہرحال میں بغور جھنڈ کو دیکھتا رہا — اور اچانک ہی مجھے اس گھنے جھنڈ میں شیر کا سر نظر آگیا — آنکھیں نظر آئیں اور اس کا ایک کان نظر آیا جس نے جنبش کی میں اب حرکت کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا — گھوما — اور گھومنے سے نہ صرف یہ کہ جھاڑی میں جنبش ہوئی بلکہ شیر نے میری حرکت بھی دیکھ لی — اور قبل اس کے کہ میں فائر کی پوزیشن میں آؤں شیر نے ہلکی سی غراہٹ کی — اور غائب۔

یہ اس کی آخری جھلک تھی — شیر اگر غرانے کی آواز یا بھبکی، یا دھاڑ کے ساتھ غائب ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نے فرار کو قرار پر ترجیح دی۔

اب یہ کہ اس نے تین جگہیں بدل کر ہر بار باہر جھانکنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا۔ صاف ظاہر ہے۔ اسے میری موجودگی کا شبہ ہو گیا — خواہ خوشبو سے، آہٹ سے یا جھلک سے۔ میں سمجھتا ہوں آہٹ سن لی ہو گی — تاہم اس کو میری کمین گاہ کا علم نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے دو بار جھانکا اور تیسری بار جھنڈ میں چھپ کر دیکھتا رہا وہ میری صحیح پوزیشن معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں کافی دیر اپنی جگہ پر چھپا رہا — لیکن پھر شیر کی جھلک نہیں دیکھی۔

مزید کچھ دیر انتظار کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ اور یوں ہی بے مقصد جنگل میں گھومتا رہا — جہاں جھاڑیوں میں شیر کی جھلک نظر آئی تھی وہاں بھی گیا۔ ماگھ بھی دیکھے اور گھسیٹنے کے نشانات بھی — اور اس جگہ سے کوئی میل بھر اوپر کی جانب، جھاڑیوں کے وسط کی ایک کشادہ جگہ پر بھینسے کی ادھ کھائی لاش بھی مل گئی جس پر شیر نے جھاڑیاں، مٹی اور گھاس پھونس ڈال کر چھپا دیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ شیر اس کو کھانے کے لیے آئے گا۔

میں نے فوراً ہی آس پاس اپنی کمین گاہ کے لیے جگہ کی تلاش شروع کی۔ یہ موقع اچھا تھا — اگر میں کسی مناسب جگہ بیٹھ جاتا تو شیر کی آمد کا انتظار دشوار نہیں تھا — لاکھ اس نے مجھے دیکھ لیا مگر ایک میل دور دیکھا تھا — اور پھر اگر وہ آتا بھی تو کئی گھنٹے بعد — بیٹھنے کے لیے میں نے ایک بڑا املی کا درخت منتخب کر لیا جس پر میں بہ آسانی چڑھ بھی سکتا تھا — شاخوں کے ایک بلند اتصال پر کمبل رکھ کر بیٹھنا بھی ممکن تھا — بہار کا زمانہ تھا، نہ سردی نہ گرمی — ورنہ دکن کی گرمی تو جہنم کی گرمی سے تین ڈگری زیادہ ہوتی ہے۔ گرمی کم ہونے کی وجہ سے شب گذاری دلچسپ بھی رہتی۔ اس زمانے میں بعض چرندے بھی بہار میں ہوتے ہیں۔ اور ان کے نر اپنے اپنے منڈل کی ماداؤں کے لیے دعویداروں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے ان مقابلوں کو دیکھنا نہ صرف دلچسپ بلکہ تجربے میں زبردست اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

میں فوراً وہاں سے کھسک لیا۔

گاؤں پہنچنے میں ذرا زیادہ وقت لگ گیا کیونکہ میں راستہ بھول گیا تھا — بہرحال — دو بج رہے تھے کہ میں وارد ہوا۔

گاؤں میں خاموشی تھی۔

میں نے غسل کیا — کھانا کھایا پھر نماز پڑھ کر آرام کرنے لیٹ گیا۔ چار بجے میر صاحب نے بیدار کیا — میں نے شکاری لباس زیب تن کیا — میر صاحب کی رائفل لی اور چھ ساتھیوں کے معیت میں گاؤں سے نکلا میر صاحب شاٹ گن لئے ساتھ تھے — ایک آدمی دو عدد کمبل لیے تھا — دوسرے کے پاس میرا شکاری جھولا پانی کی بوتل اور بڑی ٹارچ تھی۔ ہم پونے پانچ بجے مطلوبہ جگہ پہونچے مجھے ان لوگوں نے مدد کر کے درخت پر چڑھا دیا۔ پھر ایک آدمی نے چڑھ کر میری نشاندہی کے مطابق دو شاخے پر کمبل رکھ دیا، جس پر میں بیٹھ گیا — دوسرا کمبل نزدیک کی شاخ پر رکھ دیا گیا — پانی کی بوتل قریب شاخ میں پھنسا دی گئی۔ جاڑے سے بھرا ہوا تھرماس

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

بھی نزدیک ہی لٹکا دیا۔ اس کے بعد وہ لوگ میر صاحب کی سربراہی میں درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ذرا دیر بہت آہستہ آواز میں باتیں کرتے رہے پھر اسی طرح۔ آہستہ باتوں کے ساتھ گاؤں کی طرف واپس گئے۔ جاتے جاتے میر صاحب نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔

اور جنگل حسبِ معمول ساکت ہو گیا۔

میری رائفل بہ آرام ایک شاخ پر ٹکی اس طرح رکھی تھی کہ بہ آسانی اُٹھائی جا سکتی تھی۔ میں نے رائفل پر بڑی ٹارچ لگا لی تھی گرپ کے رائٹ سائڈ پر انگلیوں کی جگہ کے ساتھ اسے روشن کرنے کا سوئچ ہوتا ہے۔

بھینسے کی لاش میرے درخت سے صرف پندرہ گز پر تھی اور صاف نظر آتی تھی۔ اب میں نے بہ اطمینان عصر کی نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے حفاظت اور کامیابی کی دعا کی۔ پھر تھرماس سے چائے نکال ایک کپ چائے بھی پی۔ اور جنگل کا تماشا دیکھتا رہا۔

دو تین گیدڑ ادھر سے گذرے۔ بھینسے کی بو نے ان کو کھینچا۔ ذرا سا ادھر بڑھے لیکن ان کو معلوم تھا کہ یہ شیر کا مال ہے جس کو جھاڑیوں سے چھپایا گیا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ صاحبِ مال نزدیک ہی موجود رہ کر اپنے مال کی نگرانی کر رہا ہو۔ لہٰذا انھوں نے صرف اِدھر اُدھر سے دبک کر بو سونگھتے اور فرار کر لینے میں ہی خوبی سمجھی۔

ایک بھولا بھٹکا تنہا۔ بلکہ۔ اکل کھُرا۔ سانبھر بھی ادھر سے گذرا۔ بھینسے کی لاش سے چند گز پر ٹھہر کر نتھنے پھیلا کر ہوا میں کچھ سونگھتا رہا۔ اور جب اس کو اپنے شبہے کا یقین ہو گیا تو بچک کر بھاگا اور دور جا کر دم لیا ہو گا۔ البتہ جو دو چیکارے نزدیک کی جھاڑی میں تھے۔ بھینسے سے قطعاً جانبِ مخالف و مقابل۔ تقریباً چالیس گز دور ایک دوسرے سے کھیلتے رہے تا آنکہ سورج غروب ہونے لگا، اور وہ دونوں ایک طرف چلے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پانی پینے گئے ہوں گے۔ میں مغرب کی نماز پڑھ کر وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ دونوں چیکارے واپس آ کر ان جھاڑیوں میں گھس گئے۔

رات درختوں پر بسر کرنے کے لئے آس پاس کے درختوں پر کچھ پرندے جمع ہو کر اپنے اپنے گیت گانے لگتے ہیں۔

میں نے اندھیرا ہونے سے پہلے درخت پر اچھی طرح نگاہ ڈالی۔ اور اطمینان کر لیا کہ کوئی ضرر رساں کیڑا وغیرہ نہ ہو، اگرچہ میرے اطمینان کر لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تک اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی عنایت اور فضل و کرم شامل حال نہ ہو اس وقت تک نہ کوئی اپنی حفاظت کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے کی۔ انسان اپنی اشرف المخلوقاتی کے وصف کے باوجود بعید کمزور اور لاچار ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہے کہ اپنے بندوں کو قوت و استقامت عطا فرماتا ہے۔ اور حفاظت فرماتا ہے۔

رات آ گئی۔ اندھیرا ہو گیا۔ اور نجانے کیسے مجھے کسی کا شعر یاد آیا۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نجانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

شیر کو اس وقت آنا چاہیئے۔

میں نے کئی بار رائفل کو ہاتھ لگایا۔ گویا اطمینان کیا۔ یہ بات کہنا میرے لیے قطعاً دشوار نہیں کہ تنہائی میں صرف دو چیزیں تسلی بخشتی ہیں۔

اول۔ اللہ تعالیٰ کی یاد

دوم۔ ہتھیار

الحمد للہ مجھے دونوں پر اعتماد تھا۔ اور یہی میری طاقت کا راز ہے۔

اور اب میں اس واقعے کی یاد کے ساتھ، ذہن کے پردوں پر ایک اور واقعے کا انعکاس دیکھ رہا ہوں۔

یہ ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے۔ میں لاہور میں مقیم اور اس زمانے میں امریکی ادارہ بین الاقوامی ترقیات سے وابستہ تھا، اس زمانے میں کاظمی اور حقانی بھی لاہور میں ہوا کرتے تھے۔ کاظمی واپڈا کے جیو ہائیڈرولاجیکل ڈیپارٹمنٹ میں تھے، وہیں توفیق کمال بھی ہوا کرتے تھے، جو میرے بہت اچھے دوستوں میں تھے۔ شکار میں میرے ساتھ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

جانے کے تو بہت خواہاں رہتے تھے لیکن ان کو موقعہ نہیں ملتا تھا ۔

ایک بار کاظمی اور حقانی نے میرے ساتھ شکار پر جانے کا منصوبہ بنایا ۔ دونوں کو ہڑیال کا بڑا شوق ۔ اور کچھ ایسا اتفاق کہ جس دفعہ بھی ان دونوں میں سے کوئی ساتھ ہوا اُس بار ہڑیال نہ مارا گیا ۔ البتہ ایک بار میرے ساتھ کاظمی نے ایک اچھا ہڑیال شکار کیا ۔

کاظمی کا ایک امریکن ساتھی جو ان کے محکمے میں ہی بطور ایکسپرٹ متعین ہوا ۔ ہڑیال کے شکار کا بڑا شوقین تھا، اور اپنے بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود مشقت کے لیے آمادہ ۔ اس کو خوش کرنے کے لیے کاظمی نے سارا پروگرام مرتب کیا تھا چنانچہ ہم تینوں بمعہ مارس منڈراف لاہور سے ، مارس کی لینڈ روور میں آٹا کے ریسٹ ہاؤس پہنچے اور وہاں سے اسلم کو ساتھ لے کر ڈھڈیالی جہاں ہم نے چیتے کے پیروں کے نشانات دیکھے اور رات یہیں گذاری ۔ میں تو دو سو دفعہ وہاں ٹھہر چکا تھا لیکن میرے باقی تینوں ساتھیوں کا یہ پہلا تجربہ تھا اور کاظمی کچھ ایسے گھبرائے تھے کہ پوری رات کے وقت باری باری سب کا جاگنا ضروری ہے تاکہ چیتا حملہ نہ کر سکے ۔ رائے بری نہیں تھی ۔ اگرچہ چیتا حملہ تو کیا کرتا ۔

مشکل یہ ہوئی کہ جب صبح کے تین بجے سے کاظمی کی ڈیوٹی کا وقت شروع ہوا تو انھوں نے صبح ہونے تک تین بار چیتے کے نرم زمین پر دوڑنے کی آوازیں سنیں اور مجھے جگا دیا ۔ لطیفہ یہ کہ صبح کہیں بھی چیتے کے پیروں کے نشان نہیں ملے ۔ سامنے کی تصویر میں، حقانی اور مارس منڈراف پانی پیتے نظر آ رہے ہیں میں بھی سامنے پلنگ پر بیٹھا ہوں ۔ کاظمی فوٹوگرافی کر رہے تھے لہٰذا وہ اس میں شامل نہیں ہیں ۔ اسلم بھی نظر نہیں آتا ۔ البتہ دوسری تصویر میں میرے سوا سب ہیں ۔

ڈھڈیالی سے ہم لوگ پوٹھا گئے اور تین چار روز شکار میں گذارے ۔ واپسی میں مارس منڈراف، جو بیچارا ساٹھ سال سے زیادہ عمر کا بوڑھا تھا ، بہت تھک گیا چنانچہ اسلم نے ایک اونٹ کا انتظام کیا جس پر مارس کو سوار کرا کے بڑی مشکل سے

قمر نقوی، مارس منڈراف ۔ اور خورشید حقانی

آٹا ریسٹ ہاؤس لایا گیا ۔

خدا جانے اب توفیق کمال، کاظمی اور حقانی کہاں ہیں ۔ نجانے اب پھر ہم اس طرح اطمینان، فراغت اور ذوق و شوق کے ساتھ شکار پر جا سکیں کے کہ نہیں ۔ نجانے اب پاکستان میں شکار ہے کہ نہیں ۔ نجانے اب آٹا کا ریسٹ ہاؤس ہے کہ گر گیا ۔ پوٹھا ۔ اکبر اور اشرف کے گھر اور کھیت ، ڈھڈیالی ، کوہالی ، اور نجانے کون کون سی آبادیاں ۔ مجھے تو پاکستان سے باہر اب اتنا زمانہ گذر گیا کہ سب بھول ہی گئے ۔ سترہ اٹھارہ سال گذر گئے ۔

اور میں درخت کی نہایت تکلیف دہ نشست کو کمبل کی گدی سے آرام دہ بنا کر رات کے اندھیرے میں بھینسے کی ادھ کھائی لاش پر بیٹھا شیر کا انتظار کر رہا تھا ۔

http://updf.weebly.com

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

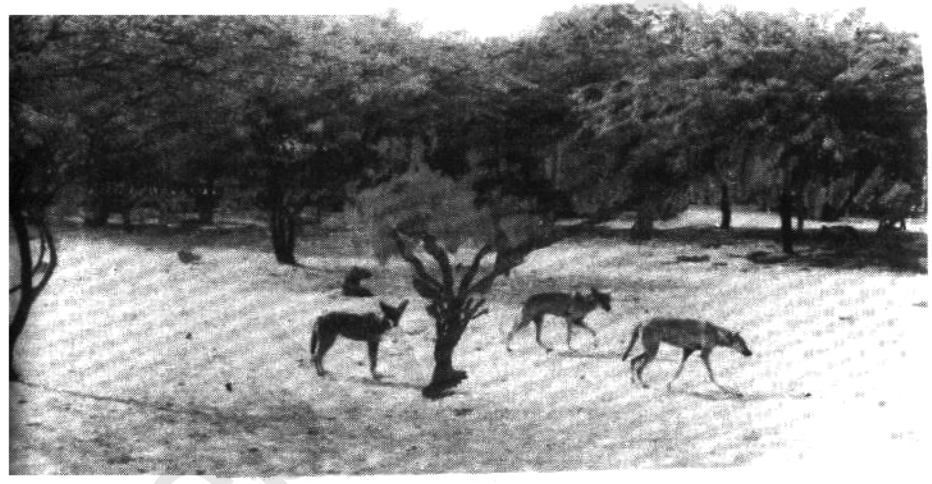

شاعر اپنے محبوب کے انتظار میں فراق کی شب تاریک میں کبھی جام و مینا سے روشنی کرتا ہے۔ کبھی شمع و پروانہ کے تذکرے کا اجالا کرتا ہے۔ کبھی شمع آرزو سے تاریکی کو شکست دیتا ہے۔ کبھی یادوں کے چراغ روشن کرتا ہے۔ اور آخرکار اشکوں کے ستارے جگمگا دیتا ہے۔ میرے پاس ان سب میں کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ اور شیر سے مجھ کو "عشق" وغیرہ قسم کی تحریکوں کا ربط بھی نہیں تھا۔

اندھیرے جنگلوں میں جو کچھ بھی روشنی ہوتی ہے وہ صرف چاند۔ یا ستاروں کی۔ اور وہ اس وقت تک تو تھی۔ مگر وائے اتفاقات۔

شام گہری ہوتے ہی نہایت ٹھنڈی اور آب خوردہ ہوا چلنے لگی۔ میں ہوا کو مرطوب نہیں کہنا چاہتا۔ آب خوردہ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اور ذرا ہی دیر بعد بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے نمودار ہونے لگے۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ پھر بھی کیا کیا جاتا۔ اور جب عشاء کی نماز پڑھ کر میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اندھیرے کی شدت میں مجھے اپنے ہاتھ بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اس وقت میری دعا میں جس بات کو خاص لجاجت سے کہا گیا ہوگا وہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ دس بجے بارش شروع

ہو گئی۔ پہلے تو بوندا باندی۔ پھر زور کی بارش، اس کے بعد جو موسلا دھار بارش ہوئی ہے تو میرے حواس بگڑ گئے۔ میں نے دوسرا کمبل بھی کھول کر سر پر تان لیا۔ ذرا دیر تو ضرور کچھ بچت رہی لیکن پھر وہی کیفیت بلکہ اس کو سر پر سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تو میں نے سمیٹ کر شاخ پر ڈال دیا۔ آدھی رات تک تو بارش رہی پھر زور کم ہوا تو جنوب مغرب کی طرف سے نئے بادل گرجتے ہوئے اٹھے جن کے ساتھ بجلی بھی خوب چمک رہی تھی۔ یہ گویا نئی مشکل تھی۔

ایک بار تو میں نے سوچا، درخت سے اتر کر گاؤں واپس جاؤں لیکن یہ بالکل ہی غیر دانشمندانہ حرکت ہوتی، خودکشی کے اس سے بہتر طریقے بھی ہوتے ہیں۔

صبح تک بجلی چمکتی رہی، بادل گرجتے رہے اور بوندا باندی کا سلسلہ بھی رہا۔ وسط اور جنوب ہند میں اگر بارش ہوتی ہے تو کھل کر ہوتی ہے۔ اور طویل سلسلہ رہتا ہے۔ باوجودیکہ میں خوب بھیگتا اور نہاتا رہا۔ تمام رات یہ کیفیت رہی لیکن اس حالت میں بھی کئی بار میری آنکھ لگ گئی اور میں نے بھی نیند کو روکنے کی ہرگز سعی نہیں کی پشت شاخ سے لگالی اور ہاتھ بھی نزدیکی شاخوں میں پھنسا کر اپنے کو موسم اور قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا شیر آیا۔ یا نہیں آیا۔ بھینسے کا باقی ماندہ آدم خور نے کھایا۔ یا دوسرے مردار خوروں کے پیٹ بھرے مجھے کوئی خبر نہیں۔ روشنی ہو گئی تو میں گہری نیند سو گیا۔ تاآنکہ نو بجے کے قریب آدمیوں کی آوازوں نے بیدار کیا۔ گاؤں والے ابھی درخت سے نسبتاً فاصلے پر تھے اور نظر نہیں آرہے تھے۔ دھوپ خوب نکل آئی تھی اور بادل ایسے غائب ہوئے تھے جیسے دبئی کا آسمان جہاں بھولے سے بھی بادلوں کا گذر نہ ہو۔ میں بھیگ کر شرابور تھا۔

میر صاحب نے درخت کے نیچے سے سلام کیا۔

بھینسے کی لاش غائب تھی۔

گاؤں کے دو آدمی درخت پر چڑھ کر میرا بھیگا ہوا سامان اٹھا کر نیچے لے گئے رائفل بھی میں نے نیچے لٹکا دی، اور اب جو اٹھنے کا ارادہ کیا تو آدھے نچلے دھڑ نے حرکت

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کرنے سے انکار کر دیا۔ کمر سے نیچے کا سارا حصہ قطعاً سن ہو کر رہ گیا تھا۔

"تشریف لائیے حضرت"

میر صاحب بولے

"دیر لگے گی۔ ٹانگیں سُن ہو گئی ہیں۔"

آخر کئی بار پہلو بدل بدل کر دوران خون کا معاملہ درست کیا، پیروں کو حرکت دی اور آہستہ آہستہ ٹانگوں میں جان آئی تو میں اُٹھا۔ دو چار بار بیٹھکیں لگائیں۔ اور بمشکل بارش سے بھیگی ہوئی شاخوں پر سے ہوتا پھسل کر نیچے اترا۔ اس وقت میری جو حالت ہو گی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ میر صاحب نے یہ عقلمندی کی تھی کہ میرے لئے دوسرا لباس لے آئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے کپڑے ہی بدلے۔ رائفل کو اچھی طرح خشک کیا۔ کارتوس محفوظ رہے تھے ان کو معائنہ کر کے رکھا، اور گاؤں واپس آگیا۔

اس وقت مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بھینسے کی لاش کے بارے میں سوچ سکتا۔

پہاڑی علاقوں میں بارش کے اثرات جلدی زائل ہو جاتے ہیں۔ مگر تمام رات جاری رہنے والی بارش کے اثرات فوری تو جانے کے نہیں تھے۔ تیسرے روز جنگل اس قابل ہوا کہ میں نکل سکوں۔ اور میں علی الصباح ہی راوا کو ساتھ لے کر سیدھا وہیں آیا جہاں بھینسا باندھا گیا تھا۔ اب تک جنگل کی زمین میں نمی کے اثرات تھے اور اور کہیں بھی ایسی بھربھری مٹی نہیں تھی جس پر کسی جانور کے پیروں کے صاف نشان بن سکیں الاوہ کھر دار جانور جو نوکیلے کھروں کے نشان ہر طرف چھوڑتے جاتے ہیں۔

یہاں سے میں اس جگہ گیا جہاں میں نے بھینسے کی لاش دیکھ کر درخت پر طوفانی رات گذاری تھی۔ اب وہ ادھ کھائی لاش بھی وہاں نہیں تھی۔ یعنی شیر نے اس طوفان اور بارش کے دوران ہی لاش پار کر دی تھی۔ اور تین دن کے دوران جنگل کے دوسرے مردار خوروں نے اس کی رہی سہی دھجیاں بھی بکھیر دی ہوں گی۔

میں پھر بھی اس باقی ماندہ کی تلاش میں تھا۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جس جگہ بھینسے کی ادھ کھائی لاش ملی تھی اور میں درخت پر بیٹھا تھا۔ وہ جگہ نالے سے کچھ ایسی دور نہیں تھی۔ نشانات کی تلاش بھی بیکار تھی۔ اتنی زور کی بارش کئی گھنٹے ہوتی رہی تھی۔ جس سے جا بجا پانی جمع ہونے بہنے اور زمین بہاؤ سے کٹ جانے کی علامات تھیں، شیر بھی عجیب بھوت تھا کہ ایسی حالت میں بھی دبک کر غار میں نہیں بیٹھا۔

جس طرف ہمیں جانا تھا اِدھر بانس کے جھنڈ میں۔ لیکن ویسے جنگل نسبتاً چھدرا ثابت ہوا۔ البتہ کئی گھنٹے کی سرگردانی بھی بے نتیجہ ہی ثابت ہوئی۔ اور تنگ آکر میں نے سوچا جہنم میں جائے بھینسے کی ادھ کھائی لاش، اب اس کی چند ہڈیاں مل بھی گئیں تو کیا ان کا اچار بناؤں گا۔

ہم نے نالا پار کیا۔ اور دوسری جانب کے پہاڑی جنگل میں گھومتے رہے۔ البتہ اس طرف ایک دوسرے نالے کی نم ریت پر، شیر کا آدھا پنجے کا نشان ملا۔ یہ نالا بالکل ہی زمین کا ہم کف تھا۔ اس لیے اگرچہ وسط میں پانی کی ایک لکیر چل رہی تھی لیکن بیشتر حصہ خشک تھا۔

نشان جس سمت راہنمائی کرتا تھا ہم ادھر چلے۔ اور چند قدم پر ہی نئے نشانات مل گئے۔ جو غالباً اسی صبح کے تھے۔ ان نشانات سے ایک نئی بات کا علم ہوا کہ شیر لنگڑا ہے۔ تین پیروں کے نشانات تو صاف نظر آتے ہیں۔ ایک پیر کا نشان نہایت کمزور بلکہ قطعاً نامکمل۔ کہیں کہیں پر اس نے چوتھا پیر زمین پر ٹکایا ہی نہیں تھا۔ اگلے صفحے پر ان نشانات کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ میں نے خدا جانے کس خیال کے تحت ان نشانات کے ایک حصے کا فوٹو لے لیا تھا۔ البتہ یہ جس قدر قدیم فوٹو ہے اس عرصے کے پیش نظر اتنا بھی نظر آنا برا نہیں۔ کیمرہ بھی کچھ غیر معمولی اچھا نہیں تھا۔ اب جو فوٹو کھینچے جاتے ہیں وہ یاشیکا، کینن، بولکر پینٹکس، نکان، منولٹا اور کئی دوسرے نہایت ترقی یافتہ اور غیر معمولی طاقتور

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

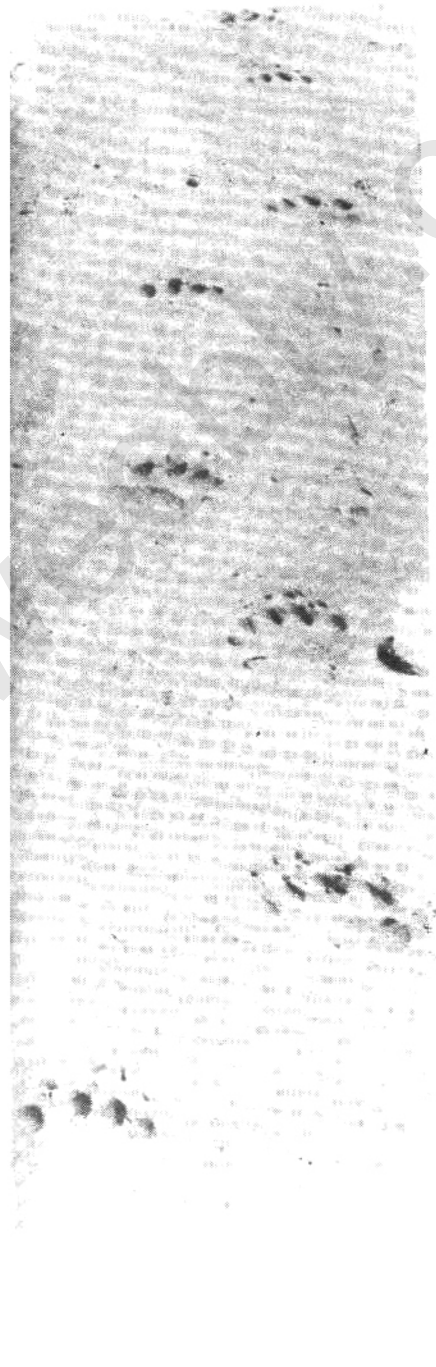

کیمروں سے کھینچے جاتے ہیں۔
یہ نشانات شیر کی شب گردی
کے آخری حصے کے نشانات تھے۔
یعنی وہ تمام رات جنگل پیمائی کرنے کے
بعد صبح کے قریب واپس اپنی قیامگاہ
کی طرف جا رہا تھا۔

قیامگاہ ۔۔۔!!

یہی تو تلاش کرنا تھی۔ اگر اس کا
علم ہو جائے تو آدھا کام تو ہو گیا۔!
لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔
جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے
نشانات کا سلسلہ بھی چلتا گیا۔ نالے
کی کیفیت وہی تھی۔ تقریباً ہم کف
ہی رہا ہوگا۔ فٹ ڈیڑھ فٹ گہرائی
تو معلوم بھی نہیں ہوتی۔ پہاڑی علاقوں
کے نالے سیدھے تو بہتے نہیں، جدھر
ذرا نشیب ملے اُدھر گھوم جاتے ہیں
اور یہ نالہ بھی مستقل پیچ و خم سے مُرتب
تھا۔ البتہ اس کی وسعت اتنی تھی کہ
کسی خم کے عقب سے شیر کے حملہ آور
ہونے کا احتمال نہیں تھا۔

اب ہم جس خطے میں وارد ہو رہے
تھے وہ اس جنگل سے مختلف ہوتا جا رہا تھا

جہاں سے ہم گذر آئے تھے۔ اور جو واقعات آئندہ میں لکھنے والا ہوں ان کو سمجھنے کے لیے جنگل کی نقشہ کشی ضروری ہے۔ اب تک ہم جس خطے میں گذر رہے تھے وہ چھدرے جنگل اور چھوٹی جھاڑیوں کا خطہ تھا۔ درخت بیشتر کوتاہ قامت تھے۔ کہیں کہیں ان بونوں کے درمیان میں کوئی تناور درخت بھی سر اُٹھائے جھوم رہا ہوتا۔ پہاڑی کے دونوں دامنوں پر جا بجا بانس کے جنگل تھے۔ لیکن یہ بھی چھوٹے۔

اب نالہ ایک پہاڑی گھاٹی میں داخل ہو رہا تھا جس کے دونوں جانب پہاڑیاں تھیں لیکن اس شکل میں کہ نالے پچیس تیس فٹ چوڑائی کے بعد سرسبز گھاس کے وسیع میدان کی شکل میں پہاڑی کے دامن بتدریج بلند ہوتے گئے تھے، اور کوئی سو دو سو گز بعد سے پہلے چھوٹے درخت اس کے بعد بلند اور خوب گھنے درخت بڑھتے گئے تھے، تا آنکہ کوئی نصف میل کے فاصلے کے اندر اندر ہی پہاڑی بن گئی۔ اور سر بلند ہو کر نالے سے تین چار سو فٹ اونچی ہو گئی تھی۔

ہماری پیش قدمی جاری تھی۔

نالہ دائیں جانب گھوما۔ اور موڑ کے فوراً بعد ہی یکبارگی درخت عین کنارے سے اُگے ہوئے ملنے لگے۔ گویا اب نالے کے دونوں کناروں پر گھنے جنگل ملنے لگے پہاڑ نزدیک آتے گئے۔ تاہم نالے کی چوڑائی کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ اور کوئی پچاس گز بعد نالہ جب بائیں جانب گھوما تو دونوں کناروں پر نہ صرف گھنا جنگل ہی ملا بلکہ درختوں تلے خوب گھنی اور لانبی سبز گھاس بھی۔ جو بارش میں نہا کر اور بھی شاداب نکل آئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے لہلہاتی گھاس جانوروں کو چھپانے کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔ اور یہاں اس روز پہلی بار گھاس میں سے دو سانبھروں کے سر نکل آئے۔ ان دونوں کے جسم گھاس میں پوشیدہ تھے۔ سر بھی اس لیے نظر آ گئے کہ ایک سانبھر نے مکھی بھگانے کے لیے کان کو حرکت دی، اور وہ میں نے دیکھ لی۔ ذرا اور آگے چیتلوں کا ایک بڑا منڈ ملا۔ اٹھائیس مادائیں اور سات نر۔ ان میں سر براہ ایک نہایت زبردست سینگو والا پرانا

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

خرانٹ تھا۔ جس کے سر پر سجی ہوئی ٹرافی مجھے خاص پسند آئی۔ مگر نہ صرف یہ کہ میں فائر نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس چیتل سے میری چپقلش بھی نہیں تھی۔ میں بلاوجہ جانوروں کو ہلاک نہیں کرتا۔

ہمیں دیکھ کر چیتل پہاڑی پر چڑھ گئے۔

نالے کی وسعت اور بڑھ گئی تھی۔

پہاڑی کی بلندی پر ایک درخت کی آڑ سے ایک پرانا چیتل ہمیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اب ہمارے اطراف میں درخت گھنے اور بلند تھے، اور ہم اس کو قطعاً نظر نہیں آئے۔ ان درختوں میں سے گذرتے ہم اور بڑھے تو جغرافیہ مزید بدلا۔ اب درختوں کے نیچے چھوٹے بڑے پتھر بھی ملنے لگے جو غالباً پہاڑ سے پانی کے ساتھ زمین سے کٹنے کی وجہ سے بہہ کر آ گئے ہوں گے۔ اور جہاں کہیں ٹھہرے وہاں اپنے لیے جگہ بنالی۔

کہتے تو یہ ہیں کہ پتھر اپنی جگہ پر ہی وزنی ہوتا ہے۔ جو اپنی جگہ سے ہل گیا اس کا وزن جاتا رہا۔ اس کی حیثیت ضائع ہو گی۔

لیکن شیر کہاں تھا۔ کدھر چھپا تھا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ کھانے کی خواہش بھی تھی اور نماز کا وقت بھی۔ میں نے راوا کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی خود رائفل نزدیک رکھ کر نالے میں بہتے ہوئے پانی کی دھار سے وضو کیا۔ اور وہیں نماز کی نیت باندھ لی۔ نماز تو صرف دو رکعت پڑھنا تھی۔ اور پھر ذرا عجلت سے ہی پڑھی۔ نماز کے بعد تھیلے میں سے کھانے کا سامان نکال کر کچھ خود کھایا کچھ راوا کو دیا۔ پانی کی بوتل ساتھ تھی لیکن میں نے نالے کا پانی ہی پیا۔ جنگل میں یہ پانی قطعاً صاف اور پاک ہوتا ہے۔

ابھی میں فارغ ہی ہوا تھا کہ ریچھوں کا ایک غول ہم سے دس گز کے فاصلے سے گذرا۔ ہمیں دیکھ کر ایک بڑا نر کسی قدر ٹھہرا۔ غالباً ہمیں دھمکانے کے لیے ایک قدم آگے بھی بڑھا۔ لیکن پھر ارادہ بدل کر جتھے کے ساتھ ہو لیا۔ چند

لمحوں بعد ہی وہ سب جھاڑیوں اور گھاس میں غائب ہو گئے۔

دراصل۔ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ جنگل میں۔ خصوصاً گھنے اور دور دراز جنگلوں میں دشت پیمائی کے دوران بیشمار جانور نظر آتے رہتے ہیں۔ کچھ چھوٹے کچھ بڑے بہت سے پرندے ملتے ہیں۔ بندروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اور شکاری ان سب کی حرکات کا مشاہدہ کرتا گذرا چلا جاتا ہے۔ اب اگر میں ان سب جانوروں کے بارے میں لکھنے لگوں تو اصل معاملہ تو رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اکثر ان تمام جانوروں کا ذکر نہیں کرتا۔ صرف اہم موقعوں کا تذکرہ کر دیتا ہوں۔

میں نے راوا سے اطراف کی زمین اچھی طرح دیکھنے کو کہا۔ اور نالے کے شمالی کنارے پر اس نے شیر کے ماگھ پیدا کر لئے۔ اگرچہ وہاں کی زمین ناہموار اور ہر طرف پتھر بکھرے ہوئے تھے۔

"یہاں سے گاؤں کتنی دور ہو گا۔؟"

میں نے راوا سے پوچھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم گاؤں سے کوئی دس میل دور نکل آئے ہوں گے۔

"سرکار۔ دو کوس۔"

دو کوس کا مطلب تھا آٹھ میل۔ میرے اور اس کے اندازے میں زیادہ اختلاف نہیں تھا۔

میں نے مہوے کے اس درخت کی طرف دیکھا جس میں اب کلیاں نکلی ہوئی تھیں اور بڑھ رہی تھیں، یہ کلیاں سست رفتاری سے بڑھ کر آخر بہار تک کھلنے کو تیار ہو کر وسط گرما میں پھول بن جاتی ہیں۔ ان پھولوں کو ہی مہوے کا پھول کہا جاتا ہے۔ یہ پھول۔ یا پھل۔ شیریں، قدرے تلخی لئے ہوئے۔ اور نشہ آور ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ جن کو نشے کی عادت ہو جائے وہ اس سے شراب بنا لیتے ہیں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

جنگلی جانور بھی ان پھلوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور خوب پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ ریچھ تو اس پھل کا بڑا ہی شائق ہوتا ہے اور خوب ہی کھا کر نشے سے بدمست اور شور شرابے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ نشے کے عالم میں۔ بلکہ نشہ تو نہیں صرف بدمستی کہنا چاہیئے۔ ریچھ ایک دوسرے سے خوب ڈھول دھپا کرتے، دھینگا مشتی برپا کرتے اور شور مچاتے ہیں۔ میں نے ان کی بدمستیوں کے مناظر خوب دیکھے ہیں۔

میری اگلی کتاب "شکارنامہ" چونکہ صرف آدم خور شیروں تک محدود نہیں ہے اس لیے اس میں سارے ہی درندوں اور چرندوں کے بارے میں خاصی مفصل گفتگو، تصاویر اور قصے شامل ہیں۔ اٹاری کی پاگل ریچھنی۔ اور سوات کے علاقے اوشان کے انسان دشمن ریچھ کے قصے بھی شامل ہیں۔ چیتوں، سانبھروں، چکاروں اور ہرنوں کے واقعات بھی ملتے ہیں۔

غرض اس ہوسے کے درخت پر مچان باندھنے کی اچھی جگہیں تھیں۔ میں نے سوچا اگر یہاں مچان پر بیٹھ کر دو چار راتیں اور چند دن گذارے جائیں تو شاید کچھ کام بن سکے۔

یہاں سے میں نے سمت کا اندازہ کر کے سیدھا گاؤں کی طرف واپسی کا ارادہ باندھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر پہاڑی چڑھ کر دوسری طرف اترا جائے تو فاصلہ کم ہو جائے گا اور کچھ نئے علاقوں کے معائنے کا بھی موقع ملے گا۔ اور میرے اشارے پر راوا اس طرف پہاڑی کی طرف چل پڑا جدھر چٹیل چڑھے تھے۔

اس وقت ہمارے جنوب میں گویا جس طرف ہم پہلے جا رہے تھے، شیر کے دھاڑنے کی آواز تین بار سنائی دی، فاصلہ کوئی میل بھر ضرور رہا ہوگا۔ اور آواز اطمینان کی حالت کی تھی۔ راوا ٹھہر کر آواز سننے لگا۔ میں بھی ٹھہر گیا۔

عجیب شیر تھا۔ کمبخت کو دوپہر کے وقت بھی چین نہیں تھا۔

"یہ جگہ یاد رکھنا۔"

"ہوسے کار۔"

مغرب سے ذرا قبل ہم گاؤں میں داخل ہوئے۔ چند روز قبل جس آبادی کا آدمی شیر کا شکار ہوا تھا اور میں نے لاش کی نشاندہی کی تھی۔ اس گاؤں کے تین آدمی آئے ہوئے تھے، میرے منتظر ملے جنھیں پولیس افسر یعنی مولوی تھانیدار نے ضلعداری کے باہر رکھ چھوڑا تھا۔ میں نہا دھو کر نماز سے فارغ ہو کر بیٹھا تو ان لوگوں کو پیش کیا گیا۔ ویسے میر صاحب ان سے پہلے بھی گفتگو کر چکے تھے۔

میں نے میر صاحب سے پوچھا وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ اردو تو انھیں آتی نہیں تھی۔ سب کنڑی بولنے والے تھے۔ میر صاحب نے بتایا۔

"ان لوگوں کا خیال ہے کہ شیر روز رات گاؤں کے اطراف میں موجود رہتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً، غوں غاں کر کے اپنی موجودگی کی اطلاع بھی کر دیتا ہے صبح یہ لوگ نکلتے ہیں تو چاروں طرف آبادی سے دو چار سو گز کے فاصلوں سے شیر کے ماگھ اور بیٹھے رہنے کے نشانات ملتے ہیں۔"

"یہ صورت حال کتنے روز سے پیش آ رہی ہے۔"؟

"آٹھ سات روز سے۔"

"ہوں۔"

"اس طرح گویا کام آسان ہوتا نظر آتا تھا۔

"میں صبح ان کے ساتھ جانے کو آمادہ ملوں گا انشاءاللہ۔"

"حضرت۔ میں بھی ساتھ چلتا۔"

"بسم اللہ۔"

"راوا کو ساتھ لے چلیں۔"

میر صاحب نے پوچھا

"مناسب رہیگا۔"

اس طرح ہمارا ہیڈ آفس جنجالی سے منتقل ہو کر گوڑا آ گیا۔ فاصلہ گیارہ بارہ

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میل رہا ہوگا تب ہی ہم صبح نکل کر گیارہ کے قریب گاؤں آگئے تھے۔ یہاں ایک عجیب بات یہ نظر آئی کہ گاؤں کے جنوب میں ایک سبز پوش پہاڑی کے عین دامن پر خاصا وسیع و عریض تالاب تھا۔ جس میں پہاڑی چشموں کا پانی آتا رہتا تھا۔ اور گاؤں کے وسط سے اسی تالاب کے پانی کی ایک تیز رو پُر آب نالی گذرتی تھی۔

گاؤں میں ایک مختصر مکان خالی کر کے ہمارے لیے درست کر دیا گیا۔ میں نے یہاں ٹھہر کر میر صاحب کے ساتھ چائے پی۔ اس کے بعد ہم دونوں تالاب اور گاؤں کے گرد و نواح کے معائنے کے لیے نکل آئے۔ گاؤں کے گرد کھیت اور جنگل تو تھے ہی۔ جہاں کہیں نرم زمین یا ریت تھی وہاں مٹے مٹے سے ماگھ بھی ملے تالاب کے کنارے زمین نم آلود تھی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ وہ جگہ جنگل کے جانوروں کی آب خوری کا واحد ذریعہ ہے۔ دیہاتیوں نے بتایا کہ کم از کم دس میل تک دوسری کوئی پانی کی جگہ نہیں ہے۔ نہ کوئی ندی نہ تالاب البتہ بارش کا پانی چند روز کے لیے ہر جگہ ہی گڈھوں میں بھر جاتا ہے۔

معاملہ طے ہوگیا۔

تالاب سے پچاس گز دور پہاڑ کے دامن کی ایک نسبتاً بلند جگہ پر پیپل کے درخت کو میں نے منتخب کیا، اور راوا کی سربراہی میں دیہات کے چند آدمیوں نے اس پر کھٹولا رکھ بھی دیا۔ لیکن — گاؤں کے ایک بوڑھے نے بیان کیا کہ پرانے سانپوں کا ایک جوڑا درخت پر ہی رہتا ہے — چنانچہ میں نے اس درخت پر لعنت بھیجی اور کھٹولا اتار لیا گیا۔ وہاں اب اور کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میں بہ آسانی چڑھ سکتا۔ لہٰذا مچان کا خیال ہی ترک کر دیا گیا۔

تالاب سے مشرق جنوب کی طرف ایک بڑی چٹان تھی، جس کو چھوٹی موٹی ٹیکری کہا جا سکتا ہے۔ — اس کے گرد بھی کئی چٹانیں تھیں، اور اس چٹان کے ساتھ ہی دوسرے پتھروں کے اوپر ایک بلند تر بڑی چٹان تھی جس کے ساتھ ہی جھاڑیاں اور درخت بھی اُگ آئے ہیں۔ اور بعض شاخیں چٹان کے سرے سے بلند تر تھیں —

میں نے اس پتھر پر بیٹھنا پسند کیا — نزدیک درخت کی شاخیں مجھے چھپانے کے لیے کافی تھیں۔

راوا بمشکل اس چٹان پر چڑھا — اوپر جگہ بہت کم تھی۔ لیکن اس پر قناعت کرنا تھا ایک کمبل رکھ دیا گیا تاکہ جگہ ذرا آرام دہ ہو سکے۔

میں اس چٹان پر عصر کی نماز کے بعد ہی چڑھ کر بیٹھ گیا — درخت کی نزدیکی شاخوں کو ایک ڈوری باندھ کر ویسے کھینچ دیا گیا کہ میں بہ آسانی ان کی آڑ میں رہوں۔ ساتھ شاٹ گن رکھی — اور رائفل تو ہاتھ میں تھی ہی۔

میرا محلِ وقوع کچھ یوں تھا کہ سامنے تالاب — تالاب کے اس پار گاؤں۔ پشت پر بلند درخت پوش پہاڑ۔ دونوں جانب میدان، اور اس کے بعد کچھ کھیت کچھ درخت — یہاں سے گاؤں کم از کم دس فٹ نشیب میں تھا۔

میں جس چٹان کے سر پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ تقریباً اٹھارہ فٹ بلند تھی لیکن اس طرح کہ دو تین چھوٹی چٹانیں ساتھ ہی لگی ہوئی تھیں۔ ان چھوٹی چٹانوں کی وجہ سے بڑی چٹان پر چڑھنا ممکن ہوا — البتہ یہ خطرہ تو ضرور رہا کہ اگر شیر چاہے تو جس طرح میں چٹان پر چڑھا اسی طرح وہ بھی چڑھ کر مجھے بہ آسانی دبوچ سکتا ہے، بشرطیکہ میں اس کو پہلے دیکھ کر ختم نہ کر دوں — اور مجھے اللہ کی عنایت اور فضل سے کامل توقع تھی کہ انشاءاللہ میں ہی اس کو پہلے دیکھوں گا اور اس کی ہلاکت آفرینی کا دور ختم کر دوں گا۔

شام ہوئی تو وہاں سے گاؤں کا منظر خاصا دلچسپ ہوگیا۔ جنگل کی اندھیری خاموشی میں لالٹینوں اور چراغوں کی دھندلی روشنی — ملگجے پن میں اضافہ کر رہی تھی۔ کیونکہ روشنی تو اس سے ہونا نہیں تھی — ایک تو جنگل میں یوں بھی اندھیرا زیادہ ہیبتناک ہی ہوتا ہے۔ اور بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ گھنے جنگلوں کے قریب جو گاؤں یا آبادیاں ہوتی ہیں ان کے ہیولے رات کے وقت عجیب بھیانک سی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگرچہ وہی دیوار و در ہوتے ہیں جن میں ہر جگہ انسانوں کی آبادی ہوتی ہے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

آدمیوں کا مسکن ہوتے ہیں۔ لیکن اندھیری رات میں یہ درودیوار بالکل مختلف نظر آنے لگتے ہیں۔

رات کے وقت تبدیلیٔ ماحول اتنا پر اسرار ہوتا ہے کہ شہر کے آشنا کوچہ و بازار عجیب سے لگتے ہیں۔ جنگل اور ویرانے کا تو ذکر ہی کیا۔

بہر حال ـــ

وہ رات بھی دوسری راتوں کی طرح بے آرام گذری۔

نصف شب کے قریب بے شمار جانوروں کے تالاب پر آکر پانی پینے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ نیل گائے۔ ہرن، چتیل، چکارے، سانبھر، اور بارہ سنگھے جو میرے آشیانہ سنگیں سے قریب ہوتے ان کے گہرے گہرے ہیولے بھی نظر آجاتے۔ آدھی رات کے قریب پچاس ساٹھ سوروں کا ایک غول میری چٹان کے پاس سے ہی گذر کر تالاب کی طرف گیا، اور ان سب نے مل کر وہاں خاصا غل غپاڑا مچایا۔ پانی میں بھی دوڑ دھوپ لگائے رہے۔ کوئی آدھا گھنٹہ صرف کرنے کے بعد واپس ہو گئے۔

یہ بات بیشک درست تھی کہ تقریباً سارے ہی جانور پہاڑ کی طرف سے آئے جو میری پشت پر تھا۔ چند غول جنوب کی جانب سے بھی آئے جدھر گاؤں والوں کے کھیت بھی تھے۔ نصف شب کے بعد سے تالاب پر سکوت طاری ہو گیا۔ لیکن وہ سکوت جو جھینگروں، مینڈکوں اور دوسرے حشرات کی ان آوازوں سے ترکیب پاتا ہے۔ اور جب اس قسم کا سکوت طاری ہو تو گویا جنگل اپنے بادشاہ کی آمد کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔

میں بھی آدم خور لنگڑے سے مقابلے کو تیار تھا۔ لیکن تین بجے سے صبح تک تالاب کے کناروں پہ کامل خاموشی رہی۔ میں نے تیمم کر کے تہجد کی نماز پڑھ لی۔ اور ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ دو چکارے ـــ جو پانی پی رہے تھے۔ بدک کر بھاگے۔ اور پہاڑ کی طرف جانے کے بجائے سیدھے شمال کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ رات کے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

سناٹے میں ان کے کھروں کی آواز دور تک آتی رہی۔ میں اب بالکل ہی آمادہ ہو گیا اس لیے کہ ان کا اس طرح چکاروں کا بدک کر بھاگنا شیر کی آمد کا اعلان بھی ہو سکتا ہے۔

اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا کچھ آسان بات نہیں ہے۔ اور پھر ذرا دیر نہیں۔ ساری رات۔ البتہ نظریں تھکتی نہیں۔ صرف نیند کی پریشانی رہتی ہے۔ اور میرے جاگنے کی عادت ہو جانے کی وجہ سے صبح کے قریب سر بھاری ہو جاتا ہے۔ اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

فجر کی نماز کے وقت میں نے از سر نو تیمم کر کے دوگانہ فجر ادا کی۔ ذرا دیر بعد ہی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی۔ میں نے گاؤں والوں کو تاکید کر دی تھی کہ خوب روشنی ہونے سے پہلے وہ گھروں سے ہرگز نہ نکلیں۔ چنانچہ دھوپ پھیلتے گاؤں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں بھی اپنی "تکلیف دہ کمین گاہ سے اتر کر گاؤں کی طرف آگیا۔ راستے میں ہی میر صاحب اور راوا آتے مل گئے۔ راوا نے چٹان پہ سے میرے ہتھیار اور سامان اتارا۔

"آج تو شیر نہیں آیا۔"

وہ بولے

"ہاں۔ میں جانتا ہوں آیا تو ضرور۔ کوئی تین ساڑھے تین بجے۔ لیکن میری زد میں یا حد نگاہ میں نہیں آیا۔"

"اچھا۔"

"اُمید کہ آج رات شاید نظر آجائے۔"

"گارا باندھا جائے حضرت۔"

"نہیں ابھی ایک دو راتیں گارے کے بغیر ہی گذارنے دو۔"

نہانے اور ناشتہ کرنے کے بعد میں آرام سے لیٹ کر ذرا دیر کتاب دیکھتا رہا۔ اس کے بعد نیند آگئی۔ ظہر سے ذرا قبل میر صاحب نے جگایا۔ میں کچھ زیادہ ہی سو گیا تھا۔ اُٹھ کر ظہر پڑھی۔ پھر کھانا لگا دیا گیا۔ میں اور میر صاحب شکار کی ہی باتیں

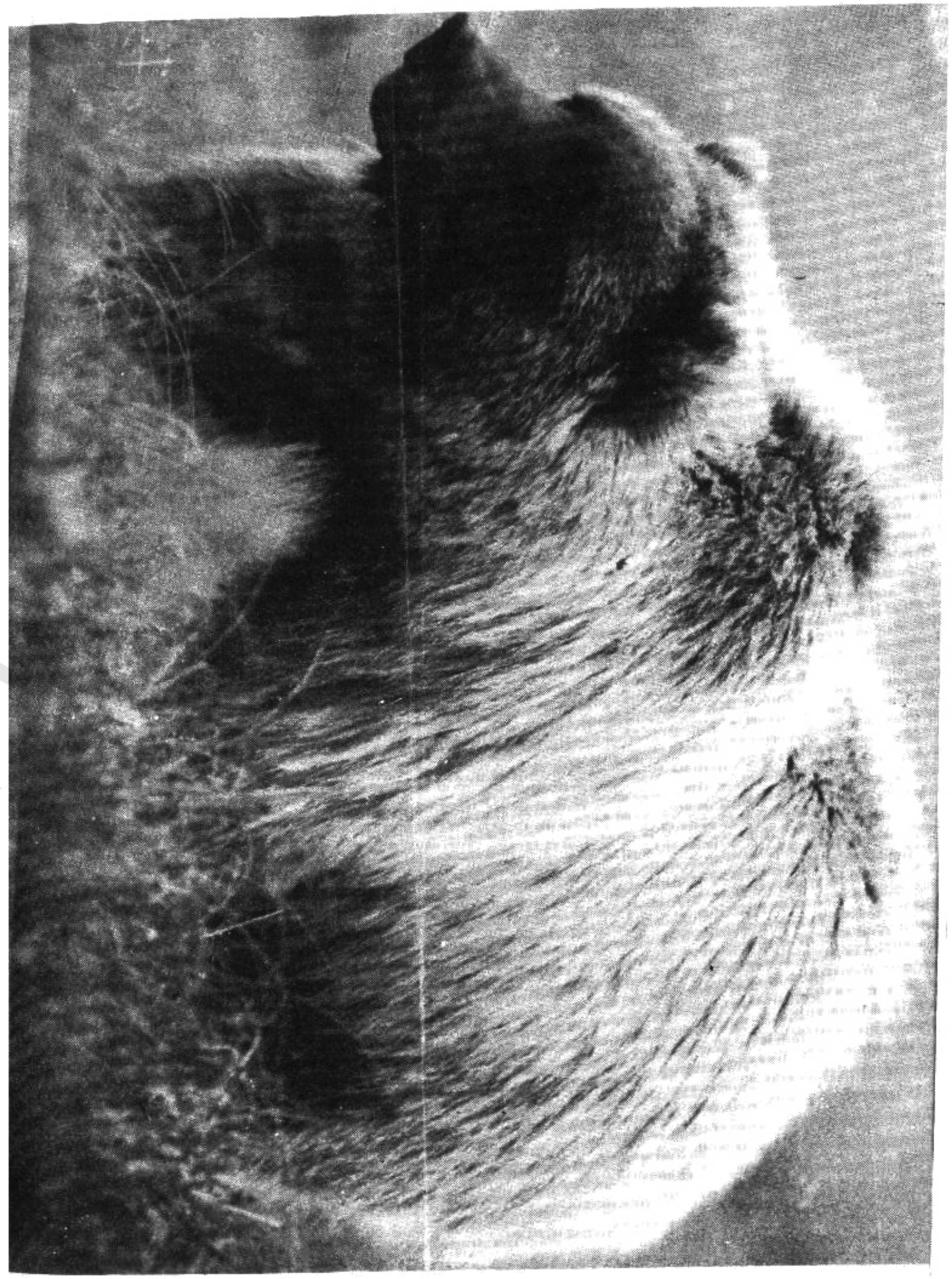

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کرتے رہے۔ کھانے کے بعد میر صاحب بھی کمرے کے دوسرے سرے پر بچھے ہوئے پلنگ پر قیلولہ کے لیے لیٹ گئے۔ اور میں پھر سو گیا۔ میر صاحب خاصے بور ہو رہے تھے۔ ان کی کوئی مصروفیت ہی نہیں تھی۔ کھاتے تھے اور آرام کرتے تھے۔ جنگل میں جانا یا شکار کھیلنا ممنوع ہونے کی وجہ سے ان کے لیے یہ شغل بھی نہیں رہا۔ اور پھر میری رائفل ضائع ہو جانے کے سبب سے ان کی رائفل بھی میرے قبضے میں تھی۔

عصر کی نماز میں نے ذرا دیر سے پڑھی اور چائے پی کر شب گذاری کے لیے تیار ہو گیا۔ رات کا کھانا ہی کیا۔ ایک موٹی سی باجرے کی روٹی اور اس کے ساتھ کوئلے کی آگ پر بھنی ہوئی تیتر کے گوشت کی بوٹیاں۔ پانی کی بوتل، وغیرہ۔ سب سامان راول نے چٹان پر رکھوا دیا۔ مغرب کی نماز سے پہلے میں بہ اطمینان اپنی جگہ جم گیا۔ اور میر صاحب مجھے خدا حافظ کہہ کر واپس گئے۔ ان کے جانے کے بعد جنگل کی کیفیات پھر اسی ترتیب سے شروع ہو گئیں جن کا میں کئی بار تذکرہ کر چکا ہوں اور میں اس وقت اپنی نئی غزل کے اشعار موضوع کرتا رہا۔ جس کے چند اشعار یوں ہیں۔

لازم ہے بہ ایمائے نگاراں ہی کہا جائے
افسانۂ غم بالب خنداں ہی کہا جائے
محفوظ کنارے پہ بھی رہ کر نہیں کوئی
ساحل کو بھی دیباچۂ طوفاں ہی کہا جائے
اک یہ بھی تو خوشبوئے بہاراں کی ہے تدبیر
افسانۂ گیسوئے پریشاں ہی کہا جائے
جو فصل بہاراں کے امیں ہیں انھیں ضد ہے
زنداں کو مرے صحن گلستاں ہی کہا جائے
نافذ یہی قانون ہوا شہر وفا میں
فریاد کرے جو، وہ غزلخواں ہی کہا جائے

ہوں میں بھی ترا شعلہ بجاں اور مجھے اب
پروانۂ سر شمع فروزاں ہی کہا جائے

یہ غزل مغرب کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر عشاء کے وقت مکمل ہوئی۔ لکھنے کی تو کوئی تدبیر نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ غزل جب الہامی ہوتی ہے تو اشعار ذہن میں رہتے ہیں۔ اور زیادہ عرصہ نہ گذرے تو لکھے جا سکتے ہیں۔ میں دوسرے روز تک لکھ سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ وقت گذر جائے تو بھول ممکن ہے۔ البتہ یہ نہیں کہ مجھے ساری غزلیں یاد ہوں۔ صرف نئی غزل کچھ دیر یاد رہتی ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد گاؤں سے بہت دور جنوبی جنگل میں شیر کے ڈکار کے ڈکارنے کی آواز آئی۔ اس کے دو گھنٹے بعد یکبارگی تالاب کے کناروں پر کامل سکوت طاری ہو گیا۔ حتیٰ کہ جھینگر اور مینڈک بھی چپ ہو گئے۔ اور اسی خاموشی کے عالم میں تالاب کے دور دراز شمالی کنارے سے کسی درندے کے پانی پینے کی چپڑ چپڑ کی آواز آنا شروع ہوئی۔ یقیناً شیر تھا۔ میں نے رائفل کا رخ ادھر کیا۔ اور دیر تک دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کہ ذرا سا سایہ ہی نظر آئے مگر فاصلہ زیادہ تھا۔ اور غالباً وہ موذی تالاب کے کنارے دور پر جو دو تین جھاڑیاں تھیں ان کی آڑ سے پانی پی رہا تھا۔

شیر پانی پینے میں پندرہ بیس منٹ لگاتا ہے۔

میں نے سوچا اگر میں چٹان سے اتر کر جھاڑیوں کی آڑ لیتا۔ آواز کی طرف چلوں تو یقیناً ایسی جگہ پہنچ سکتا ہوں جہاں سے شیر پر نظر پڑ سکے۔

میں نے اس غلط فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں کی۔ چٹان کے پیچھے اترا۔ پہلے بندوق اتار کر شانے پر لٹکائی۔ پھر رائفل ہاتھ میں لی اور سیفٹی کیچ کھول دیا۔ تاروں کی روشنی میں بیس پچیس گز کے فاصلے تک کا منظر۔ صاف یا مناسب حد تک صاف نظر آتا تھا۔

ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی تک میں جھکا جھکا گیا۔ اور یقیناً قطعاً آڑ

http://updf.weebly.com

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں تھا ۔ اس تمام عرصہ چپڑ چپڑ کی آواز وقفوں سے آتی رہی ۔ کچھ چھوٹے درخت راہ میں آ گئے ۔ ان سے بھی آڑ ہو گئی ۔۔ اور پھر پانی پینے کی آواز یک دم موقوف۔

میں اس وقت ایک نہایت مناسب جھاڑی کے پاس چھپا ہوا تھا کہ صرف دس بارہ گز کے فاصلے پر شیر نمودار ہوا ۔ شیر ۔!

ننگنڈے کا لنگڑا ۔ جس نے خلقِ خدا کا خون اپنے پر حلال کر رکھا تھا ۔

اس کا ایک پچھلا پیر لنگڑا تھا ۔

وہ چلتا تو کمر ایک جھٹکے سے جھکتی ۔ اور پچھلا پیر گھسیٹ کر چلتا ہوتا تھا ۔

پھر بھی رات کے وقت شیر کو صرف دس گز سے دیکھ کر میری عجیب حالت ہوئی ۔

اچھا ہوا میرے اور اس کے درمیان جھاڑی تھی ۔ اور اس کا رخ سیدھا اسی چٹان کی طرف تھا جدھر سے میں آیا تھا ۔ میں اس وقت اگر ذرا سی بھی حرکت کرتا تو وہ ضرور مجھے دیکھ لیتا ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا صرف ایک ہی ردِ عمل ہوتا ۔ یعنی حملہ ۔۔ اور دس گز سے شیر اگر حملہ کر دے تو میں نہیں جانتا کس طرح کوئی جاندار جانبر ہو سکتا ہے ۔ اس حملے کی سرعت کا مقابلہ انسان کے لئے ممکن نہیں ۔

شیر کو اتنے قریب سے رات کے وقت میں نے صرف دو بار دیکھا ہے ۔

اور دونوں بار ۔ غالباً ۔ سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں گے ۔

اعصاب قطعاً ماؤف ہو گئے ۔ اور اعضاء کی حرکت کرنے کی اہلیت معطل ہو گئی ۔

لیکن مجھ پر اس قسم کے اثرات دیرپا نہیں ہوئے ۔ اولین لمحات میں جو یکبارگی منظر سے صدمہ پہنچتا ہے اس سے مندرجہ بالا کیفیات پیدا ہوتی ہیں ۔ اور چند لمحوں ، بلکہ کہنا چاہیئے ۔ چند ثانئے کے اندر ہی اللہ تعالیٰ کی اعانت اور فضل شاملِ حال ہو کر ان سارے اثرات کو زائل کر دیتا ہے ۔ پھر میری ساری اہلیتیں بیدار ہو کر آمادہ بہ کار ہو جاتی ہیں ۔

مجھے اس وقت احساس ہوا کہ اتنے اندھیرے میں صرف چپڑ چپڑ پانی پینے

کی آواز سن کر محفوظ جگہ چھوڑ دینا اور شیر کی تلاش میں چل پڑنا کتنا غیر دانشمندانہ فعل تھا ۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

شیر اندھیرے میں بھی اسی آسانی سے دیکھ سکتا ہے جس آسانی سے دن کی روشنی میں ۔ برخلاف اس کے ۔ انسان کو رات کے اندھیرے میں دیکھنے کی قوت عطا نہیں کی گئی ۔ اب یہ کہ شیر کامل اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے یا نہیں ۔ یہ کہنا مشکل ہے ۔ البتہ رات کے وقت ہی شیر نکلتا اور شکار کرتا ہے ۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں کہ اندھیرے میں وہ بہت اچھی طرح دیکھ سکتا ہے ۔

خانگی بلیاں شیر کی ہی نسل سے ہیں ۔ دونوں کی عادتیں ۔ طرزِ عمل ۔ قوتیں بالکل ایک سی ہیں ۔ فرق صرف جسامت کا ہے ۔ یا رشتے کا ۔ بلی شیر کی خالہ ہوتی ہے ۔ لیکن خالہ اور بھانجے دونوں کی حرکات یکساں ہوتی ہیں ۔ لہٰذا بلّی کے طرزِ عمل سے شیر کی قوتوں کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے ۔

شیر جس زاویے سے گذر رہا تھا ۔ اس طرح اس کا پورا جسم ۔ سر سے لے کر دم تک میرے سامنے اور میری زد میں تھا ۔ صرف فائر کی دیر تھی ۔

کیا نشانہ صحیح لگے گا ۔ ؟!

ایک ہی فائر کا وقت تھا ۔ اور اس فائر پر ہی میری اور شیر کی زندگی کا دارومدار تھا ۔ اگر شیر کے گولی نہیں لگی تو اس کا حملہ کرنا بالکل ناگزیر ۔ اور حملے کی صورت میں میری بربادی لازم ۔ اتنے قریب سے شیر کا حملہ جس سرعت سے ہوتا اس کے پیشِ نظر میرے بولٹ چلا کر دوسرا کارتوس چیمبر میں میں لانے کی مدت خاصی دراز ہوتی ۔ جب تک دوسرا کارتوس چیمبر میں آتا تب تک شیر مجھے دبوچ چکا ہوتا ۔

تو کیا ۔ شیر کو جانے دیا جائے ۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

اتنے دنوں کی کوشش۔ شب بیداری۔ تگ و دو۔ اور جانفشانیوں کے بعد تو یہ موقع آیا تھا۔ اب اس کو نکل جانے دینا۔ بہت بڑی غلطی ہوتی۔

کیا اتنے قریب سے رات کے وقت فائر غلطی نہیں ہو گی۔ !!

رات کے اندھیرے میں نہ تو رائفل کا دیدبان نظر آئے گا۔ نہ صحیح نشانہ لگے گا۔

لیکن ---!

شیر اب بارہ گز پر تھا۔ اور زاویہ ذرا ترچھا اوپر کی طرف۔

میری رائفل کا سیفٹی کیچ تو کھلا ہوا تھا ہی۔

ایک بار میں نے رائفل اٹھائی اور کندہ شانے سے لگ گیا۔ نظر دیدبان پر ہوتی شیر تک پھسل گئی۔ انگشت شہادت نے ٹریگر کو دبایا۔

اللہ غنی۔ شیر نے اسی وقت سر گھما کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک مجھے نظر ضرور آئی۔ لیکن میں اپنے ہدف کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اور فوراً ہی فائر ہوا۔

رات کا سناٹا یکبارگی زبردست دھماکے سے شکست ہوا۔ اور شیر جہاں تھا وہیں کچی دیوار کی طرح گر گیا۔

میں نے بولٹ چلا کر کارتوس نکالا اور دوسرا کارتوس چیمبر میں آ گیا۔ میں نے گردن اور سر کے جوڑ کا نشانہ لے کر ایک فائر اور کیا۔ یہ گولی شیر کے نہیں لگی۔ اس کے قریب گرد اڑا کر رہ گئی۔ میں نے فوراً تیسرا فائر کیا۔ اور اس بار گولی صحیح لگی۔

شیر نے کوئی حرکت نہیں کی۔

میں نے چوتھا کارتوس چیمبر میں لگا لیا۔

سارا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ کچھ گھروں سے کئی لوگ مشعلیں لے کر برآمد ہوئے۔ اور میر صاحب نے مجھے آواز دی۔

"ہاں ---"

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

میں نے جواب دیا۔

"خیریت ہے نا حضرت۔"

"الحمد للہ۔ شیر فنا ہو گیا۔"

"ماشاءاللہ۔ اور پھر انھوں نے راوا کو آواز دی۔" راوا۔ او راوا۔ آجارے۔

"ہو سرکار۔" راوا نے جواب دیا۔

"میر صاحب۔ ابھی ادھر نہ آنا وہیں ٹھہرو۔" میں نے ان کو ہدایت کی۔

"کیوں۔ ؟

انھوں نے جواب دیا۔

"تھوڑا وقت گذر جائے تو مجھے اطمینان ہو۔"

اس عرصے میں ہٹ کر میں شیر سے ذرا دور آ گیا تھا اور رائفل سے اس کے سر کا نشانہ لئے تھا۔ ادھر ذرا حرکت ہو اور میں ایک فائر اور جھونکوں۔ مگر اس کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ اس عرصے میں گاؤں کے سب ہی لوگ بیدار ہو چکے تھے۔ اور ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ کچھ بچے بھی نکل آئے تھے اور شور کئے ہوئے تھے۔

اب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور سجدہ شکر ادا کیا۔

"میر صاحب۔"

میں نے آواز دی

"جی ہو حضوت۔"

"آجاؤ۔"

اور گاؤں کے لوگ مشعلیں لئے دوڑتے ہوئے ادھر چل پڑے۔ مجھے بلندی سے آدمی تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن بھاگتی ہوئی مشعلیں بیشک دکھائی دے رہی تھیں۔ اندھیرے میں دوڑتی ہوئی روشنیاں۔

اندھیروں سے ہی تو اجالے نکلتے ہیں۔

شیر کا جو فوٹو شامل ہے وہ صبح خوب روشنی ہونے کے بعد لیا گیا جبکہ شیر کی لاش اکڑ چکی تھی۔ لیکن وہ عین اس جگہ پر ہے جہاں میں نے اس کو ہلاک کیا تھا۔

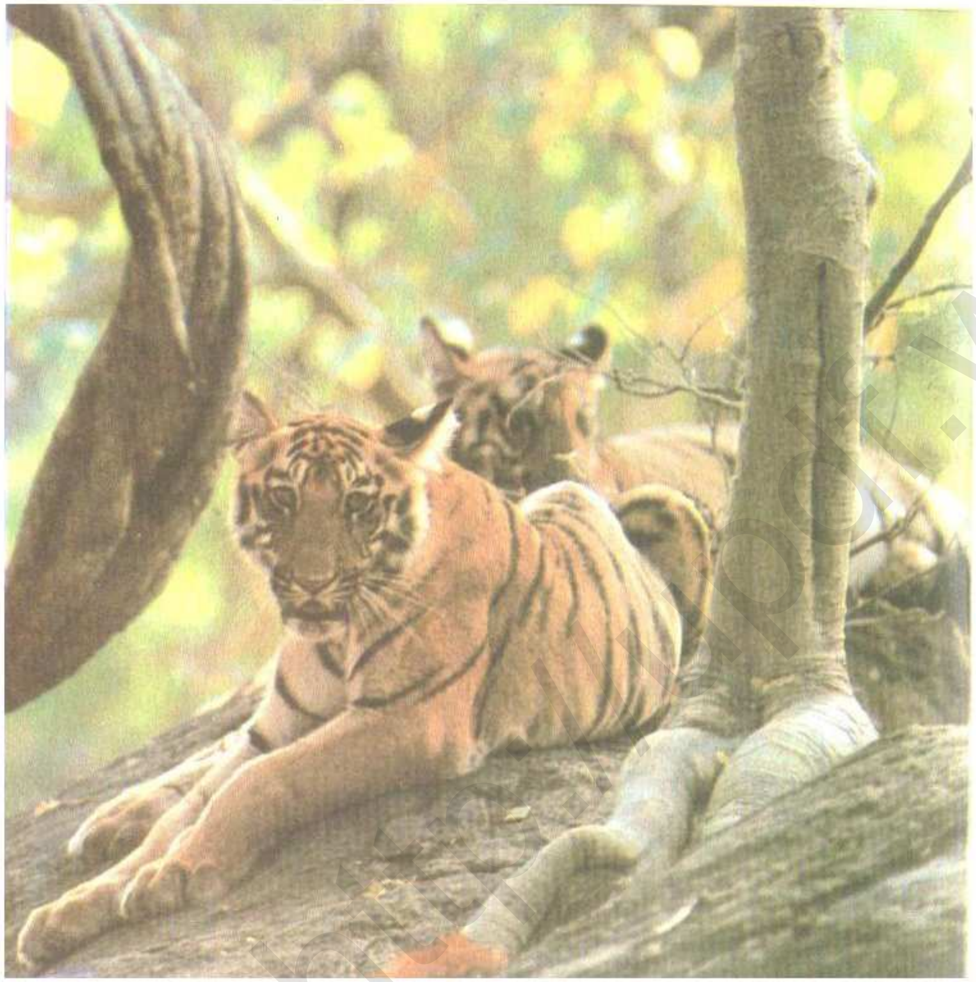

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

مادھوپور کا آدم خور

پہلے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کہانی کے آغاز میں جو میری تصویر دی گئی ہے اس میں زمین پر پڑا ہوا جانور ہڑیال ہے۔ جسے انگریزی میں MOUNTAIN SHEEP یا پہاڑی بھیڑ کہتے ہیں۔ بھیڑ اور بکری کا فرق سب کو معلوم ہے۔ اب یہاں ہڑیال کے بھیڑ کے قبیلے میں شامل ہونے کی تصریح غیر ضروری ہے۔ یہ ہڑیال میں نے ٹنڑ کی ریلوے اسٹیشن سے دو میل کے فاصلے پر پہاڑوں میں شکار کیا تھا۔ جو ہتھیار پاس رکھے ہیں ان میں سے ایک ایپ ایکشن رائفل تھری اسپرنگفیلڈ ہے، جو چارلی ان مین نے میرے ہاتھ فروخت کی تھی۔ اور پاس ہی میری شاٹ گن رکھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ہڑیال کو مارنا پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ لیکن اس ہڑیال کے ساتھ ہی وہ بڑا ہڑیال تھا جس پر کوئی تین سو گز کے فاصلے سے نشانہ لیا۔ عین فائر ہوتے ہوتے اس نے ذرا سی حرکت کی تو گولی اس کو لگی۔ سینگ کی پیمائش کی تو ساڑھے تئیس انچ نکلے۔ وزن کا اندازہ پچیس سیر کیا گیا۔

اس صفحے پر اوپر جو ہاتھیوں کی تصویر ہے وہ برِصغیر کے ہاتھی نہیں ہیں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

افریقی ہاتھی ہیں۔ ہاتھیوں کے بارے میں میری معلومات وسیع نہیں۔ اور ابھی تک میں نے ہاتھی شکار نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں اب اس شکار کا موقع شاید ہی ملے کیونکہ افریقہ میں بھی ہاتھی کا شکار قطعاً ممنوع ہو چکا ہے۔ ۱۹۸۵ء کے شکار کے موسم میں میرا کینیا میں شکار کھیلنے کا پروگرام ہے۔ اللہ مالک ہے۔ اس میں ببر شیر کا شکار بھی شامل ہے جس کے بارے میں میرا کچھ اچھا گمان نہیں۔ ببر نہ صرف سست درندہ ہے بلکہ اس کا شکار، ہمارے شیر کے برابر دشوار اور خطرناک بھی نہیں ہے۔

جنگل کی اندھیری رات نہایت دہشتناک ہوتی ہے۔ بعض کمزور اعصاب کے لوگوں پر تو اتنی ہیبت طاری ہوتی ہے کہ جان پر بن جاتی ہے۔ خصوصاً اگر اس اندھیری رات کا تعلق اس جنگل سے ہو جس میں شیر — یا — آدم خور شیر کی موجودگی کا یقین بھی ہو — ابتدائی دور میں ایک عرصے تک میں جنگل میں تنہا مچان پر بیٹھنے سے نہ صرف گھبراتا تھا، بلکہ کوشش کرتا تھا کہ ایک دو آدمی ساتھ بیٹھیں۔ اس کے باوجود رات گذارنے کے بعد آئندہ جنگل میں رات نہ گذارنے کا عہد کر لیتا۔ مگر یہ وہ عہد ہوتا جس کو جلدی ہی توڑ دیا جاتا تھا۔ ایک مدت گذرنے کے بعد میرے ذہن سے دہشت کا تصور ہی جاتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ گھنے اور خطرناک جنگل میں جس قدر تحفظ کا احساس ہوتا ہے، اتنا آبادی میں نہیں ہونا چاہیئے۔ درخت پر بیٹھنے کے بعد شیر کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔

اور پھر انسان خود سب سے بڑا خطرہ ہے۔

مجھ سے میرے احباب، جن کو جنگل کا تھوڑا بہت تجربہ ہے۔ پوچھتے رہتے ہیں۔ کبھی جن، بھوت، چڑیل وغیرہ سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ اور میں جواب میں صرف نہیں کہہ کر رہ جاتا ہوں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ بجز ایک اتفاق کے جس میں مجھ کو کسی روح کی مدد کا شبہ سا ہوا۔ نہ مجھے بھوت ملا نہ چڑیل — میں تو عہد طفلی سے ہی جن کی تلاش میں رہا۔ جہاں جنوں یا بھوتوں کی موجودگی کا علم ہوا وہاں تنہا گیا۔ کبھی چھڑی لے کر، کبھی رائفل لے کر۔ مگر کوئی نہیں ملا۔

میں جنگلوں میں رات کے وقت بیل گاڑی پر سفر کرنے سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات حالات ایسا رخ اختیار کر لیتے ہیں جن کا تدارک ممکن نہیں ہوتا۔

یہ ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے۔ میں بھارت تین ماہ کے ویزا پر گیا تھا۔ اور اپنے دوست صغیر کے ساتھ پیلی بھیت میں شکار کھیلتا رہا۔ صغیر محکمہ جنگلات میں ہی ملازم ہیں اس لیئے ان کو خاصے اختیارات حاصل رہے ہوں گے۔ وہاں سے چند روز کے لیے انا ڈ گیا۔ پھر ناگپور کا رخ کیا جہاں عزیز اللہ خان میرے منتظر تھے۔ روانگی سے پہلے میں نے اپنے ایک اور عزیز دوست عظمت خان کو تار دیدیا اور ان سے اسٹیشن پر مل لینے کا تقاضا کیا۔ وہ ہوشنگ آباد میں رہتے تھے، اور ان سے ملاقات نہ ہوتی تو افسوس رہتا۔ ہوشنگ آباد بڑا اسٹیشن تو نہیں لیکن میل ٹرین بھی چار منٹ وہاں ٹھہرتی ہے۔ اور عظمت خان سے اتنی ملاقات بھی غنیمت تھی۔

ٹرین صبح نو بجے ہوشنگ آباد کے پلیٹ فارم پر ٹھہری، میں دروازے پر ہی کھڑا تھا عظمت کو میں نے اور انھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ ٹرین رکتے رکتے وہ کود کر اوپر اور بغلگیر — اور فوراً ہی انھوں نے ایک آدم خور کا تذکرہ شروع کر دیا جو ہوشنگ آباد سے تیس میل جانب مشرق، مادھوپور کے نواح میں ہلاکت پھیلائے ہوئے تھا۔

میں لکھ چکا ہوں ہوشنگ آباد میں ٹرین صرف چار منٹ ٹھہرتی ہے۔ عظمت خان کے بیان میں ہی اتنا وقت گذرا کہ گارڈ، اپنی لال اور ہری جھنڈیاں بغل میں دبا کر پلیٹ فارم پر واقع دفتر سے نکلا۔ اور گھڑی دیکھتا ہوا اپنے کمپارٹمنٹ کے قریب جا کر رک گیا۔ کمپارٹمنٹ میں میرا سامان — بستر، رسالے، اخبار۔ کپڑے، سوٹ کیس، بکھرا پڑا تھا، فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ صرف ایک ہی مسافر اور تھا۔ اور میں بہت آرام سے سفر کرتا آرہا تھا۔ اب جو عظمت نے یہ قصہ بیان کیا تو میں نے سوچا وہیں اتر جاؤں اور ہم دونوں نے بجید پھرتی کے ساتھ سامان سمیٹ کر پلیٹ فارم پر پھینکا۔ دو قلی بھی دوڑ پڑے اور ابھی یہ سب ہو ہی رہا تھا

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کہ گارڈ نے وسل دی، انجن نے سیٹی بجائی — اور فوراً ہی ٹرین رینگنے لگی ۔ پہلے عظمت اور ان کے ساتھ ہی میں چلتی گاڑی سے کود گئے ۔ ہوشنگ آباد کے پلیٹ فارم کے کناروں پر پتھر کی بڑی بڑی سلیں لگی ہیں اور ان کے بعد ساری جگہ پر سرخ بجری بچھی ہوئی ہے ۔ اس بجری پر دوڑنا خطرناک ہے اگر پھسل کر گرنے کی نوبت آئے تو گھٹنوں اور کہنیوں کا زخمی ہو جانا پکی بات ہے ۔

عظمت کا تانگہ باہر موجود تھا ۔ قلیوں نے سامان رکھ دیا تو عظمت نے انہیں اجرت ادا کی اور ہم پچھلی نشست پر بیٹھ گئے ۔ گھوڑے نے روانگی میں ذرا بھی تکلف نہیں کیا ۔

"مادھو پور کا آدم خور عجیب و غریب درندہ ہے —"

عظمت نے اپنا بیان جاری رکھا ۔

"اچانک ہی کسی جگہ نمودار ہو جاتا ہے ۔ اور اسی سرعت کے ساتھ غائب بھی ہو جاتا ہے ۔"

"اس کی آدم خوری کی مدت کیا ہے ۔"

میں نے سوال کیا ۔

"تم گذشتہ سال مئی میں آئے تھے — بس تمہاری واپسی کے بعد ہی اس نے پہلی واردات کی —"

"تم نے خط میں تو لکھا ہوتا —"

"ہاں — میں نے تم کو بتایا بھی تھا کہ مادھو پور کے نواح میں ایک بوڑھا شیر ہے ۔"

"ہاں — مجھے یاد ہے —"

"بس — یہ وہی ہے —"

میں نے ذرا دیر سکوت کیا — پھر پوچھا ۔

"یہ پہلی واردات کیسے ہوئی — ؟"

"بتاؤں گا — لیکن اس بار تمہارے ساتھ میں بھی چلوں گا ۔"

"اچھا ۔ تو پھر میں واپس جاتا ہوں ۔"

"کیوں ۔"

"اس لیے کہ مجھے تمہارے شکاری ہونے پر ہی شک ہے ۔"

"اللہ قسم میں نے وہ وہ کارنامہ جات وارد کئے ہیں کہ — خاں تم سن سن کر عش عش کرنے لگو گے ۔"

اور عظمت نے تمام راستہ اپنے "کارنامہ جات" کے افسانے نہایت مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کئے — حتیٰ کہ ان کی حویلی آگئی ۔

وہ دن رات وہیں گذری ۔ بیگم عظمت نے میرے لیے رات کے کھانوں میں کیسی کیسی لذیذ چیزیں بنائیں — بہاری کباب ۔ بریانی ۔ نرگسی کوفتے ۔ بادام کا گوشت ۔ گھریلو مرغ کا قورمہ — تہہ دار پراٹھے ۔ ماش کی دال جس پر کچا گھی ڈال کر پودینے اور ادرک سے ڈھک دی گئی تھی — پسندے — اور میٹھے میں دوپہر کو شکر قندی فیرنی اور رات کے کھانے پر شاہی ٹکڑے — ان کے علاوہ جو کئی قسم کے اچار چٹنی اور سنگتروں سے بنی ہوئی مختلف اشیاء رہی ہوں گی ان کا شمار بیکار ۔

دوسرے دن صبح جب عظمت کی جیپ پر ہمارا شکار کا سامان رکھا گیا تو ان میں نہایت عظیم الجثہ قسم کے دو عدد ناشتے دان بھی تھے ۔ جن میں سے ہر ایک میں پانچ خانے ہوتے ہیں ۔

"ناشتے دان — ؟"

میں نے پوچھا

"ہاں خان —"

"یہ کھانا کتنے دنوں کے لیے ہے — ؟"

"جب تک چلے خان ۔"

ذرا دیر بعد مادھو پور کی طرف روانہ ہو گئے — ہوشنگ آباد سے اٹھارہ میل پر گڑوڑی تک جیپ کا راستہ ہے ضرور لیکن ان اٹھارہ میلوں کے سفر کے بعد میں نے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

سوچا اگر گھوڑوں پر سفر کرتے تو زیادہ آرام ملتا۔ جیپ نے تو جسم کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ اور یقیناً جیپ کے بھی سارے نٹ بولٹ ہل گئے ہوں گے۔

راستہ خراب تو ہے ہی۔ گرد بھی کافی ہے۔ اور خوبی یہ کہ سُرخ دھول جو کپڑوں کا رنگ تبدیل کرنے کے لیے نہایت موثر سفوف ہے۔ ان کے علاوہ جو نالے ندیاں گھاٹیاں، ٹیلے اور سبزہ زار تھے وہ جداگانہ۔ راہ میں ہرن بھی ملے اور جنگل بھی۔ اور عظمت خان نے ایک تیز بھاگتے ہوئے ہرن پر اپنی تھرٹی اسپرنگفیلڈ سے فائر کر کے اور ہرن کو گرا کر مجھے خاصا مرعوب کیا۔ وہ ہرن گاؤں والوں کی ضیافت کے لیے مختص کیا گیا۔ اس کے باوجود ہم دوپہر سے پہلے ہی کروڑی پہنچ گئے۔ جو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں عظمت کی خاصی مزروعہ زمین بھی ہے اور زمینوں کیساتھ ہی پتھروں سے بنی ہوئی دیہاتی وضع کی مختصر سی عمارت۔ جو ہماری قیامگاہ اور عظمت کا ریسٹ ہاؤس تھا۔

یہاں سے مادھو پور بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔

جیپ آگے نہیں جا سکتی۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ نہیں لے جائی جاتی۔ اس لیے

بیل گاڑی کا وسیلہ اختیار کیا گیا۔ مجھے بیل گاڑی کی اہمیت پر اس وقت نجانے کیوں شبہ ہوا۔ کیونکہ میں نے جب اس طرف نگاہ کی جس سمت میں مادھو پور بتایا گیا تھا تو مجھے اس روز مادھو پور نہ پہنچ سکنے کا یقین سا ہونے لگا۔ اونچے اونچے پہاڑ جن پر بڑے تناور درخت۔ چٹانیں۔ اور نالے بھی ہوں گے۔ نالوں سے بھی گذرنا ہوگا۔

میں نے عظمت کی طرف دیکھا۔

"آج تو یہیں ٹھہر جائیں۔ کل صبح روانہ ہوں۔"

"کیوں خان۔"

"تمھارے بیل شام تک مادھو پور نہیں پہنچ سکتے۔"

"اچھا۔" وہ مسکرا کر بولے۔

اور مجھے اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہوا۔ میں عظمت خان کو ہمیشہ سے جانتا ہوں۔ ان سے یہ کہنا کہ بیل شام تک منزل مقصود پر نہیں پہنچیں گے گویا ان کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اور اب۔ تیر کمان سے نکل چکا۔ ان کی فطرت جاگ اُٹھی۔ میں کچھ بھی کہتا ان کو روکنا اور ارادہ بدلنا اب ممکن نہیں تھا۔

دوپہر کا کھانا بھی ضروری تھا۔ کھانا گرم تو کیا ہی گیا۔ اس پر ستم یہ کہ ہمارے وہاں پہنچنے کے ساتھ ہی ایک آدمی بندوق لے کر گیا اور نزدیک کے جنگل سے مور کا چوزہ مار لایا۔ عظمت جانتے ہیں مجھے مور کا چوزہ بہت پسند ہے۔ وہ صاف کر کے پکایا گیا۔ اور جب تیار ہو گیا تب کھانا لگایا گیا۔ ان تمام کاموں میں وقت صرف ہوتا ہے۔ اور کھانے کے بعد فوراً ہی میں نے ظہر کی قصر نماز ادا کی تب گاڑی روانہ ہوئی۔ گاڑی بان بڑا خوش مزاج اور تنومند شخص تھا۔ گاؤں سے نکلتے ہی اس نے اس علاقے کا عام گانا چھیڑ دیا۔

بھلے لو دا بندھے ہیں حجور۔ شکار گاہ میں۔
تانگے پہ آئیں گے منشی جی لوگاں۔
موٹر پہ آئیں حجور۔ سکار گاہ میں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

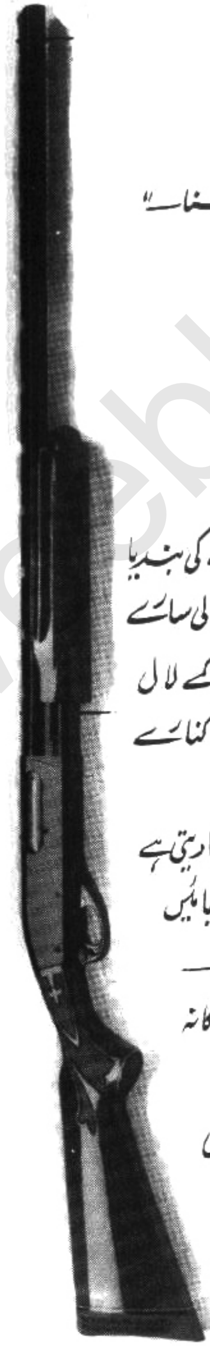

بھلے — بودا بندھے ہیں جمور — سکار گاہ میں ۔
ہنتا ماریں — بھلے منسی جی لوگاں ۔
نہار ماین جمور — سکار گاہ میں

"ابے — یہ کیا فضول بک رہا ہے — کوئی گانا سنا —"
عظمت خان نے اس کا گانا روک دیا ۔

"اچھا جمور —"

اور اس نے دوسرا گانا شروع کر دیا —
ہو گوریا — لال چنریا دلوا چرائے لیہنو
ہو گوریا

سارا گیت کسی گوری کی تعریف میں تھا ۔ جس کے ماتھے کی بندیا چاند نی رات میں چمکتا ہوا ستارا تھا ۔ جس کے ہونٹوں پہ لالی سارے آسمانوں کی شفق کو سمیٹ کر بنائی گئی تھی ۔ جس کی آنکھوں کے لال ڈورے ایسے تھے جیسے شام کے وقت گہری جھیلوں کے کنارے سورج کی کرنیں ۔

شاعروں کی مبالغہ آرائی اپنے محبوب کو نجانے کیا بنا دیتی ہے
اگر سارے شاعروں کے سارے محبوب شمار کئے جائیں
تو گویا دنیا میں غیر محبوب — یا بدشکل — کوئی نہیں رہ جائے —
خوبصورتی اور بدصورتی کے معاملے میں ہر شخص کا معیار جداگانہ ہے ۔

راستہ جتنا خراب تھا اس کا ذکر تو بیکار ہے ۔ کٹر وڑی سے دو میل بعد ہم جنگل میں داخل ہو گئے — جنگل بھی وہ جو پہاڑی کے دامنوں کی شکل میں ہو ۔ جا بجا زمین بارش کے پانی کے سے کٹ کر کھائیاں بن رہی تھیں ، اور پھر

پہاڑوں پر سے زمین کٹ کر لڑھک پڑنے والے پتھروں نے ہر طرف رکاوٹیں سی کھڑی کر رکھی تھیں ، درخت بھی تناور تھے ، کہیں کہیں پرانے درخت اکھڑ کر گر گئے تھے اور ان کی سوکھی شاخوں نے جھاڑیوں اور پتھروں کے تعاون سے ایسی مضبوط فصلیں بنا رکھی تھیں کہ گاڑی بھی جا بجا پھنس پھنس جاتی تھی ۔ اور چڑھائی اس پر مستزاد —

درختوں کے سائے میں کئی جگہ جنگلی مرغیاں بھی نظر آئیں اور مور بھی ۔

ابھی چار پانچ میل کا فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ ایکبارگی گاڑی کا دھرا زور کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا — گاڑی اس وقت پتھروں پر سے گذر رہی تھی ۔ اگر جیپ ہوتی تو نہ جانے کیا حشر ہوتا ۔

گلزار اور گاڑی بان ۔ دونوں نے معائنہ کیا تو یہ معلوم ہوا کہ دھرا نا قابل مرمت ہے ۔ اتفاق کی بات ، اس قسم کے پہاڑی سفروں میں ایک زائد دھرا ہمیشہ ساتھ ہوتا ہے ۔ اس روز موجود نہیں تھا ۔ اب تین صورتیں ہی ممکن تھیں —

اوّل — ایک آدمی کٹر وڑی جا کر زائد دھرا لائے — اس کام میں تقریباً دو گھنٹے صرف ہوتے —

دوم — ہم گاڑی چھوڑ کر پیادہ جائیں — سامان کے پیش نظر یہ نا قابل عمل تھا ۔
سوم — کسی درخت کی شاخ کو کاٹ کر نیا دھرا بنایا جائے ۔
آخری تدبیر ہی قابل عمل تھی ۔

گلزار اور گاڑی بان کی مشترکہ کوشش سے آدھے گھنٹے میں دھرا تیار ہو گیا ۔ اور پندرہ بیس منٹ میں ٹوٹا ہوا دھرا نکال کر نیا لگا دیا گیا ۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ہم دوبارہ چل پڑے — کچھ دور آگے چل کر راستہ نسبتاً بہتر ہو گیا — پتھر کم اور گاڑیوں کی گذرگاہ سے جو نشانات بن جاتے ہیں ان سے گاڑیوں کے اکثر گذرتے رہنے کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہ راستہ دو پہاڑوں کے وسط میں سے گذرتا تھا ۔ اور اب بیلوں کی رفتار بھی بہتر ہو گئی —

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

"غالباً یہ علاقہ بھی شیر کی ہلاکت آفرینی کا علاقہ ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔

"ہاں —" عظمت نے جواب دیا۔

میں نے رائفل لوڈ کی اور گاڑی سے اتر گیا۔

"کیوں خاں —؟"

"پیدل چلنے میں فائر کی سہولت ہوتی ہے۔ اگر شیر نظر ہی آگیا تو گاڑی پر سے اتنا صحیح فائر نہیں ہو سکے گا۔"

میں جانتا تھا کہ اگر شیر واقعی اطراف میں موجود ہوا تو کم از کم گاڑی کا تعاقب کرے گا۔ اور ممکن ہے کہیں ایسی جگہ نظر بھی آجائے جہاں میں فائر کر سکوں۔

البتہ اس وقت مجھے اس کی انتہائی چالاک فطرت کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اتنی سہولت کے ساتھ شکار ہونے والا جانور نہیں تھا۔

سورج غروب کی طرف جھک رہا ہو تو جنگل کا ماحول بھی بدلنے لگتا ہے۔ درختوں کے نیچے تو اس وقت بھی سایہ ہونے لگا اور چرندوں کی نقل و حرکت بڑھ گئی۔ اب رات سے پہلے مادھو پور پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اکثر مجھے آنے والے واقعات کا قبل از وقت احساس ہوتا ہے۔ اندر سے بےچینی ہونے لگتی ہے اور جو کچھ پروگرام بھی بنا ہو اس کو بدل دینے کا قدرتاً دل چاہتا ہے۔ اس روز بھی یہی کیفیت تھی۔ لیکن عظمت نے میری نہ سنی مجھے بزدل یا کمزوری کا الزام تو دیا نہیں جا سکتا البتہ محتاط کہنا ممکن ہے۔ میں اپنی تمام تر مہم جو یانہ فطرت کے باوجود غیر ضروری خطرات مول لینے کا قطعاً قائل نہیں ہوں۔ خطرہ پیش آجائے تو ہمت سے اس کا مقابلہ کرنا بہادری ہے خطرے میں بے سبب کودپڑنا حماقت ہے۔

اور سورج غروب ہوگیا۔

شب بیدار جانوروں کی دوڑ دھوپ سے ماحول پُر اسرار اور وحشت آمیز سا ہوگیا۔ عظمت خان کی سٹی اب گم ہوئی۔

قمر نقوی، ہاتھ میں چار سو پچاس ایکسپریس رائفل ہے

"اب کیا ہوگا خان —"

انھوں نے پوچھا۔

"کہاں —؟"

"رات ہو رہی ہے —"

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

"وہ تو ہو گی —"

میں نہیں چاہتا تھا کہ عظمت کو مزید شرمندہ کروں۔

شام سے پہلے تک عظمت بے فکری کے ساتھ چہکتے رہے تھے۔ مگر اب خاموش بلکہ پریشان کبھی میری طرف دیکھتے کبھی جنگل کے اندھیرے کو — آدم خور شیر کی مملکت میں رات کے وقت اس طرح مجبور سفر کرنے کا پہلا اتفاق تھا۔ ویسے رات اندھیری تو ہوتی ہی ہے لیکن جنگل کی رات بہت اندھیری ہوتی ہے — درختوں کی گھنی پتیوں اور گتھی ہوئی شاخوں کے درمیان سے گذر کر ستاروں کی روشنی زمین تک آتی نہیں۔ اس لیے سائے اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے اب اندھیرے میں پیدل چلتے رہنا غیر ضروری خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔ لہٰذا میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لیکن بالکل عقب میں اور باہر کی طرف منہ کر کے تاکہ شیر اگر سامنے آئے تو بآسانی فائر کر سکوں —

شیر بیل گاڑی پر بالعموم حملہ نہیں کرتا — اور اگر کرتا بھی ہے تو سب سے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی پر — اسی لیے میں ہی پیچھے بیٹھا تھا — میرے لیے اس سے مقابلہ آسان تھا۔ میں نے سامان میں سے ٹارچ بھی نکال لی اور گلزار نے مٹی کے تیل سے جلنے والی ایک لالٹین بھی روشن کر لی تھی جو گاڑی کے ہتھے میں اس طرح لٹکا دی گئی کہ گاڑی کے پیچھے روشنی رہے۔ عام رواج کے مطابق ایک لالٹین گاڑی کے نیچے گاڑی بان کی نشست کے عین زیریں حصے میں روشن تھی۔ اس کی روشنی کا بظاہر کوئی فائدہ تو نہیں نظر آتا لیکن کچھ نفسیاتی اثر ضرور پیدا ہوتا ہے۔

گاڑی بان جو اس سے پہلے تک طرح طرح کے گانے گاتا رہا تھا، اب سناٹے میں بیٹھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ گلزار اور عظمت درمیان میں بیٹھے تھے۔

کئی بار جھاڑیوں میں سے آنکھیں چمکتی نظر آئیں — میں نے وہ آنکھیں عظمت کو بھی دکھلائیں لیکن اب وہ اتنے بھی ناتجربہ کار نہیں تھے۔ آخر جنگل میں گھومنے

والے جنگلوں کے قریب رہنے والے لوگ تھے۔ گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں تو برابر سنائی دیتی رہیں — وہ تو خیر ہوئی کہ بیل جنگلوں اور جانوروں کی آوازوں کے عادی تھے اس لیے ان پر کوئی اثر نہ ہوا اپنے راستے پر چلتے رہے۔

ایک دفعہ گاڑی کے قریب سے ہی ایک جھاڑی میں سے کوئی جانور اچھل کر بھاگا۔ قدموں کی آہٹ سے ہم سب کو ہی اندازہ ہو گیا کہ سم دار جانور ہے۔ لیکن بیل کسی قدر مضطرب ہوئے جو قدرتی بات تھی۔ گاڑی بان نے بیلوں کو قابو کر لیا —!"

"شرفو — عظمت گاڑی بان سے مخاطب تھے "کتنا راستہ باقی رہ گیا —؟"

"تین چار میل —"

"یہ آج کیا ہو گیا خاں — فاصلہ ختم ہی نہیں ہوتا ہے گا۔"

"ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ سم دار جانور جو بدک کر بھاگا تھا — وہ ایک عجیب تاثر چھوڑ گیا۔ اور میرے تینوں ساتھی زیادہ گڑبڑا گئے۔ عظمت نے بہت ہی پریشانی کے لہجے میں کہا۔

"اب کیا ہو گا نقوی صاحب —"

میں ہنس دیا۔

"کچھ نہیں ہو گا عظمت خان — ایک گھنٹہ ڈیڑھ میں گاؤں پہنچیں گے انشاء اللہ — تم گاڑی کے سامنے دیکھتے رہو — ذرا سا بھی شبہ ہو تو مجھے بتانا —"

"مجھے تو ہر طرف سائے ہی سائے نظر آ رہے ہیں"

"تمہارا وہم ہے" میں نے ہنس کر جواب دیا "لیکن خاموش ضرور رہنا چاہیے —"

"دراصل میری غلطی ہے — تم نے تو منع کیا تھا۔"

"خیر — گذشت آنچہ گذشت"

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

گاڑی بان شرفو بولا۔

"حضور ٹارچ جلالوں؟"

"کیا فائدہ ۔ کبھی کبھی جلا کر راستہ دیکھنا چاہو تو دیکھ لو۔ ورنہ سارا راستہ تو یہ ساتھ دے نہیں سکتی ۔"

سب سے زیادہ فکر کی بات یہ تھی کہ اگر بیلوں نے کسی درندے کی بو نزدیک سے سونگھ لی تو پھر ان کو قابو میں رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ بیلوں کا کسی ناہموار خطے میں بے قابو ہو کر بھاگنا نہایت خطرناک بات ہوتی ہے اور کسی حادثے پر منتج ہو سکتی ہے۔ بیل کتنے ہی سدھائے کیوں نہ ہوں ۔ شیر چیتے سے ان کا خوف ایک فطری جذبہ ہے۔

گیدڑوں کی ہوا ہو ۔ الو کا شور ۔ چیتے کی آرا کشی ۔ سانبھر کی دھانک۔ شاید ہی کوئی ایسی آواز ہو جو اس رات ہم نے نہ سنی ہو۔ ویسے سانبھر کی آواز سے بڑی دہشت بلکہ وحشت ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے یہ آواز سنی ہے وہ اس کی دہشت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ انسان کیا ۔ اس آواز کے بعد جانور اور جھینگر بھی ایسے چپ رہ جاتے ہیں جیسے کسی نے سارے جنگل کی روح قبض کر لی ہو۔

اس سکوت سے ہم سب بھی متاثر ہو کر خاموش رہ گئے۔

اسی وقت کہیں دور سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی ۔ اور سکوت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جھینگروں کا نغمہ پیہم جاری ہو گیا۔ گیدڑ بھی بولے۔ غرضیکہ سانبھر کی خوفناک آواز نے جو سحر کر دیا تھا وہ باطل ہو گیا۔

"گلزار اب کتنا فاصلہ رہا ۔"

عظمت نے پوچھا

"زیادہ دور نہیں ہے جناب ۔"

"اور وہ کیا کہتا ۔ سہ پہر کے بعد سے اب تک ان بیلوں نے چھ سات میل تو ضرور کر لیا ہو گا ۔"

"اب کیا کریں خاں ۔"

وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"پریشانی سے کیا فائدہ ۔ اب گاؤں زیادہ دور نہیں ہے ۔"

میں نے جواب دیا۔

اور چند منٹ بعد ہی بیل چلتے چلتے اچانک ٹھہر گئے۔ میں نے گھبرا کر سامنے کی طرف دیکھا ۔ اندھیرا تھا ۔ اور اسی وقت شرفو نے بیلوں کو چھیڑا تو وہ پھر چل پڑے ۔ راستہ کچھ ایسا خراب بھی نہیں تھا۔ یہاں گاڑیوں کے گذرنے سے پہیوں نے زمین کاٹ دی تھی۔ اور ان کی کٹی ہوئی جگہوں میں مٹی سرمہ بن کر رہ گئی ہو گی کیونکہ بیلوں کے پیروں سے گرد اڑتی تھی ۔

پھر ایک دفعہ ہوا کا جھونکا آیا تو میں چونکا ۔ یہ تو ہوا کی بو بدلی ہوئی تھی ۔ اور غور کیا تو یقین ہو گیا کہ ہوا میں رطوبت اور پانی کی بو ہے۔ کوئی تالاب یا جھیل یا بڑا دریا نزدیک تھا۔

"کیا راستے میں کوئی تالاب ہے ۔ ؟"

میں نے پوچھا

"ہاں جناب ۔ نھکوڑ کا تالاب ہے ۔"

"کیا تالاب آگیا ۔ ؟"

عظمت چونک کر بولے۔

"ہوا میں پانی کی بو ہے ۔"

میں نے جواب دیا۔

"الحمدللہ ۔"

عظمت نے اطمینان کا سانس لیا۔

"یہاں سے مادھو پور تین میل ہے ۔"

"خیر ۔"

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

اور شرنواب بیلوں کو آہستہ آہستہ پچکار کر بڑھا رہا تھا۔

"تالاب آگیا جناب"

وہ بولا۔

اور دو لمحوں بعد ہی گاڑی پانی میں اتر گئی۔ گاؤں جانے کا راستہ پانی میں سے گزر کر جاتا تھا، گاڑی کے جوئے تلے جو لالٹین لٹک رہی تھی وہ اتار لی گئی۔ اور بیل بڑھتے گئے۔ گاڑی مشکل سے بڑھ رہی تھی۔ اور پانی اب آدھے پہیوں تک آپہنچا۔

"صرف یہی راستہ ہے۔"

میں نے پوچھا

"جی جناب"

میں نے آگے ٹارچ کی روشنی ڈالی — ابھی تو کنارا بہت دور تھا۔ اور پھر بیل عین وسط میں ٹھہر گئے۔ شرنو نے ان کو گدگدایا۔ دم مروڑی۔ بیلوں نے زور تو لگایا۔ لیکن گاڑی ذرا جو بڑھی ہو۔ غالباً کیچڑ میں پھنس گئی۔ بیل بار بار زور لگا کر عاجز آگئے اور گاڑی نے جنبش کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے صبح ہونے کے بعد تالاب کا فوٹو لیا۔ جو اگلے صفحے پر ہے۔ اس سے پانی کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے سامنے جو زمین نظر آتی ہے وہ گلزارا اور عظمت کے بیان کے مطابق کیچڑ اور دلدل کا ایک وسیع خطہ ہے۔ جانور تو اس میں سے دوڑ کر گزر جاتے ہیں مگر گاڑی نہیں نکل سکتی — ایک آدمی تالاب پار کرتا نظر آتا ہے جو درخت کے ایک خشک تنے پر اپنا سامان رکھے ساتھ کھینچتا لے جا رہا ہے۔ اس قسم کے دو چوڑے تنے یا پیڑے دونوں کناروں پر موجود تھے۔

کیا کہتے ہو خان —؟"

عظمت نے پوچھا

"میرا خیال ہے کہ ہم گاڑی پر اسی جگہ رات گذار لیں۔"

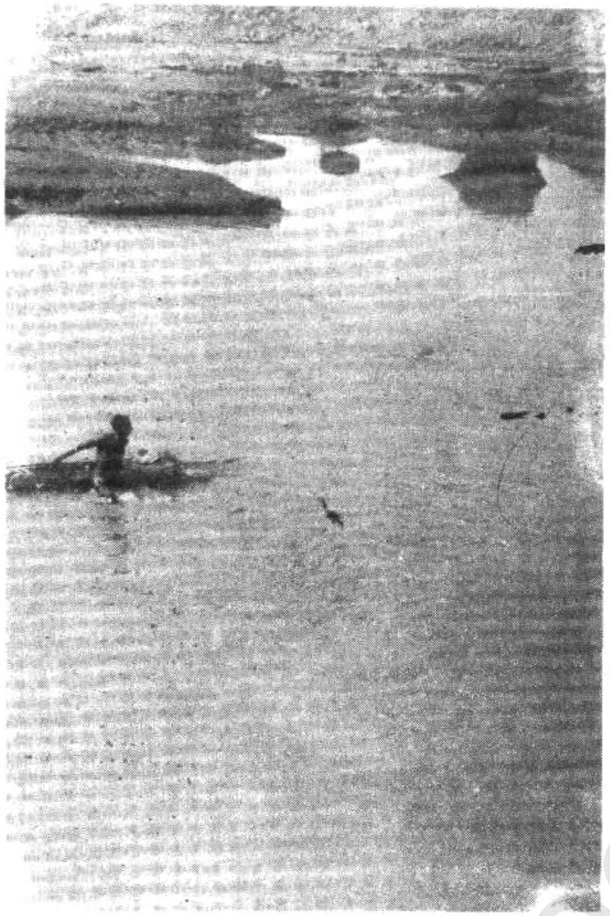

نھوڑا کا تالاب

"بیل —"

"بیلوں کو کھول دو — گاؤں بھاگ جائیں گے۔"

آخر یہی ترکیب بہتر معلوم ہوئی — گاڑی کا ٹیکنا گرا کر بیلوں کے جوئے کھولے گئے تو وہ چھلانگیں لگاتے کنارے کی طرف بھاگ کر نظروں سے چھپ گئے۔

اب ہم وسط تالاب میں بیٹھے تھے — اور صبح تک وہیں سوتے جاگتے مچھروں سے مقابلہ کرتے اور جانوروں کی آوازوں کا تجزیہ کرتے رہے۔ رات کس طرح گذری

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

یہ ذکر بیکار ہے۔ البتہ نتھوڑ کے تالاب کا واحد ذریعہ آب ہونا ثابت ہو گیا۔

صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی اور اس غفلت کی نیند آئی کہ فجر کی نماز قضا ہوئی۔ جب آنکھ کھلی تو سورج خوب بڑھ آیا تھا۔ عظمت بھی سو رہے تھے اور گلزار اور شرنو بھی گڑمڑائے ہوئے تھے۔ کنارا کوئی پچاس گز پر تھا۔ وہ دونوں بے حس بیل جن کو رات کے وقت کھول دیا گیا تھا کنارے پر ہی نظر آئے۔ ایک آرام سے بیٹھا تھا، دوسرا کھڑا جگالی کرتے ہوئے گاڑی کو دیکھ رہا ہو گا۔

میں نے ان لوگوں کو جگایا۔

اتفاق کہ کرڑوڑی جانے والی ایک بیل گاڑی آپہنچی جس پر چھ جوان تھے۔ سب کی مشترکہ کوشش سے ہماری گاڑی بمشکل نکل ہی آئی۔ گو اس محنت کے کام میں کوئی ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ حیرت یہ ہے کہ وہ بیل گاڑی جو کرڑوڑی جا رہی تھی اسی راستے پر سے بہ آسانی نکلی چلی گئی۔

دوسرے کنارے پر آ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد تالاب کے شفاف پانی میں غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ پھر ناشتہ کر کے چائے پی۔ تب کہیں جان میں جان آئی۔ اب میں نے تالاب کا تفصیلی جائزہ لینا شروع کیا۔ کناروں پر ہر قسم کے سم دار اور گدی دار پیروں والے جانوروں کے نقوش بکثرت تھے اس سے اندازہ ہوا کہ بیشمار جانور اس تلاب پر رات کو — یا دن میں بھی — پانی پینے آتے ہیں — شیر کے ماگھ بھی تھے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آدم خور کے ہیں یا کسی اور شیر کے۔

ایک مقام پر کئی چھوٹے بڑے شیروں کے ماگھ نظر پڑے۔ البتہ تالاب کی وسعت کے پیش نظر وہاں بیٹھ کر شیر کی آمد اور ہلاکت کے انتظام اور انتظار کا خیال کچھ ایسا مستحسن نہیں معلوم ہوا تاہم وہ جگہ جہاں کہیں شیروں کے ماگھ تھے، وہ کھلگا باندھ کر نزدیکی درخت پر بیٹھنے کے لیے نسبتاً بہتر معلوم ہوئی — میں نے جو مقام کھلگے کے لیے منتخب کیا اس سے کوئی تیس گز پر مہوے کا ایک بڑا کارآمد درخت

تھا اس پر مچان باندھی جا سکتی تھی۔

یہ مقام شیروں کے پانی پینے کے لیے اس لیے زیادہ موزوں تھا کہ دور تک کنارے نرم ہونیکے باوجود کیچڑ نہیں تھا۔ جا بجا سبز گھاس، اور نیچی نیچی جھدری جھاڑیاں بھی تھیں۔

بہر حال جگہ بری نہیں تھی۔

مادھو پور اچھی بڑی آبادی ہے لیکن دورِ جدید کی تمام سہولتوں سے بے بہرہ۔ نہ سڑکیں، نہ بجلی، نہ تار پہلے تو ہفتے میں دو بار ہرکارہ ڈاک لاتا لے جاتا تھا۔ لیکن شیر کی آدم خوری کے بعد سے یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ گاؤں کے درمیان چار دکانوں پر مشتمل ایک بازار بھی ہے۔ جہاں عام ضرورت کی اشیاء مل جاتی ہوں گی۔ اس زمانے میں سامان کی کمی تھی جو ظاہر بات ہے۔

ایک بنیے کی دکان، ایک بزاز کی۔ ایک حلوائی اور ایک سبزی والا، جس کے بارے میں افواہ تھی کہ کبھی کبھی ہرن مار کر اس کا گوشت بھی فروخت کرتا ہے۔ تیتر اور بٹیر تو اس کی دکان پر بکثرت ملتے تھے۔ دو ایک حجام اور درزی بھی جن کی باضابطہ دکانیں نہیں تھیں۔

گاؤں کی آبادی کوئی پچاس ساٹھ مکانوں پر مشتمل تھی۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ بھی ہیں ہم نے مادھو پور کے رئیس شیر پال کے کوٹھے میں قیام کیا۔ شیر پال سے عظمت خان کے پرانے مراسم تھے۔ اور انھوں نے ہماری بہت خاطر کی اور بہت عزت سے پیش آئے۔ انھوں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور عمر کے ساتھ ساتھ مطالعہ جاری رکھنے کی وجہ سے اچھی استعداد پیدا کر لی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کے علاوہ پاکستان کے بارے میں بھی پوچھتے رہے۔

عظمت کو تو ہندو کے ہاتھ کا کھانا کھانے میں اعتراض نہیں — انھیں تو رہنا ہی ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ لیکن مجھے یہ بات قطعاً گوارا نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ گلزار ساتھ آیا تھا۔ کھانا تو اتنا ساتھ تھا کہ میں اور عظمت خان تین روز کھاتے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

رہے بلکہ شیر پال نے بھی کباب پر ہاتھ صاف کیا۔ باوجودیکہ عظمت نے ان کو بتا دیا تھا۔ یعنی کباب گائے کے گوشت سے بنے تھے۔ عظمت اور رشرفو نے اپنے لیے ضرورت کا سامان مادھوپور سے لے لیا۔

گلزار نے ہم لوگوں کو بہت خوشبودار کافی بنا کر پلائی۔ اس وقت شیر پال بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کپ ان کی طرف بڑھایا۔ خیال یہ تھا کہ وہ نہیں پئیں گے لیکن انھوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بے تکلف کپ لے لیا۔

شیر کے متعلق گاؤں کا کوئی شخص بات ہی نہیں کرتا تھا۔ جس سے پوچھا وہ گھبرا کر رہ گیا۔ شیر پال کے علاوہ کوئی صحیح جواب نہیں دے سکا۔ ایک بوڑھے نے تو بات سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگائے۔ چلم کے دو تین کش لیے اور اپنی لاٹھی اٹھا کر بھاگا۔ تو گھوم کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے شیر پال سے تذکرہ کیا تو وہ بھی کسی قدر مضطرب ہو کر بولے۔

"وہ کچھ آسیب وغیرہ کا سلسلہ ہے۔ پرماتما کے لیے مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔"

پھر انھوں نے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ اور انھوں نے جس طرح جواب دیا تھا اس کے پیش نظر میں نے بھی یہ بات ان سے پھر نہیں کی۔ اب شیر کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی دشواری پیش آئی۔ اس معاملے میں عظمت بھی مجبور تھے۔ آدم خور کی تاخت وتاراج، نقل وحرکت، وغیرہ کی تفصیلات معلوم کر کے اپنے مطلب کی باتیں اور نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا مواد فراہم ہو جاتا ہے جو کئی روز کی جستجو سے بھی فراہم نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ معاملہ کہ کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

شیر پال نے صرف اتنا بتایا کہ آبادی سے میل ڈیڑھ میل دور ہی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔

ان لوگوں کی توہم پرستی کا یہ عالم کہ میں نے جب ان سے صرف وہ سمت بتانے کو کہا جدھر شیر زیادہ وارداتیں کرتا ہو، تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔

اس لیے کہ بتانے والا ضرور شیر کے ظلم کا نشانہ بنتا۔ غرض ہمارا سارا دن اسی کوشش میں گذر گیا اور کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ان جاہلوں کو ان کے عقائد سے ہٹانا ممکن نہ ہوا۔ رات کے کھانے کے بعد عظمت سے میں نے پوچھا اب کیا کریں۔ مادھوپور کے لوگ متواضع ہونے کے باوجود شیر کے معاملے میں کوئی تعاون کرنے کو آمادہ نہیں۔

عظمت کے پاس بھی اس دشواری کا حل نہیں تھا۔ کٹروڑی تک تو ان کا حلقۂ اثر ہے۔ اس کے بعد کچھ بھی نہیں رات کو نیند دیر سے آئی۔ جب تک میں جاگتا رہا تب تک مادھوپور کے لوگوں کے رویے پر جزبز ہوتا رہا۔ میرے اختیار میں ہوتا تو ان بزدلوں کو اچھی سرزنش کرتا۔

مجھے جگن ناتھ آزاد کا ایک شعر یاد آ گیا۔ جو انہوں نے راولپنڈی گورڈن کالج کے مشاعرے میں پڑھا تھا۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

ایک زمانہ تھا کہ میں ان ہی علاقوں میں خاصا صاحب اختیار ہوا کرتا تھا۔ کسی کی اتنی مجال نہیں تھی کہ میرے سوال کا جواب دینے سے انکار کر سکتا۔

صبح میں اُٹھا تو ایک نئے عزم کے ساتھ۔ تفتیش بالائے طاق رکھ کر کچھ عملی اقدام کرنے کا فیصلہ میں نے فجر کی نماز کے دوران ہی کر لیا۔

میں نے جنگل میں جانے کی تیاری شروع کی تو عظمت بھی تیار ہوئے۔ میں نے اس روز ان کو منع نہیں کیا۔ عظمت خان شکاری ضرور ہیں لیکن آدم خور کے شکار میں اور وہ بھی زمین پر پاپیادہ اس کی تلاش میں جنگل پیمائی ان کے لیے مناسب نہیں۔ وہ خود بھی یہ بات جانتے ہیں۔ مچان پہ بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ مناسب آدمی ہیں۔ پیادہ تلاش کے لیے ناموزوں۔

آدم خور کا شکار دنیا کا مشکل ترین اور خطرناک ترین کام ہے۔ آدم خور کے

http://updf.weebly.com

جنگل میں نکلنے والا شخص دراصل اپنے کو ہلاکت کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ گویا موت کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ کامیابی اللہ تعالیٰ کی عنایت اور فضل پر منحصر ہے — وہ مدد کرتا ہے تو شیر مارا جاتا ہے۔ البتہ یہ خطرناک مہم حیرت انگیز حد تک دلچسپ بھی ہوتی ہے۔

تاہم اس خطرناک کام کی انجام دہی کے لیے نشانے کی پختگی — حاضر دماغی، جرات، بے خوفی، تیزی ہوشیاری، اور تیز دستی۔ بہت سی صفات کی موجودگی لازم ہے۔ ان میں سے کسی ایک وصف کی کمی، نہایت ہلاکت خیز نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

عظمت خان میں صرف اتنی سی کمی ہے کہ وہ فائر کرنے میں دیر کر دیتے ہیں۔ اور اپنی اس کوتاہی پر وہ خود قابو نہیں پا سکے۔ بڑے شکاروں میں ضرورت یہ ہوتی ہے کہ شکاری ہر وقت آمادہ بہ کار رہے۔ ادھر آہٹ معلوم ہوئی ادھر رائفل شانے پر آئی — نظر نے نشانہ لیا اور فائر — یہ حرکت گویا شکاری کی طبیعت ثانی بن جاتی ہے۔ پھر رائفل کو شانے پر لانے سے سیفٹی کیچ کھولنے۔ اور لبلبی پر انگلی لا کر نظر کا نشانہ لینے تک کی ساری حرکات بالکل فطری ہو جاتی ہیں۔ جن میں ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔

۱۹۶۴ء کے شکار میں حقانی میری تیز دستی دیکھ چکے ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا ہرن! ادھر میں نے فائر کیا۔ ہرن! گرا اور اسلم چھرا لے کر اس کو ذبح کرنے دوڑا۔

خود عظمت خان نے ایک بار مجھ سے شرط لگائی کہ بندوقیں شانے پر لٹکا لی جائیں۔ ہم دونوں نے بندوقیں اسٹرپ سے شانے پر لٹکا لیں — پھر جھاڑی سے تیتر اڑنے لگے — میں نے بندوق سنبھالی اور دو فائر کئے ایک تیتر گرا۔ عظمت خان نشانہ ہی لیتے رہ گئے۔ ہوا یہ کہ بندوقیں شانوں پر سے ہم دونوں نے ایک ہی سرعت سے اتاریں۔ تقریباً ساتھ شانے پر لگائیں — ساتھ رخسار کندے پر رکھا۔ بس یہاں سے دونوں کے عکس العمل کی رفتار بدل گئی۔ عظمت خان نشانہ لیتے رہ گئے۔

یہی ان کی کوتاہی تھی — اور وہ اس پر کبھی قابو نہ پا سکے۔

آدم خور کے مقابلے کی صورت میں اس سے زیادہ برق رفتاری کی ضرورت ہوتی ہے اور صرف برق رفتاری ہی نہیں بلکہ — نشانہ خطا بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ الٹا سیدھا فائر جھونک دینے کا کیا فائدہ — اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ بڑے سے بڑا قادر انداز بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نشانہ خطا نہیں ہوگا۔

غرضیکہ ہم گاؤں سے نکلے اور کھیتوں سے گذر کر جب جنگل میں داخل ہونے لگے تو میں نے اشارا کیا، گلزار آگے اس کے بعد عظمت اور ان سے دس قدم پیچھے میں — عظمت کے پاس ان کی پانچ سو ایکسپریس تھی۔ گلزار میری بارہ بور کی شاٹ گن لیے تھا۔ وہ تو گلزار کو میں بندوق ہرگز نہ دیتا لیکن مجھے اس کے بارے میں یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ بھاگنے والا نہیں، عظمت کا پرانا خادم تھا۔ بندوق پاس رکھنا چاہیئے تا انیکہ کوئی قطعی معتبر شخص بندوق بردار نہ ہو —

مجھے بالم پور کے آدم خور کے شکار میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ میں نے شیر پہ فائر کیا تو جلدی میں انگلی پھسل جانے کی وجہ سے دونوں لبلبیاں دب گئیں اور دونوں نالیں ایک ساتھ فائر ہوئیں — بڑی رائفلوں کو جن لوگوں نے استعمال کیا ہے وہ ان کے دھکے (RECOIL) سے واقف ہیں۔ غرضیکہ — فائروں کے دھکے سے میرا توازن بگڑا اور میں چاروں شانے چت گرا۔ میری دوسری رائفل اور بندوق جس کے پاس تھی وہ بھاگ لیا، اور بھاگتے بھاگتے مجھے یہ اطلاع بھی دیتا گیا کہ "شیر آگیا"۔

نتیجہ یہ کہ میں چند لمحے کلمہ پڑھنے اور شیر کے حملے کا انتظار کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ چند لمحے بعد سر اٹھا کر دیکھا تو شیر سامنے ہی پڑا تڑپ رہا تھا۔ بہر حال میں نے اس کو مار دیا — لیکن یہ سبق بھی سیکھ لیا کہ صرف وہی ہتھیار ضرورت کے وقت کام آ سکتا ہے جو اپنے ہاتھ میں ہو۔

مادھو پور کے جنگلوں کی نوعیت کچھ ایسی عجیب تو نہیں — جنگل تو سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے عام طور سے ناگپور کے جنگل میں ہر طرف

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

نشیب و فراز کی جو کثرت ہے وہ بے شبہ غیر معمولی ہی ہے ۔ یوں تو ناگپور کو سطح مرتفع کہتے ہیں مگر اس میں پلیٹو کی سی کوئی بات نہیں ہے ۔ جنگل بھی گھنے ہیں ، دریاؤں ندیوں نالوں اور کھاڑیوں کی بہتات ہے ۔ نربدا کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ، جن میں کسی کسی جگہ مگرمچھ بھی ملتے ہیں ۔ سانپ بھی ، اور شیر چیتے بھی ۔ بیشمار اونچے نیچے پہاڑ ۔ اور پہاڑی نالے ، جن میں کچھ تو خشک رہتے ہیں اور بعض میں تھوڑا تھوڑا پانی بھی ہوتا ہے ۔ اس پانی میں کتنے ہی کیڑے مکوڑے ۔ مکڑیاں ، مچھر ، اور نجانے کیا کچھ ۔

موسم کسی قدر گرم ہو گیا تھا ۔ اس لیے میں نے ایسے مقامات کا رخ کیا جہاں نہ صرف سایہ کہی ہو بلکہ کچھ پانی بھی اگرچہ آدم خور کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہیں سائے میں ہوگا ۔ غار میں ۔ یا کسی دراڑ میں ۔ یا عین دوپہر کے وقت گاؤں پہ تاک لگائے ہوئے ۔ لیکن شیر کی فطرت نہیں بدل سکتی ۔ عادتاً شیر گرمی کے زمانے میں پانی کی قربت پسند کرتا ہے ۔ پانی میں بیٹھا رہتا ہے ۔ یا ندی ، چشمے ، تالاب کے کنارے بیٹھا رہتا ہے یا سو جاتا ہے ۔ ان جگہوں کو دیکھنا مناسب ہی تھا جہاں شیر کا ہونا ممکن ہو ۔

گاؤں سے نکل کر کئی پگڈنڈیاں دور اور نزدیک کی آبادیوں اور جنگلوں کی طرف جاتی ہیں ۔ میں نے جنوب کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر چلنا مناسب جانا ۔ شیر پال نے بتایا کہ اس طرف کوئی پانچ میل دور بہت دن پہلے لکڑیاں کاٹ کر شہتیر جمع کیے گئے تھے ۔ شیر کے آدم خور ہو جانے کی وجہ سے وہ شہتیر وہاں سے نہیں اُٹھائے گئے ۔ جس جگہ شہتیر پڑے ہیں وہیں لکڑیوں سے مزدوروں کے آرام کے لیے دالان بنائے گئے ہیں ۔ اس کے قریب ہی ایک چشمہ بھی گذرتا ہے ۔ شیر پال نے ساری تفصیل بتا کر کچھ آخری باتیں ہماری فہم و دانش کے لیے چھوڑ دیں ۔ اب اتنا بھی ہم ناسمجھ نہیں تھے کہ شیر پال کا مطلب نہ سمجھتے ۔ انھوں نے ساری تفصیلات بتا کر ہمیں گویا یہ بتا دیا کہ اس مقام پر شیر کا ملنا ممکن ہے ۔

جانے کے لیے راستہ بھی کچھ انھوں نے بتایا ۔ کچھ ہم نے اپنی فراست سے تہیہ کیا ۔

پانچ میل کا یہ فاصلہ ہم نے دیر میں طے کیا ، سارا راستہ نہایت تنگ و تاریک جنگل اور وادیاں تھیں ۔ جہاں بھی زمین نرم تھی وہاں مختلف جنگلی جانوروں کے کھروں اور پنجوں کے نشانات نظر آئے ۔ ان میں ابھی بھی شیر کا ماگھ نہیں تھا ۔ میں مایوس تو کبھی نہیں ہوتا البتہ متعجب ضرور ہوا ۔ اتنے طویل فاصلے اور گھنے جنگل کے باوجود شیر کی گلگشت کے آثار نہ ملنا عجیب بات ہی تھی ۔

عام طور سے شیر ، روز رات بھر میں تقریباً بیس میل سفر کر لیتا ہے ۔ یہ سفر اس کی قیام گاہ سے شروع ہو کر ، اسی نقطے پر ختم ہو جاتا ہے ۔ مادھوپور اس آدم خور کی خاص توجہ تھی اس لئے اطراف میں اس کے نقوش پا ہونا لازمی تھا ۔

کسی نے دورانِ گفتگو بتایا تھا کہ آدم خور کے پیروں کے نشانات نہیں بنتے ۔ اس بیان سے وہ غالباً شیر کا کوئی بدروح یا بھوت ہونا ثابت کرنا چاہتا تھا میں یہ سوچ کر مسکرا دیا ۔ غریب سادہ لوح دیہاتی بھی کیسی کیسی انہونی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں ۔ ہندو تو خصوصاً بڑے ہی وہمی ہوتے ہیں ۔

مظفرگڑھ میں دریائے سندھ کے کنارے ایک مقام غازی گھاٹ کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے ڈیرہ غازی خاں جانے کے لیے فیری سروس ہے ۔ اتفاق کہ غازی گھاٹ کا نزدیکی علاقہ ہی ایک زمانے میں پاڑے کے شکار کے لیے خاص طور سے مشہور تھا ۔ پاڑا ۔ یا HOG DEER اچھا خوبصورت چرندہ ہے ۔ اس کے سینگ چیتل کے سینگوں سے مشابہ ہوتے ہیں ۔ ایک دفعہ میں پاڑے کے شکار کے لیے غازی گھاٹ پہنچا ۔ اور شام کو اپنے میزبان کے گھر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ چند دیہاتی آئے جو اس روز دن بھر سندھ کے وسط میں نجانے والے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں کاشت کرتے تھے ۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ اس نے دن میں ایک جگہ دس پاڑے دیکھے ہیں ۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

"کب دیکھے ۔ ؟"

"جناب آج ۔"

"آج ۔۔ ؟"

"جی ہاں ۔ اور بڑے پرانے جانور ہیں ۔"

"جہاں تم نے پاڑے دیکھے وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے ۔ ؟"

"جناب کوئی چار میل ۔"

اس کا دوسرا ساتھی بولا

"دریا کے ساتھ جو بیلا ہے ۔۔ اسی میں ہیں ۔"

میں اپنے میزبان کی طرف متوجہ ہوا ۔

"کیا خیال ہے ۔ ؟"

"نیک خیال ہے ۔" وہ بولے

پھر انھوں نے بتانے والے سے صحیح پتہ پوچھ لیا ۔

شام سے ذرا پہلے ہم رائفلیں لیے وہاں پہنچ گئے ۔ گرمی کا زمانہ تھا اور گندم کی فصلیں تیاری کے قریب تھیں ، اس لیے کھیتوں میں جا بجا کسان موجود تھے ۔ شام ہوتے ہوتے کسان گاؤں کی طرف روانہ ہو لیے ۔ میرے ساتھیوں نے کھیتوں کے کنارے بنائے گئے گہرے گڑھوں کو صاف کیا ۔ اور ایک گڑھے میں مجھے بٹھا دیا ۔ وہاں شکار کا یہی طریقہ ہے ۔ کھیت کی مینڈ کے ساتھ اتنے کشادہ گڑھے بنائے جاتے ہیں جن میں آدمی آرام سے بیٹھ سکے ۔ صرف سر باہر نکلا ہوتا ہے اور رائفل ۔

رات کو پاڑے گندم کی فصلیں کھانے آتے ہیں اور اس وقت ان کا شکار آسان ہوتا ہے ۔۔ جس گڑھے میں مجھے بٹھایا گیا تھا وہ بھی کھیت کی مینڈ کی آڑ میں تھا ۔ سامنے کوئی دس گز چوڑا چراسے کا میدان ۔۔ جراسہ ایک قسم کا نرم کانٹوں والا سبز پتوں دار پودا ہوتا ہے ۔ جو خرگوشوں کی مرغوب غذا ہے ۔

جیسے جیسے اندھیرا بڑھا ویسے ویسے چاندنی چھٹکتی گئی ۔

میں رات کے شکار کے لیے حسب موقع رائفل کے دیدبان کو چونے سے سفید کر لیتا ہوں ۔۔ اس سے اندھیرے میں نشانہ آسان ہو جاتا ہے ۔

میرے ہاتھ میں سیون ملی میٹر کی رائفل تھی ۔ اور شاٹ گن گڑھے کی دیوار سے ٹکی کھڑی تھی ۔ ایک دفعہ دریا کی طرف نظر اٹھی تو چراسے مرغزاروں میں بے شمار جگنو چمکتے نظر آئے ۔ لیکن ان کا حجم جگنو سے بڑا تھا ۔ میں ان کو بغور دیکھتا رہا ۔ حتیٰ کہ فاصلہ ذرا کم ہوا تو نظر آیا کہ بے حساب خرگوش چراسے کے کھیتوں میں اچھل کود کر رہے تھے ۔ اور ان کی آنکھیں چاندنی میں چمکتی تھیں ۔

منظر نہایت دلفریب تھا ۔

بہر حال ۔۔ وہ رات فقط خرگوش شماری میں گذری پاڑے نظر نہیں آئے ۔

تاہم تین چار روز کی تگ و دو کے بعد میں نے حسب قاعدہ دو عدد نہایت مناسب قسم کے پاڑے شکار کیے ۔ پاڑے کی تصویر اگلے صفحے پر دیکھی جا سکتی ہے ۔

مادھو پور کے آدم خور کی تلاش میں ہم اب جس علاقے سے گذر رہے تھے ، وہ گھنا تو نہیں تھا ۔ لیکن درخت تناور اور ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع تھے ۔ جھاڑیاں جا بجا منتشر اور چھدری تھیں ۔۔ کہیں قریب ہی کوئی ندی یا تالاب معلوم ہوتا تھا ۔ یقیناً وہ علاقہ اس جنگل کے شب بیدار جانوروں کی چراگاہ کے لیے نہایت موزوں تھا ۔ زمین سبزے سے ڈھکی ہونے کی وجہ سے نقوش یا تلاش کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا تھا ۔

مگر ایک جھاڑی کے قریب سے گذرتے ہوئے میں خشک خون کا نشان دیکھ کر ٹھٹک گیا ۔ قریب سے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ گذشتہ رات کا نشان ہے ۔ ذرا اور جستجو کی تو جھاڑیوں کے وسط کا علاقہ اور دور تک کی زمین خاصی اکھڑی نظر آئی ۔ جا بجا گھاس اکھڑی اور مسلی ہوئی ۔ جیسے پیروں تلے روندی گئی ہو ، جھاڑیاں بھی دب گئی تھیں ۔ اطراف میں خون کی چھینٹیں ۔۔ اور ذرا دیر غور و تلاش کے بعد معلوم یہ ہوا کہ شیر اور سور میں زبردست مقابلہ ہوا ہے ۔

http://updf.weebly.com

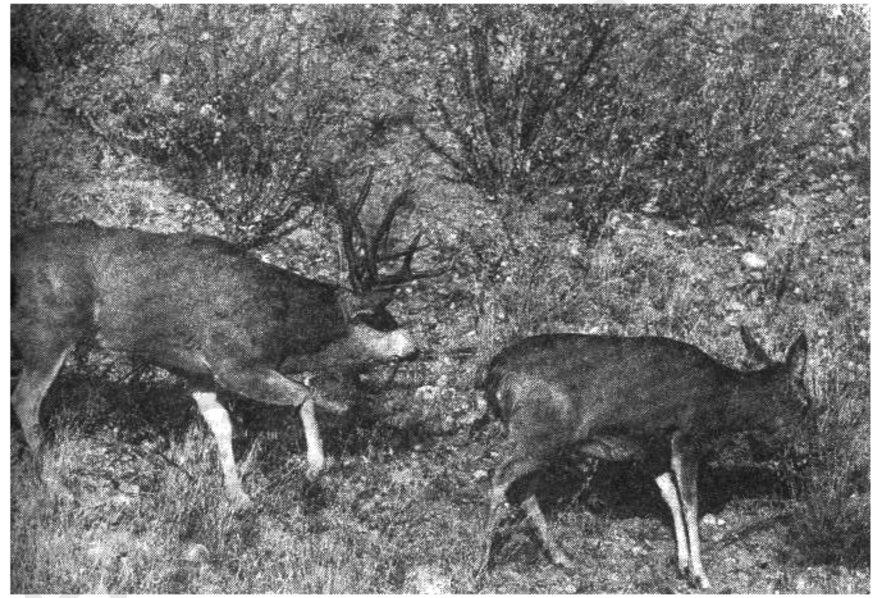

پاڑا

جنگلی سور محض اپنی حماقت کی وجہ سے شیر سے بھڑ جاتا ہے۔ آخر میں تو اس کا مارا جانا یقینی بات ہے مگر مرتے مرتے مقابلہ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ دو ہی جانور ایسے ہیں جو شیر کے مقابل آجائیں تو ڈٹ کر لڑ لیتے ہیں۔ ایک تو سور، جو آخر کار شیر کی خوراک بن جاتا ہے۔ دوسرے ریچھ، میرا خیال ہے کہ ریچھ کو ہلاک کرنے کے بعد شیر کھاتا تو شاید ہی ہو۔ ریچھ کا گوشت سیاہ اور سخت ہونے کے علاوہ رسی کی طرح بل کھایا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا کہ کھال کو گوشت سے جدا کرنا بھی محنت طلب کام ہے۔ بدمزہ بھی ضرور ہوتا ہوگا۔ میں نے بارہا شیر کے ہلاک کردہ ریچھ کی لاش دیکھی ہے جنھیں شیر نے کھانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

ریچھ اور شیر کا مقابلہ دیکھنے کا بھی مجھے کئی بار اتفاق ہوا۔ جنگلوں میں گھومتے رہنے والے لوگ اس قسم کے واقعات اکثر دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ نظر انداز کر کے اپنی راہ لگتے ہیں۔ لیکن شکاری خصوصاً ان کی جزئیات یاد رکھنے کی سعی کرتا ہے

سور کا گوشت شیر کو بہت مرغوب ہے۔ اس کو ہلاک کرنے میں شیر جلدی کرتا ہے۔ اور مارنے کے بعد فوراً ہی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ شیر کے شکار کردہ جانور پر سے اگر شیر کو ہٹانے کی کوشش کی جائے تو معمولی سی غرغش کے بعد ہٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس سور کی لاش پر سے ہٹنے میں بڑی ضد کرتا ہے اور ہٹتا ہے تو لاش اُٹھا کر لے جاتا ہے۔

میں نے سور اور شیر کا مقابلہ۔ کئی بار ابتدا سے انتہا تک دیکھا ہے۔

ہر بار سور آخر شکست کھا کر لقمہ تر بنا لیکن آخر وقت تک ہمت نہیں ہاری۔

اسی طرح شیر کو سیہی کا گوشت بھی بہت پسند ہے۔ اور اس کو شکار کرنے میں بڑی محنت کرتا ہے۔ زیادہ تر تو سیہی بھاگ جاتی ہے۔ لیکن اگر شیر اسے مارنے میں کامیاب ہو ہی جائے تو پھر اس کا گوشت بڑا مزے لے لیکر کھاتا ہے۔

اس کو دفاع کیلئے قدرت نے نوک دار بلکہ زہریلے کانٹوں کا نہایت موثر لباس دیا ہے اور یہ اپنے دشمنوں کو ان کانٹوں سے بڑی تکلیف دہ ضربیں پہنچاتی ہے۔ بعض کانٹے تو ایسے گوشت میں گھستے ہیں کہ نکلنا مشکل ہو جائے۔ میں نے دو بار ایسے شیر شکار کیے جن کے بدن میں سیہی کے کانٹے اس طرح گھسے تھے کہ ان کی معذوری اور بالآخر آدم خوری کا باعث بن گئے تھے۔

سیہی کے سارے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں منہ ڈالا جا سکے یا پنجہ ہی مارا جا سکے، صرف یہی صورت ہے کہ کسی طرح سیہی کا سر، شیر کے پنجے یا منہ کی زد میں آجائے۔ شیر کے پنجہ مارنے کے دوران سیہی کے کانٹے اس کے پنجے میں بڑی تکلیف دہ حد تک پیوست ہو جاتے ہیں۔ نواب قطب یار جنگ نے دکن کے علاقے تو شم کے مشہور آدم خور کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے گوشت میں ہڈیوں کے جوڑ کے قریب سیہی کا ایک کانٹا چبھ کر ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اس کی وجہ سے ہی شیر لنگڑا کر چلتا تھا۔ اس کانٹے اور لنگڑاہٹ نے اس کی کارکردگی کو خاصا متاثر کیا ہوگا۔ جم کاربٹ نے بھی اسی قسم کے ایک شیر کا تذکرہ کیا ہے۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

جس خطے میں سور اور شیر کا مقابلہ ہوا تھا وہاں کئی جگہوں پر شیر کے پورے پھیلے ہوئے پنجے کے نشانات ملے ۔ شیر صرف غصے یا مقابلے اور حملے کے وقت ہی پنجہ پھیلاتا ہے۔

میں نے اب اس جگہ کی تلاش شروع کی جہاں شیر نے بیٹھ کر سور کے گوشت سے شکم ُ ی کی ہو۔ امید ایسی ہی تھی کہ جنگ گذشتہ رات کے آخری حصے میں ہوئی ہوگی۔ اور محض پسندیدگی کی وجہ سے شیر نے کچھ گوشت کھایا ہوگا کچھ دوسرے وقت کے لیے چھوڑ رکھا ہوگا۔ یہ سب مفروضے ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ مفروضے ہی کارآمد نکل جاتے ہیں۔

ایک بات اور قابل ذکر ہے ۔ سور کا گوشت کھانے کے بعد شیر کو زبردست نیند آتی ہے۔ اور اکثر ۔ اس کی ادھ کھائی لاش کے نزدیک ہی لیٹ کر سو جاتا ہے۔ بشرطیکہ لاش کسی جھاڑی میں ہو۔ اگر کھلی جگہ پر ہو تو باقی ماندہ حصّہ کسی مناسب جگہ پتوں، کانٹوں اور جھاڑیوں میں اچھی طرح چھپا دیتا ہے ۔ اور چھپا دینے کے باوجود آس پاس میں موجود رہتا ہے تاکہ جنگل کے چور اور ڈاکو ۔ گیدڑ، لومڑی، لگڑ بگڑ، بھیڑئیے ۔ کتے وغیرہ اُس کے بقایا ماحضر کو خراب نہ کر سکیں۔

میں نے عظمت اور گلزار کو ہدایت کی کہ وہ شیر کے ماگھ دیکھتے چلیں میں نشانات پر صرف ضرورت کے وقت سرسری نظر ہی ڈال سکتا تھا۔

جنگل کی جو کیفیت میں نے اوپر بیان کی وہ نجانے کہاں تک قائم ہوگی ۔ اسی طرح سبزے کا فرش مخملیں، ملتا جا رہا تھا۔ پیشقدمی کی رفتار ایسے موقعے پر سست تو ہونا ہی چاہیئے۔ عظمت اور گلزار دونوں ہی نشانات تلاش کرنے میں خاص توجہ سے کام لے کر آگے بڑھتے جا رہے تھے ۔ مجھے یقین ہو چلا کہ شیر سے بس کسی لمحے بھی مڈبھیڑ ہونے ہی کو ہے ۔

دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جنگل کی کیفیت میں اتنی تبدیلی پیدا ہوئی کہ اب کسی کسی جگہ پر تیندو اور چرونجی کی جھاڑیاں بھی ملنے لگیں۔ کوئی کوئی گومچی

کی جھاڑی بھی تھی۔ گومچی کی پھلی اگر خشک ہو چکے ہوں تو، ذرا سی جنبش پر بڑا ہی شور کرتی ہے۔

اب تک ہمیں کوئی چرندہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ شیر کے آس پاس موجود ہونے کی علامت بھی ہو سکتی ہے۔ جس خطے میں جنگل کا بادشاہ موجود ہو۔ اس جگہ جنگل کی رعایا کو گذر کر خراب کرنے یا بادشاہ کی استراحت میں خلل اندازی کرنے کی کیا ضرورت۔ شیر کی بو ہی چرندوں کو کیا پرندوں کو بھی دور چلے جانے پر مجبور کر دیتی ہے ۔

میرے حواس ۔ اور اعضاء ۔ سب کاملاً آمادگی کی حالت میں تھے ۔ دونوں ہاتھوں میں رائفل ایسے زاویے سے تھی کہ چشم زدن سے بھی کم عرصے میں شانے پر آجاتی۔ نگاہ ہر طرف نگراں، سماعت کسی آہٹ یا کسی نامانوس آواز کو سننے کے لیے تیار۔ ذہن اور اعضاء فوری ردعمل کے لیے آمادہ۔

ذہن و جسم کی یہ آمادگی قدرتی حالت ہے۔ اور قدرت اسی وقت معاونت کرتی ہے جب اعانت کی ضرورت پیش آجائے ۔ مجھے اس اعانت غیبی کا احساس اکثر ہو جاتا ہے۔ اور جب بھی یہ احساس ہوا اس وقت میں یہ بھی جان لیتا ہوں کہ میرے عمل ۔ بلکہ زبردست مقابلے ۔ کا وقت آپہنچا ہے ۔

اس وقت بھی مجھ کو احساس ہوا ۔ اور فوراً ہی میں نے عظمت کو ہوشیار کیا ۔ اور بتا دیا خطرہ آس پاس منڈلا رہا ہے ۔ تاہم ابھی میری چھٹی حس نے خطرے کا اعلان نہیں کیا تھا ۔

میں درختوں کو بھی ایک نظر دیکھ ضرور لیتا ۔ ایک دفعہ اوپر نظر کی تو پہلی بار میں نے اس خطے میں لنگور دیکھا یہ پہلا جاندار تھا جو اس قطعہ جنگل میں نظر آیا ۔ ابھی میں اس کو دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ نہایت چالاکی کے ساتھ سرک کر پتوں کے جھنڈ میں روپوش ہو گیا ۔ لنگور یہ حرکت سخت خطرے کے وقت کرتا ہے۔ اب یہ کہ اس کو کیا خطرہ درپیش تھا یہ میں نہیں کہہ سکتا ۔ البتہ میں شیر کے بارے میں ہی سوچ سکتا تھا ۔

جنگل میں بعض اوقات نہایت معمولی باتوں کے مشاہدے سے بڑے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کارآمد نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ جو شخص ذرا ذرا سی جزئیات پر نگاہ رکھ سکے کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے۔

میں نے لنگور کو بہت مختصر عرصے کے لیے دیکھا۔ لیکن یہ ضرور دیکھ لیا کہ اس کا منہ ہماری طرف نہیں تھا۔ بلکہ اس طرف جدھر ہم پیشقدمی کر رہے تھے۔ گویا جو کچھ خطرہ بھی تھا وہ اسی طرف جدھر ہم جا رہے تھے۔

لنگور بڑا زود حس اور عقلمند جانور ہے۔ خطرات کے مقابلے میں بڑی ہمت اور ذہانت کا ثبوت دیتا ہے۔ اور مقابلے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ شیر اور چیتے سے تو لنگور کی روح فنا ہوتی ہے۔ اور اسی لئے ان دونوں کی نظروں سے بچنے کے لیے نہایت شاطرانہ تدابیر اختیار کرتا ہے۔ لیکن اگر ان میں کسی کے ہتھے چڑھ ہی جائے تو اپنی کمزوری اور بیچارگی کا لحاظ کرتے ہوئے مقابلے کی کوشش نہیں کرتا۔

کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ چیتے کو دیکھتے ہی سارے بندر درختوں سے اتر کر زمین پر آجاتے ہیں تاکہ چیتا ایک کو پکڑ کر لے جائے۔ لیکن یہ بات میرے تجربے کے بھی خلاف ہے اور اصول قدرت کے بھی منافی۔ بندر کو شیر تو خیر بالعموم پکڑتا ہی نہیں۔ تاوقتیکہ کوئی بندر زمین پر ہتھے چڑھ جائے۔ لیکن چیتا بُری بلا ہے۔ وہ بندر کے تعاقب میں درخت پر بھی اس پھرتی سے چڑھتا ہے جس طرح بندر اور جس کو تاک لیا اس کو پکڑ کر ہی دم لیتا ہے۔

اگلے صفحات پر لال منہ اور کالے منہ دونوں قسم کے ان بندروں کی تصویریں ہیں جو پاکستان اور ہندوستان کے جنگلوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ہندوستان کے تو شہروں میں بھی ان کا پایا جانا اب اسی قدر عام ہے۔ جس قدر انسانوں کا پایا جانا۔ کالے منہ کے جانور کو

لنگور اور لال منہ کے جانور کو بندر کہتے ہیں۔ لنگور کی دم اس کی جسامت کے تناسب سے زیادہ لانبی ہوتی ہے۔ جو تصویر میں واضح ہے۔

جس جگہ لنگور نظر آیا وہ درخت کوئی پچاس گز پر رہا ہوگا۔ اس مقام پر کہیں کہیں تیندو کی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں کے نزدیک ہی عظمت نے جمے ہوئے خون کا ایک دھبا بھی دیکھ لیا۔ اور یہ صاف ظاہر تھا کہ شیر سور کو ان جھاڑیوں میں لے گیا۔ میں نے عظمت اور گلزار کو جھاڑیوں داخل ہونے سے منع کیا۔ اور۔۔!

اسی وقت مجھے شدید خطرے کا یکبارگی احساس ہوا۔ اس احساس کی کیفیت بھی عجیب ہی ہوتی ہے۔ سردی کی ایک برق رفتار لہر پشت پر دوڑ جاتی ہے۔ رونگٹے کھڑے ہونے کی بار بار کوشش کرتے ہیں۔ اور طبیعت بیچین محسوس ہوتی ہے۔

میں نے غیر ارادی طور پر گھوم کر پیچھے دیکھا۔

اور میں جیسے تھا ویسے ہی منجمد ہو کر رہ گیا۔

نجانے عظمت اور گلزار نے بھی میری طرح وہ سب دیکھا جو میں نے دیکھا۔ مجھ پر تو جو طلسماتی اثر ہوتا ہے اس کو زائل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ عظمت و گلزار کی کیفیت کا علم کچھ گھنٹے بعد ہوا۔

ہم سے صرف تیس چالیس گز کے فاصلے پر ۔۔ بہت بڑا، غیر معمولی بڑے سر والا شیر، بلی کی طرح زمین پر دبکا ۔ ہماری طرف بڑھ رہا تھا ۔ اگر ایک لمحہ اور میں پیچھے نہ دیکھتا تو ہم تین میں سے ایک ۔۔ بہ گمان غالب میں ۔۔ اس شیر کا شکار ہو جاتا۔

شیر کو دیکھنے کے بعد ایک سکنڈ کے ہزارویں حصّے کے لیے تو ہر ذی روح کا ردعمل ایک ہی ہوتا ہے ۔۔ شدید خطرہ ۔۔ موت پیش نگاہ ۔ عزرائیل شیر کے بھیس میں ۔۔ لمحہ قیامت کا قرب ۔۔!

شکاری کی یہ کیفیت فوراً زائل ہو کر مدافعت اور مقابلے کی طاقت عود کر آتی ہے۔

http://updf.weebly.com

شیر نے بھی مجھے گھورتے دیکھ لیا۔ اور اس طرح زمین سے سر لگا لیا جس طرح بعض اوقات خانگی بلیاں کرتی ہیں۔ میں جانتا تھا حملہ بس اب ہوا۔

رائفل تو ایک قدرتی حرکت کے طور پر شانے تک آئی۔ نشانہ لیا گیا۔ گردن اور سر کا جوڑ زد پر تھا۔ انگلی نے فوراً ٹریگر کے گرد لپٹ کر دبا ڈالا۔ اسی وقت فائر ہوا اور ساتھ شیر نے نشست بدلنے کو حرکت کی۔ دھماکا۔ لنگور چیخنے لگے۔ پرندے پھڑپھڑا کر اڑے۔ اور شیر ایک زبردست دھاڑ کے ساتھ پلٹ کر بھاگا۔ گولی زمین پر لگی تھی۔

میں نے لکھا ہے جس وقت ٹریگر دبا اسی وقت شیر نے حرکت کی۔ لہٰذا گولی اپنے ہدف پر نہیں پہنچی۔ اب تو شیر کی دم اور پچھلا حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ میں نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار بھی خالی۔ گولی اس کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔

اور اتنی دیر میں شیر نظروں سے اوجھل۔

"باپ رے باپ"

عظمت تو لرز رہے تھے

"میاں افسوس یہ ہے کہ دونوں گولیاں خالی گئیں"

میں نے جواب میں کہا۔

"اپن تو مرتے مرتے بچ گئے خان"

عظمت نے کہا۔

"ہمیشہ بچ جانے کے بعد لوگ یہی کہتے ہیں"

گلزار پر بھی کپکپی طاری تھی۔ لیکن اس کے اوسان اس قدر معطل تھے کہ بولا بھی نہ گیا۔ میں نے دونوں کو تسلی دی پانی پلایا۔ تب ذرا حواس درست ہوئے۔ گلزار اور عظمت دونوں ہی کو آدم خور سے زمین پر مقابلے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

جس طرح شیر نے ہم پر تاک لگائی اور جس سکون اور آہستگی کے ساتھ تعاقب میں آیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہی آدم خور ہے۔ اگر گولی ذرا درست تر جاتی تو

پہلے ہی دن آدم خور ہمارے قدموں میں ہوتا۔ بہر حال یہ تحقیق تو ہو ہی گئی کہ آدم خور اسی علاقے میں موجود ہے۔

وہ یقیناً دیر سے ہمارے تعاقب میں نہیں تھا۔ لنگور نے شیر کو دیکھ کر ہی حرکت کی۔ بلکہ شیر کو حرکت کرتے دیکھ کر حرکت کی۔ سمت کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکا نقوش پا نہیں ملے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ مادھو پور کے نواح کا سارا علاقہ بڑے ہی نرم اور باریک پتی والے سبزے کے فرش سے ڈھکا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھاس پر نشان کیسے پڑے۔ یہی وجہ تھی کہ دیہاتی اس کے ماگھ زمین پر نہ بننے کے قائل ہو گئے۔

یہ غیر ترقی یافتہ ذہن کی کندی کی دلیل ہے۔ ان بیچاروں کا دماغ محض خالی تھا۔ تجزیاتی صفات صرف تربیت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اسی کا فقدان تھا۔ تب ہی تو ان کو شیر کے بھوت پریت ہونے کا قائل ہونا پڑا تھا۔ اور یہ بھی باور کرنا پڑا تھا کہ بھوت یا بد روح ہونے کی وجہ سے اس کے پیروں کے نشان نہیں بنتے۔

شیر جن جھاڑیوں اور پتھروں کے نزدیک غائب ہوا تھا، وہیں سے تعاقب کا از سرِ نو آغاز کر دینا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ میں آدم خوروں کی خبیث سرشت سے واقف ہوں۔ وہ ظالم جس جگہ غائب ہوا۔ وہاں سے رخ بدل کر دوسری طرف گیا ہوگا۔ اور اگر بندوق کے دھماکے دو چار بار سن کر ان کا عادی ہو گیا ہے تو عین ممکن تھا کہ کسی اور جگہ گھات لگانے کی فکر میں ہے۔

میں جس جگہ کھڑا تھا اس کے بائیں جانب کیتھے کے دو بڑے تناور درخت تھے۔ میں نے گلزار کو اشارا کیا کہ درخت پر چڑھ کر اچھی طرح چاروں طرف دیکھے ممکن ہے کہیں شیر نظر آ جائے۔ گلزار نے بندوق زمین پر رکھی۔ ساتھ ہی جھولا وغیرہ رکھ دیا اور جوتے اُتار کر درخت پر چڑھ گیا۔

لیکن گلزار کے درخت پر چڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جس درخت پر وہ چڑھا اسی پر دو تین بندر چھپے بیٹھے تھے گلزار کو درخت پر دیکھ کر انھوں نے فلک شگاف چیخیں ماریں اور مجھے یقین ہے کہ شیر نے ہوشیار ہو کر درخت کی طرف

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

دیکھا ہوگا اور گلزار کو دیکھ کر فوراً ہی بھاگ لیا ہوگا۔ آدم خور شیر درخت پر چڑھے ہوئے آدمی سے بہت گھبراتا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ذرا ہی دیر پہلے اس پر دو فائر کئے جا چکے۔

بہرحال گلزار نے اپنا کام پورا کیا۔ درخت پر خوب بلند ہو کر چاروں طرف اچھی طرح جائزہ لیا۔ اور اتر آیا۔ اس نے بتایا کہ جس طرف شیر بھاگ کر گیا ادھر کئی ایسی جھاڑیاں ہیں جن میں شیر ہو سکتا ہے مگر نظر نہیں آتا۔

میں نے اب اپنی اسکیم میں کسی قدر تبدیلی کر دی۔ عظمت کو یقین دلایا کہ اس وقت ان دونوں کا میرے ساتھ رہنا نہ صرف نہایت خطرناک عمل ہے بلکہ شکار کی ضروریات کے منافی۔ ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے مجھے جس ترکز خیال کی ضرورت ہے وہ نہیں ہوتی۔ پھر شیر کے حملے کی صورت میں مجھے ان دونوں کو بچانا اس وقت بڑا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ لہٰذا میں تنہا شیر کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر عظمت بمشکل راضی ہوئے۔ آخر میں نے ان سے تاکید کی۔ درخت پر چڑھ کر بیٹھے رہیں اور میری واپسی تک بیٹھے رہیں زمین پر قدم نہ رکھیں۔ انھوں نے آخری بار کہا کہ تنہا جانے میں میرے لیے بھی اتنا ہی خطرہ ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس خطرے میں پہلے بھی دسیوں بار پڑ چکا اور الحمدللہ کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہوا۔ اپنا اکیلے کا دفاع اتنا مشکل نہیں۔

بہرحال پہلے وہ۔ ان کے پیچھے گلزار درخت پر چڑھ گئے۔ ان کی طرف سے کاملاً اطمینان کرنے کے بعد میں نے شاٹ گن شانے پر لٹکائی اور رائفل ہاتھ میں لے کر شیر کے تعاقب میں چل پڑا۔ لیکن سیدھا ادھر نہیں گیا۔ ایک طویل نیم دائرے کی شکل میں گھومتا ہوا یوں چلا کہ آخر ان جھاڑیوں کے عقب میں نکلوں جن کے بارے میں گلزار نے بتایا تھا۔

فائر ہونے کے بعد شیر کا نزدیک ٹھہرنا نہایت مشکل تھا۔ لیکن آدم خور شیر کی خصلتوں کے پیش نظر اس بات کے امکان کو قطعاً رد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور

پھر اس کا ذرا دیر بعد اس طرف واپس آنا بھی کچھ ایسا ناممکن نہیں تھا۔

تقریباً سو گز ترچھا۔ نیم دائرہ بنا کر گھومتے ہوئے میں نے رخ بدلا اور کوئی ساٹھ گز دائرے میں گھوم کر ایک عمیق نالے کے کنارے آگیا۔ جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ نالے کے کناروں پر گوکچی کی جھاڑیاں تھیں اور ان میں جنگلی بیلیں اس طرح لپٹ گئی تھیں کہ گھنی دیوار جیسی بن گئی تھی۔ لیکن ایسی گھنی نہیں تھیں۔ آر پار نظر آ رہا تھا۔

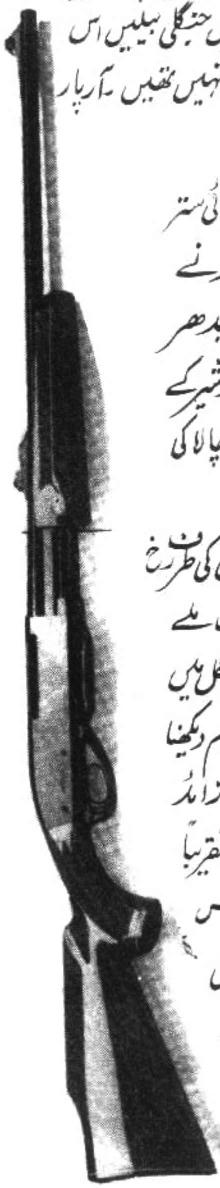

میں نالے پر چڑھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ مجھ سے کوئی ستر گز شمال مشرق کی جانب جنگلی مرغیاں پھڑپھڑا کر اڑیں۔ اور شور کرنے لگیں جیسے کسی جانور سے ڈر گئی ہوں۔ خطرے کی آواز تھی۔ جدھر وہ مرغیاں اڑیں شیر کو ادھر ہونا تو نہیں چاہیئے۔ لیکن آدم خور شیر کے بارے میں سارے اصول غلط ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی چالاکی سے کچھ بعید نہیں۔

میں ایک درخت کے تنے سے پشت لگا کر، آوازوں کی طرف رخ کئے چند منٹ کھڑا رہا۔ میں سوچ رہا تھا شاید کوئی اور علامت ملے اس عرصے میں جنگلی مرغیاں بھی کڑکڑ کر کے چپ ہو گئیں۔ اور جنگل میں کامل سکوت طاری ہو گیا۔ میں پھر آوازوں کی سمت بڑھا۔ کم از کم دیکھنا تو ضرور تھا۔ آخر مرغیاں کیوں اڑی تھیں۔ فاصلہ ستر گز سے زائد نہیں تھا۔ لیکن میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا، چاروں طرف دیکھتا تقریباً سات منٹ یا چھ منٹ میں اس جگہ پہونچا۔ بالکل قریب اس لیے نہیں گیا کہ مجھے دیکھ کر مرغیاں پھڑپھڑائیں گی اور شور کریں گی جس جگہ مرغیاں کڑکڑائی تھیں وہاں جھاڑیاں بہت بڑی اور گھنی تھیں جن میں اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چھوٹے بڑے پتھر بھی آس پاس بکھرے تھے جن پر جنگلی بیلیں چڑھ گئی تھیں۔

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

اب میں تیس گز کے فاصلے تک بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

دوبارہ ایک تناور درخت سے پشت لگا کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ میرے بائیں ہاتھ پر وہ نالہ تھا جس کا ذکر کیا دائیں جانب جنگل اور جھاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ — اور — !

ابھی میں وہاں سے ایک ہی قدم ہٹا تھا کہ ایک زبردست سانپ۔ اژدہا۔ نزدیکی چٹان سے نکلکر میرے گرد لپٹ گیا، اور اس تیزی سے کہ میں حرکت کرنے کے باوجود پوری طرح اس کی گرفت میں آگیا۔ اور قبل اس کے کہ سنبھل سکوں — کچھ اس کے بے انتہا بوجھ کچھ اپنی کمزوری کی وجہ سے زمین پر گرا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ بندوق شانے پر تھی — خدا کا کرنا ایسا ہوا — سانپ نے میری گردن، یا شانہ پکڑنے کو منہ مارا تو بندوق کی نال بھی ساتھ ہی اس کے جبڑوں کے درمیان آئی۔ دانتوں کا کچھ حصّہ میری موٹی بش شرٹ کے کپڑے سے گذر کر شانے میں پیوست ہو گیا۔ اور سانپ نے میرے گرد لٹپنا شروع کیا — میری یہ کوشش تھی کسی طرح اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں اور سانپ کی یہ کوشش کہ میری گردن بھی لپیٹ میں لے لے۔

اس کے سر اور وحشتناک جسم کے رینگتے ہوئے حصّے میرے جسم کے گرد اپنا دائرہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔ اور میں دونوں ہاتھوں سے اس کو روکنے کی تدبیریں کرنے میں لگا تھا۔

موت و حیات کی اس شدید جنگ میں اب تک دونوں برابر تھے۔ کچھ میرے حرکت کرنے۔ یا گرنے کی وجہ سے وہ پوری طرح میرے گرد لپٹ نہیں سکا تھا —

میں سمجھتا ہوں کہ رائفل تو میرے ہاتھ سے چھٹ کر پہلے ہی گر گئی ہوگی۔ اس کمبخت کا منہ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں — اور وہ بندوق کی نال منہ میں لئے دبانے کی کوشش میں تھا۔ میں اس کوشش میں بھی تھا کہ کسی طرح بندوق کی نال اس کے منہ میں

اس طرح آئے کہ فائر کر سکوں لیکن اس نے پکڑی اس طرح تھی کہ دونوں نالوں کے منہ اس کے جبڑوں سے باہر — ایک سائڈ سے اس نے منہ مارا اور بندوق کو گویا درمیان سے منہ میں لے لیا تھا۔

اور اسی وقت اژدہے نے شانے کی گرفت سے منہ ہٹایا — اور میں نے اس کی گردن پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا — اتفاق کہ اس نے ہاتھ پر منہ کھول کر حملہ کیا — اور میرا ہاتھ سیدھا اس کے جبڑے کے اندر — بس وہیں سے میں نے اس کا جبڑا پکڑ لیا — اور کسی مجنونانہ طاقت سے پکڑا کہ سانپ نے سر کو جھٹکے دیئے پیچھے کھینچا، بل کھائے مگر میں نے نہ چھوڑا۔ یہی تو میری زندگی بچنے کی تدبیر تھی۔ سانپ حملے کے بجائے اب مدافعت میں لگ گیا۔ میرے جسم پر سے اس کا جسم ہٹ گیا اور مجھ کو ایک ایسا جھٹکا لگا جس سے معلوم ہوا میرا پورا بایاں ہاتھ شانے سے اکھڑ گیا۔ میرا بایاں ہاتھ بچپن سے ہی کمزور ہے۔ اس لئے کہ کہنی کے جوڑ سے ذرا اوپر سے ٹوٹ چکا ہے۔

۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ میں نے تین چار بچوں کے ساتھ مل کر لکڑی کی پھٹیاں کیلوں سے جوڑ کر ہوائی جہاز بنایا۔ اس کے تین سرے تین لڑکوں نے شانوں پر رکھ کر جہاز کو اُٹھایا اور اس پر میں بیٹھا۔ میرے بیٹھنے سے وہ کیلیں جو ٹھونکی تھی نکل گئیں اور میں گرا — میرے اوپر دو تین لڑکے گرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا ہاتھ ٹوٹ گیا — شام تک مختلف تدابیر کی گئیں۔ درد کم نہ ہوا ورم ہو گیا۔ رات رو رو کر کٹی — صبح ہی مجھے حمیدیہ ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر خان اس زمانے میں بھوپال کے تسلیم شدہ اسپیشلسٹ تھے — انھوں نے مجھے آپریشن تھیٹر میں رکھا۔ کلوروفارم کی بو دے کر مجھے بیہوش کیا اور ہاتھ کی ہڈی بٹھا کر لکڑی کی تختیاں رکھیں اور پٹی باندھ دی۔

چوبیس گھنٹے بعد ایکسرے لیا گیا تو معلوم ہوا ہڈی صحیح نہیں جڑ رہی۔ لہٰذا مجھے پھر کلوروفارم سنگھا کر بیہوش کیا گیا — ہڈی اکھاڑ کر پھر بٹھائی گئی اور پٹی باندھ دی

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

عام قسم کا اژدہا

گئی۔ اڑھتالیس گھنٹوں بعد پھر ایکسرے سے معلوم ہوا کہ ہڈی غلط جڑ رہی ہے پھر وہی عمل دہرایا گیا۔ اس طرح نو بار کوشش کی گئی تب کہیں ہڈی درست بیٹھی اور آخر پندرہ روز بعد ہاتھ کی پٹیاں کھول دی گئیں۔ ڈاکٹر خان محمد دیکھنے آئے تو میں نے ٹوٹ کر جڑے ہوئے ہاتھ سے ان کو ہار پہنایا۔ تب مجھے ہاسپٹل سے چھٹی دی گئی۔ اس کے بعد کتنے ہی دنوں تک میرے اس جوڑ پر بھیڑ کے تازہ دودھ کی مالش کی جاتی رہی۔

لیکن میرا یہ ہاتھ ہمیشہ کمزور رہا حتیٰ کہ اب، اگر کار کا اسٹیرنگ پاور اسٹیرنگ نہ ہو تو مجھے کہنی کے جوڑ میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

غرض، اژدہے کے ساتھ میری جنگ اب قطعاً فیصلہ کن مرحلے میں تھی۔ میں اگر اس موذی کا جبڑا چھوڑ دیتا تو یقیناً میری بوٹیاں نوچ ڈالتا۔ میں اس وقت موت کے جنون میں مبتلا تھا۔ اور وہ آخری وقت تھا جب انسان عجیب و غریب

درندگی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یا اس کے اندر سویا ہوا درندہ جاگ اٹھتا ہے۔ اگرچہ یہ بیداری بہت قلیل المیعاد ہوتی ہے۔ کڑھی میں ابال ذرا دیر کے لیئے ہی آتا ہے۔

میں نے اس وقت جس طاقت کا مظاہرہ کیا۔ غالباً عام حالات میں اس کی آدھی طاقت بھی مجھ میں نہیں ہوتی ہو گی ۔۔ اس طاقت کا مرکز موت کا خیال۔ یا خوف ہی ہو سکتا ہے۔

میرا دایاں ہاتھ آزاد تھا۔ وہ میں نے کمر میں لگے ہوئے چھرے کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ سانپ کی دم کا اتنا زبردست تازیانہ ہاتھ پر پڑا کہ شانے تک سن ہو گیا۔ عجیب بات تھی ۔ گویا سانپ میری ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا۔

انسان سے تو جانور اچھے۔

سانپ ۔ میری ہر حرکت پر نظر رکھے تھا۔

دشمن کی حرکات کی طرف سے غافل ہو جانے والا، اپنی بقا کی امید بھی نہیں رکھ سکتا۔

ساتھ ہی میرا بایاں ہاتھ جس سے میں نے سانپ کا جبڑا پکڑ رکھا تھا، بل کھانے لگا۔ اب وہ میرا ہاتھ مروڑ کر گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

موت اور زندگی کے اس مقابلے کے دوران ذرا نظر اُٹھی تو ۔ سامنے ۔ صرف دس بارہ گز پر شیر ۔ کتے کی طرح زمین پر بیٹھا۔ دلچسپی کے ساتھ میری اور سانپ کی کشتی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے یا درندگی کے بجائے مسخرہ پن معلوم ہوتا ہے۔ جیسے مجھ کو سانپ کی گرفت میں دیکھ کر اس کو مسرت ہو رہی ہو۔

میں نے اسی حالت میں دائیں ہاتھ سے رائفل اُٹھائی ۔ اور شیر کی طرف نال کر کے فائر کر دیا۔ فائر کے ساتھ ہی شیر اپنی جگہ پر الٹ گیا۔ ادھر سانپ نے میری گرفت سے اپنا جبڑا آزاد کرا کے شانے پر دوبارہ منہ مارا۔ گردن اور شانے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کے درمیانی حصے میں تیز سوئیاں سی چبھتی معلوم ہوئیں۔ سانپ نے پھر شانے پر دانت گاڑ دیے تھے اور اس بار بھی بندوق کی نال ہی بیچ میں آ کر میرے شانے کی ہڈی کے نہ ٹوٹنے کا باعث بنی۔ اس کے علاوہ پیراشوٹ کی رسّی کا گچھا نہ جانے کس طرح الجھ کر شانے پر آ گیا۔ وہ بھی سانپ کے جبڑوں کے درمیان آ کر میری حفاظت کا باعث بنا۔ سانپ کے دانت ہڈی میں نہیں اتر سکے۔

شیر اپنی جگہ پر ایسا بے حس و حرکت پڑا تھا جیسے مر ہی گیا ہو۔ میں نے رائفل پھر زمین پر ڈالی اور خالی ہاتھ سے کمر میں لگا چھرا نکال لیا۔

سانپ نے شانہ چھوڑ کر میری گردن پر منہ مارا۔ اور میں نے دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی اور بائیں ہاتھ سے جو خنجر کا وار کیا تو اس کا سر صاف الگ ہو گیا۔

گرفتیں ڈھیلی ہو کر سانپ زمین پر گرا۔ میں نے ایک اور وار کیا۔ اور ایک ٹکڑا اور کاٹ دیا۔ فوراً ہی میں نے خنجر پھینک کر رائفل اٹھائی۔ اور شیر کی طرف دیکھا تو وہ غائب۔

میرے خیال میں۔ جس شدید مصیبت اور جسمانی محنت سے میں گذرا۔ اس کے بعد اوسان باقی رہنا ممکن ہی نہیں۔ میں نے رائفل کا خالی کارتوس نکال کر دوسرا لگایا۔ اور ایسا ڈگمگایا جیسے چکرا کر گر جاؤں گا۔ قریب ہی درخت تھا۔ اس کا تنا پکڑ کر اپنے کو سنبھالا۔ اور اسی سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

دنیا کی ہر وہ شے جن کا میری نظریں مشاہدہ کر رہی تھیں۔ نئی نئی معلوم ہوئی۔ درخت، سبزے کا فرش، جھاڑیاں۔ حتیٰ کہ آسمان۔ سب نیا تھا۔ ساری دنیا نئی تھی۔ جیسے میں مر کر زندہ ہو گیا ہوں۔ جیسے مجھے دوسری زندگی ملی ہو۔

میں نے موت کی قربت کو نہایت شدّت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

یہ ایک نیا تجربہ تھا۔

زندگی صرف نئے تجربات کے مجموعے کا ہی نام ہے۔

لیکن وجود اور عدم ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں۔

میں اب وہاں ٹھہر کر کیا کرتا۔ سانپ ابھی تک بل کھا رہا تھا۔ موت کے بل۔ اور زخمی شیر غائب تھا۔ لیکن قریب ہی بیٹھا اپنا زخم چاٹ رہا ہو گا۔ اور ذرا بھی تکلیف کم ہوئی تو میری فکر کریگا۔ میں رائفل سنبھالے کھڑا ضرور تھا۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں میرے پیر جسم کا بوجھ بمشکل ہی سنبھالے تھے۔ ٹانگوں میں جان ہی نہیں تھی۔ جیسے ربڑ کی بنی ہوں۔ ربڑ بھی وہ جس میں صرف لچک ہی لچک ہو۔

شانے کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ تکلیف علیحدہ تھی۔ میں نے چند قدم بڑھ کر اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں شیر گرا تھا۔ اس جگہ خون کا بڑا سا دھبا تھا۔ گاڑھا گاڑھا تازہ خون کافی مقدار میں پڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شیر اچھا زخمی ہوا ہے۔

میری حالت بہت خراب تھی۔ خستگی، زخم، خون بہتا ہوا۔ اور اعصاب پہ اتنا خراب اثر پڑا تھا کہ کیا بیان کیا جائے۔

اب میں اس جگہ کی طرف واپس ہوا جہاں عظمت تھے۔ جب میں درخت کے نیچے پہنچا اور اوپر عظمت و گلزار نظر آئے تو یکبارگی میری ٹانگوں کا دم نکل گیا۔ اور میں دھم سے زمین پر گر پڑا۔

"ارے خان۔ کیا ہوا۔!"

اور عظمت جس سرعت کے ساتھ درخت سے اترے ہیں اس کا تذکرہ ممکن نہیں۔ بندر کا باپ بھی اتنی پھرتی سے نہیں اتر سکتا۔ اور اترتے ہی میرے لپٹ گئے۔

"کیا بات ہے خان۔؟"

دو لمحے ٹھہر کر گلزار بھی اتر آیا۔ اس کو دیر اس لیے لگی کہ عظمت اپنی رائفل اس کو تھما آئے تھے۔ میں نے پانی پیا۔ تب ذرا طبیعت سنبھلی۔ اور ساری تفصیل ان کو سنائی۔

میں نے بش شرٹ اتار دی۔ تو عظمت نے زخم صاف کر کے اس میں ٹنکچر لگا کر پھایا رکھ دیا۔ میرے لیے ذرا دیر آرام بھی ضروری تھا۔

میں نے عظمت سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ گلزار کو بھی بندوق لیے رہنے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کی ہدایت کر کے میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دس منٹ بعد میں آمادہ عمل تھا۔

ہم نے نالے پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ گلزار رائفل لیے نگرانی کرتا رہا۔ کھانے کے بعد میں نے اسپرین کی دو گولیاں کھائیں۔ اور ظہر کی نماز ادا کی۔

"تم لوگ اگر درخت پر چڑھ کر بیٹھے رہو تو میں شیر کو ابھی مار کر لاتا ہوں۔"

"خبردار۔" عظمت آنکھیں نکال کر بولے۔ "پاگل ہو گئے ہو کیا خاں۔"

"کیوں — ؟"

"آج واپس چلو — پھر دیکھیں گے۔"

"بس شکار اتنے میں ہی ختم۔"

"شکار گیا جہنم میں — تم واپس چلو۔"

"دیکھو — شیر نزدیک ہی ہے — یہ موقع ہاتھ سے گیا تو —"

"میاں زخمی ہو رہے ہو — کیا جان دینے کا عہد کر کے آئے ہو — چلو واپس۔"

اصرار اور انکار کے ایک مرحلے کے بعد آخر جب میں نے رائفل اٹھا کر شانے تک لانے میں تکلیف محسوس کی تو واپسی ہی میں خیریت معلوم ہوئی۔

ویسے بھی شیر کے شکار کے اصول و قواعد۔ زخمی شیر کا فوراً تعاقب کرنے کی سختی سے ممانعت کرتے ہیں۔ شیر کے زخم کو سرد ہونے کے لیے مناسب وقت دینا چاہیئے۔ اس میں کئی مصلحتیں ہیں — اگر شیر زیادہ زخمی ہے تو خون بہہ کر اس کی کمزوری کا باعث ہو گا۔ زخم سرد ہو جانے کے بعد جسم کی کارکردگی کو متاثر کرتا ہے۔ اور اگر حملہ کرے بھی تو اس حملے میں وہ تیزی، پھرتی، اور سرعت نہیں ہو سکتی جو شیر کے حملے کو برق رفتاری سے مشابہ کر دیتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شیر کا حملہ — انتہائی خطرناک، اور جان لیوا حملہ ہوتا ہے۔ جس سے شاذ ہی کوئی بچ سکتا ہو۔

سہ پہر سے ذرا پہلے ہم مادھوپور پہنچ گئے۔ وہ لوگ اس وقت ہماری واپسی پر متعجب ہوئے۔ کسی کو یہ خیال ہوا کہ ہم کامیاب واپس آئے۔ کسی کو شبہ ہوا کہ ہم شیر

کے مقابلے سے دستبردار ہو گئے۔ شیر پال بھی آئے اور شکوک و شبہات کے ملے جلے جذبات کے ساتھ واقعات کے بارے میں استفسار کیا۔

میرا زخمی ہو جانا کوئی اہم بات نہیں تھی۔ لیکن گاؤں والوں کے اعتقادات کو خاصی تقویت پہنچی۔ وہ کہنے لگے شیر نے ابھی تو تنبیہہ کی ہے۔ آگے اور نجانے کیا ہو۔ میں ان فضول باتوں کا کیا جواب دیتا۔

وہ دن آرام میں گذرا — شام کو شیر پال کے ساتھ شطرنج کی چند بازیاں کھیلیں۔ پھر عشاء کے بعد لیٹ گیا۔ مگر رات کو بخار ہو گیا۔ اور پیاس کی شدت رہی۔ جس قسم کے سانپ کے دانت لگے تھے۔ وہ زہریلا تو ہوتا نہیں۔ صرف زخم کی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ دراصل شدید محنت۔ دہشت اور موت کے منہ میں جا کر واپسی نے اعصاب کا نظام بگاڑ دیا۔ اور وہی بخار کا باعث ہو گا۔

صبح اٹھا تو سر میں سخت درد تھا — لیکن میں نے کسی سے اظہار نہیں کیا۔ میں اپنی علالت کی اطلاع دیگر لوگوں کے غلط اعتقادات کو تقویت پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

ناشتے کے بعد عظمت بولے۔

"تمہارا چہرہ تمتمایا ہوا ہے — بخار تو نہیں۔"

"نہیں —"

ناشتے کے بعد میں تیار ہوا اور عظمت و گلزار کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف چل دیا۔ میں شکار کے ارادے سے تو نکلا نہیں تھا۔ صرف گاؤں والوں کو مرعوب کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ میں بمشکل دو میل جا سکا — بخار تیز ہو گیا۔ سر کا درد بڑھ گیا۔ بخار کی حالت میں کسی قسم کی محنت مفید نہیں ہوتی لیکن میں گاؤں میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

"میں جانتا ہوں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے گی۔"

اور انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا تو تیز بخار

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

"ارے — تم کو تو سخت بخار ہے۔"

"ہاں ہے تو —"

میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا دیوانگی ہے۔ تم کو آرام کرنا چاہیئے تھا۔"

میں نے اپنے جنگل آنے کی وجہ ان کو بتائی۔ اور اس توجیہہ کے ساتھ کہ عظمت کچھ نہ بول سکے،۔

"سانپ کے زہر کا اثر ہے۔"

گلزار بولا۔

"دور ہو جائے گا —"

عظمت نے تھرماس نکالا — اور کافی کا ایک کپ بھر کر مجھے دیا۔

"لو خان —"

"تم اور گلزار مخالف سمتوں میں رخ کر کے بالکل ہوشیار بیٹھو۔ میں دوا کھا کر سو جاؤں گا — غالباً دو تین گھنٹے بعد طبیعت سنبھلیگی۔"

میں نے کافی کے ساتھ ایک زود اثر دوا کی دو گولیاں کھائیں۔ اور رائفل ہاتھوں میں لیے لیے ہی آنکھیں بند کر لیں — اگرچہ کافی پینے سے میری نیند ہمیشہ متاثر ہوتی ہے اور اکثر بے آرامی کا باعث بنتی ہے لیکن اس روز اچھی نیند آگئی۔ اور خوب غافل سویا۔

آنکھ کھلی تو آس پاس نہ عظمت تھے نہ گلزار۔

چند قدم کے فاصلے پہ ایک سیاہ گوش مجھ پہ نظریں جمائے کھڑا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے رائفل پر اپنی گرفت درست کی میں نے سر اُٹھایا۔

سارا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ اور سر میں درد نہیں تھا۔ مجھے سر اُٹھاتے دیکھ کر سیاہ گوش نے زقند لگائی اور جھاڑیوں میں گھس کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ اتنی دیر سوئے رہنے سے طبیعت خاصی بحال ہو گئی میں اٹھ کر بیٹھا تو کوئی بیس گز کے فاصلے پر دائیں جانب گلزار تیندو کی جھاڑی سے پھل توڑ رہا تھا۔ اور عظمت درخت

دوسری جانب سبزے پر لیٹے آرام سے سو رہے تھے — میں ان دونوں کی غفلت پہ برافروختہ تو بہت ہوا۔ لیکن غلطی خود میری تھی۔ وہ دونوں آدم خور کے معاملے میں قطعاً ناتجربہ کار تھے۔

"گلزار —"

میں نے آواز دی۔

"جی حجور —"

"کمبخت جھاڑی کے پاس سے ہٹ۔"

اور وہ ایسا بوکھلا کر بھاگا جیسے شیر ہی آگیا ہو۔ میں نے اس کو خوب ڈانٹ پلائی۔ عظمت بھی جاگ اُٹھے، میں نے ان کی بھی خبر لی۔ لیکن ان کا کہنا بھی درست تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ اس قدر احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور آدم خور ہر جگہ آسکتا ہے۔

اس وقت کی نیند میرے حق میں بہت مفید ہوئی۔ بخار بھی اتر گیا اور درد بھی جاتا رہا۔ میں زخمی آدم خور سے مقابلے کے لیے پھر آمادہ ہو گیا تھا۔

میں نے ایک کپ کافی اور پی — کافی میں ایک خاصیت ضرور ہے کہ پیاس رفع کرتی ہے اور طاقت دیتی ہے۔ اس کے بعد ہم اسی جگہ آئے جہاں اژدہے سے مقابلہ ہوا تھا — اب اس جگہ اژدہے کے ٹکڑوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ البتہ میرے چار کارتوس گر گئے تھے وہ مل گئے۔ شیر کے خون کا دھبہ بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے گلزار سے کہا وہ شیر کی پسپائی کے نشانات تلاش کرے بہت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھے۔

اب شدید خطرے کا کام شروع ہو رہا تھا۔

زخمی شیر کی تلاش دنیا کا خطرناک ترین کام ہے۔ اور اگر شیر آدم خور بھی ہو تو یقیناً اور زیادہ خطرناک — لوگ خطرناک کام تو بہت سے کرتے ہیں۔ موٹر سائیکل پہ بیٹھ کر دس پندرہ اور بیس بسوں کے اوپر سے جست کرنا، رسے پہ سائیکل چلانا، موٹر

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

موٹر کار کو بیس پچیس کاروں پر اور ٹرکوں پر سے گذارنا ۔ اور بہت سے کام جن سے خودکشی کے آسان پہلو نکلتے ہیں ۔ لیکن زخمی شیر کی تلاش ان تمام کاموں سے زیادہ دشوار اس لئے ہے کہ ہر قدم پر عقل و فراست، تجربہ اور تدابیر پر عمل پیرا ہونا ہوتا ہے ۔ اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ موت کس طرف سے حملہ آور ہوگی ۔

ہم شیر کے نشانات تلاش کرتے ایک نالے کے کنارے آپہنچے ۔ غالباً یہ وہی نالہ ہوگا جس کا میں ذکر کر چکا اور مڑکر اس طرف سے نکلا ہوگا ۔ میں بیان کر چکا ہوں اس نالے میں پانی بھرا ہوا تھا ۔ اور عمق بھی کافی ہوگا ۔ پہاڑی ندیوں اور نالوں میں اگر پانی بھرا ہوا ہو تو بہاؤ اچھا تیز ہوتا ہے ۔ شیر نالے کے اس پار گیا تھا ۔

میں نے گلزار سے پوچھا تیرنا آتا ہے ۔ اس نے نفی میں جواب دیا ۔ اس وقت مجھے نجانے کیوں اس پہ بہت غصہ آیا ۔ میں نے اس سے کہا کہ فوراً ایک بلند درخت پر چڑھ جائے ۔ اور ساتھ ہی کہدیا کہ اگر میری واپسی سے پہلے زمین پر قدم رکھا تو شیر کا لقمہ ضرور نبے گا ۔

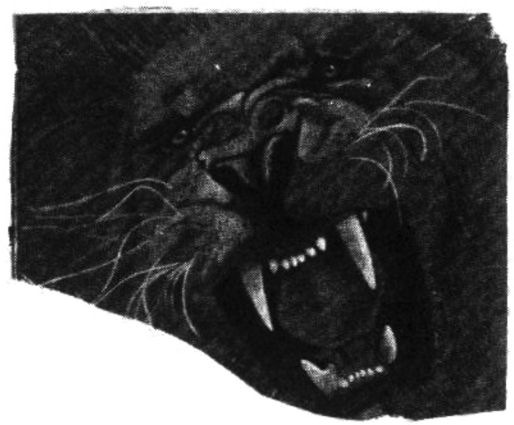

اس نے بندوق میرے سپرد کی اور شکاری جھولا لیکر درخت پر چڑھ گیا ۔

" کیا ارادہ ہے گا خان "

عظمت نے سوال کیا ۔

" پار جائیں گے "

" تم کو ابھی بخار رہا ہیگا خان ۔ اب ٹھنڈے پانی میں اتر رہے ہو گے "

" کوئی بات نہیں ۔ "

میرے اشارے پر عظمت خان نے اپنے کارتوس ٹوپی میں رکھے، اور رائفل

ہاتھ میں سنبھال کر ندی میں اتر گئے ۔ میں رائفل لیے آمادہ رہا کہ شیر اتفاق سے آجائے تو بچ کر نہ جا سکے ۔ پانی پہلے عظمت کی کمر تک تھا پھر سینے تک، اور پھر گردن تک آیا تو عظمت خان سطح آب پہ کائی کی طرح پھیل گئے اور تیر کر دوسری طرف کے کنارے پر چڑھ گئے ۔

اب وہ رائفل سنبھال کر کھڑے ہوئے تو اسی طرح تیر کر پار اترا ۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا ۔ دانت بجنے لگے ۔ دوسرے کنارے پر میں نے کپڑے اور جوتے نچوڑ لئے ۔ عظمت نے بھی یہی کیا ۔ دھوپ تیز تھی ۔ کپڑے ذرا دیر میں ہی سوکھ جاتے ہیں ۔ نچوڑ کر پہن لینا کافی تھا ۔

اس کنارے پر بھی جنگل کی نوعیت کچھ ایسی مختلف نہ تھی ۔ کیتھے، بیل ۔ املی اور شریفے کے ملے جلے درختوں کے ساتھ ہی سال کے بڑے تناور درخت ۔ درختوں کے نیچے جھاڑیاں بھی گھنی ۔

ہم نے کنارے پر سب سے پہلے تو نشانات تلاش کئے ۔ کچھ نشانات مل ہی گئے ۔ جس جگہ ہم نے ندی پار کی تھی اس سے ذرا دور پر ہی شیر کے بیٹھے رہنے اور خون کے بہہ کر گرنے کے نشانات تھے ۔ لیکن اس کے بعد نشانات قطعاً مفقود ۔ کئی بار ہم نے ہر ہر جگہ کا طواف کیا ۔ لیکن بے سود ۔ درختوں پر جو پرندے بیٹھے تھے وہ بھی سکون کے ساتھ ادھر ادھر پھدک رہے تھے ۔ کوئی ایسا پرندہ یا جانور نظر نہیں آیا جس سے شیر کی تلاش کے سلسلے میں کارآمد سمجھا جاتا ۔

شیر جنگل میں گلگشت کے دوران ہمیشہ صاف پگڈنڈیوں یا گذرگاہوں پر چلنا پسند کرتا ہے ۔ کانٹے دار جھاڑیاں، ناہموار راستوں اور کنکر پتھر سے بچ کر نکلتا ہے ۔ اس کے پیر کی گدلیاں نرم ہوتی ہیں ۔ کانٹا بھی چبھ سکتا ہے اور کنکریاں بھی چبھتی ہیں ۔

میں نے عظمت کو شمال مشرق کی طرف جانے کا اشارا کیا ۔ ادھر جھاڑیاں کم تھیں اور شیر کے گذرنے میں کوئی شئے مزاحم نہیں تھی ۔ پیشقدمی کے لئے جن تدابیر اور

http://updf.weebly.com

احتیاطی اقدامات کی ضرورت ہے ان پر ہم دونوں پوری طرح کاربند تھے۔ ممکن نہیں تھا کہ شیر ہماری نظر سے بچ کر چھپا رہتا۔ شیر کے زخم کی نوعیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا۔ اگرچہ زخم مہلک نہیں لیکن گہرا اور خطرناک رہا ہوگا۔ بہت ممکن تھا کہ اگلا شانہ اور ہاتھ بیکار ہو گیا ہو۔ رائفل سے نرم سیسے کی گولی فائر ہوئی تھی جو لگ کر پھیل جاتی ہے۔ اور اگر ہڈی پڑی ہوگی تو ساری ہڈی کو چکنا چور کر دیا ہوگا۔ ایسی حالت میں شیر کو زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا چاہیے۔ مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔ شیر نے فاصلہ بھی کافی طے کیا۔ پھر ندی کو تیر کر پار کیا۔

شیر کی عظیم برداشت اور غیر معمولی طاقتوں کے پیشِ نظر یہ حرکت ممکن نہیں تھی۔

ایک دفعہ میں نان پارے میں شکار کی غرض سے اپنے ایک عزیز۔ محمد انوار صاحب کے گھر مقیم تھا۔ سہ پہر کو ہم لوگ شطرنج کھیل رہے تھے۔ اسی دوران ایک زمیندار کی آمد کی اطلاع کی گئی۔ انھوں نے بیان کیا کہ ذرا ہی دیر قبل نواحی بستی سے شیر ان کی اونٹنی کو پکڑ کر لے گیا۔ وہ انوار صاحب سے مدد کی درخواست کے لیے آئے تھے۔

نان پارے میں اونٹ کا کیا کام — شیر کو بھی یہ بات فضول معلوم ہوئی ہوگی تب ہی اس نے اس خلاف واقعہ صورت کے تدارک کے لیے اونٹنی کو ہلاک کیا۔ بھلا شیر کو اونٹنی اور کسی وجہ سے مارنے کی کیا پڑی تھی۔ دوسرے بے شمار جانور کون سے کم تھے۔

اس اونٹنی کی بازیافت اس لیے لازمی تھی کہ صاحبِ اونٹ نے (صحیح لفظ ہونا چاہیے "صاحب الجمل") اپنی اونٹنی کو سونے کی نتھ۔ کانوں میں سونے کے بندے اور گردن میں سونے کی گھنٹی پہنائی تھی۔ اونٹنی کو شیر بیشک کھا جاتا کوئی بات نہیں تھی لیکن زیور تو واپس دے جاتا۔ اونٹنی والے نے یہی کہا۔

میں نے ایسی عجیب بات پہلے نہیں سنی تھی۔ تعجب ہوا — خیال یہ بھی ہوا کہ اونٹ کا بچہ ہوگا۔ لیکن تفتیش سے معلوم ہوا کہ جوان اور بہت فربہ اونٹنی تھی۔ محض اس بات نے میرے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا۔ میں انوار کو ساتھ لیے

وہاں آ پہنچا جہاں شیر نے اونٹنی کو مارا اور کھینچ کر لے گیا۔ اس مقام سے چار سو گز پر ایک نالا ہے جو پانی سے بھرا ہوا تھا — شیر نے اس نالے کو مع اونٹنی کود کر پار کیا۔ یہ بذاتِ خود قوت کا ایک نہایت عجیب کرتب تھا — میں سمجھتا ہوں اونٹنی کا وزن ستر سے سو کیلوگرام تک ہوگا۔

شیر نے لاش کو گھسیٹنے کے لیے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ نالہ پار کرنے کے بعد جھاڑیاں بکثرت تھیں، یوں بھی نان پارہ ہمالیہ کی ترائی کا علاقہ ہے اور گھنے جنگل، جھاڑ جھنکاڑ، سبزہ و پہاڑ اس علاقے کی خصوصیات ہیں۔

غرض شیر نالے کے ساتھ ساتھ کوئی چھ سو گز لاش کو لے گیا۔ اس کے بعد ساتھ کی ایک پہاڑی پر چڑھ گیا، جس راہ سے شیر اونٹنی کو لے کر پہاڑ پر چڑھا تھا وہاں ہم کو چڑھنے کے لیے بار بار پیروں کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کی مدد بھی لینا پڑی۔ بہرحال پہاڑ کے اوپر ایک سایہ دار جگہ پر اونٹنی کی لاش ملی جو میرے قیاس سے بھی بڑی اور وزنی ثابت ہوئی۔ گویا شیر نے اونٹنی کو جائے واردات سے ایک میل دور لے جا کر کھایا۔

اتنی فربہ اور وزنی اونٹنی کی لاش کو نالے پر گدانا۔ پھر کھینچ کر پہاڑ پر لے جانا کس قدر غیر معمولی طاقت کا کام ہے۔ اس کا صرف قیاس کیا جا سکتا ہے۔

لیکن شیر سے اس قسم کی حیرت میں ڈالنے والی حرکات کا سرزد ہونا کچھ عجیب نہیں۔

غرض عظمت اور میں ہر کوشش کر کے عاجز ہو گئے۔ سورج نے اپنا رختِ سفر باندھا تو ہم بھی واپس ہوئے۔ گلزار کو درخت سے اتار کر ساتھ لیا۔ اور مغرب کی نماز کے وقت گاؤں واپس پہنچ گئے۔ شیر پال اور گاؤں کے دوسرے لوگ کسی نئے حادثے کی خبر سننے کے منتظر تھے۔ اور جب ان کو بتایا گیا کہ اس دن کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہوا تو دیہاتیوں کو مایوسی ہوئی۔

ہندو تو نجانے کیوں شیر کی پرستش نہیں کرتے۔ ویسے تو ہر قسم کے

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

حشرات الارض، جانور، ستارے سورج اور اینٹ پتھر تک کی پوجا کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار ٹرین میں سفر کے دوران صبح کے وقت ایک ہندو کو پوجا کرتے دیکھا۔ اس نے فریم میں لگی ہوئی چھ یا زیادہ ہاتھوں والے دیوتا کی تصویر سامنے رکھی۔ اس نام نہاد دیوتا کی ناک بڑھ کر ہاتھی کے سونڈ جیسی ہوگئی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنا کر سانپ سے باندھا گیا تھا۔ سانپ بھی پھن اُٹھائے تھا، کیا حماقت کی بات ہے ـــ دیوتا کو اس نفرت انگیز شکل میں ظاہر ہونے کی کیا ضرورت ـــ اور خوبی یہ کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوجانے کے بعد بھی اپنی حماقت ان کو نظر نہیں آتی۔

شیر پال کے اعتقادات میں اس روز ایک تنزل معلوم ہوا۔ اور اسی کے تحت انھوں نے کچھ دیر آدم خور کے بارے میں تبادلہ خیال بھی کیا۔

انھوں نے بتایا کہ جس علاقے میں ہم نے شیر کو زخمی کیا اور تلاش کرتے رہے وہ عام طور سے اسی علاقے میں رہتا ہے۔ یہ بات انھوں نے اب تک قطعی نہیں بتائی تھی۔

دوسرے روز صبح جب میں نکلا تو گلزار کو ساتھ نہیں لیا۔ عظمت تیار تو ہوگئے لیکن میری طرف بار بار دیکھتے رہے سوچتے ہوں گے شاید میں ان کو بھی لے جانے سے انکار کردوں ـــ حقیقت یہ ہے میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ بھی ساتھ نہ جائیں۔ کئی بار میں نے کہنے کا ارادہ بھی کیا ـــ پھر کچھ مروت آگئی۔ اور چپ رہ گیا۔ لہٰذا عظمت ساتھ ہو گئے۔

میری طبیعت اس روز بالکل صحیح تھی۔ ہاتھ کے زخم میں کسی قدر تکلیف تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ اس روز مجھ کو کامیابی کی امید نظر آتی تھی۔

عظمت کو حسب معمول آگے آگے چلنے کی تاکید کرکے، ہم آبادی سے نکلے اور سیدھے اسی طرف گئے جہاں شیر زخمی ہوا تھا۔ جنگل میں تبدیلی کم آتی ہے۔ انقلابات تو شہروں اور آبادیوں میں آتے ہیں۔ جنگل کے پرسکون ماحول میں تغیر کا کیا کام۔

مادھوپور کے علاقے میں سانبھر بکثرت ہیں۔ اور شیر پال نے وعدہ کیا تھا اگر شیر شکار ہوگیا تو پھر وہ سانبھر کے شکار کا اہتمام کریں گے۔

اتفاق کی بات ہم نے ابھی نالہ پار ہی کیا تھا۔ سامنے گھاس پر نظر پڑی تو ایک کان ہلا ساتھ ہی سانبھر کی شکل ـــ پھر سینگ نظر آئے ـــ گھاس میں سانبھر اگر ساکت کھڑا ہو تو ایسا چھپ جاتا ہے کہ تمیز ہی نہ ہوسکے۔ وہ تو مکھیاں بلکہ چیچڑیاں تنگ کرتی ہیں تو مجبور ہوکر کان یا سر ہلانا پڑتا ہے۔ اور جنبش ہی اس کی کمین گاہ کی غمازی کردیتی ہے۔

جس گھاس میں سانبھر چھپا کونپلیں چن رہا تھا وہ چھ سات فٹ اونچی تھی۔ میں وہاں کھڑا ذرا دیر اس کو دیکھتا رہا۔ اور یکبارگی میرے ذہن میں کوندا سا ہوا۔ شیر کو اٹھانے کی ایک انوکھی تدبیر ذہن میں آئی ـــ اگر شیر اس گھاس کے قطعے میں ہی ہو تو سانبھر کے بدحواس بھاگنے سے خود بھی گھبرا کر اُٹھے گا۔ جس طرف بھی سانبھر بھاگ کر جائے اگر کوئی واقعہ نہ ہو تو گویا اس سمت شیر کو تلاش کرنا بیکار ہے۔ اور اس طرح تضیع اوقات سے ہم بچ جاتے۔

سانبھر اب کس طرف بھاگیگا۔ یہ جدا بات تھی۔

میں نے عظمت کو اشارہ کیا۔ ہم سیدھے اسی کی طرف بڑھے۔ اور گھاس کے قریب پہنچ کر ابھی میں کوئی حرکت کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سانبھر نے گردن اونچی کرکے ہمیں دیکھا ـــ صرف چند گز کے فاصلے پر۔ اور اس کو نجانے کیا سوجھی کہ یکبارگی ہم پر حملہ کردیا۔ جس طرح بیل یا بھینسا سر جھکا کر سینگ نیچے کرکے حملہ کرتے ہیں بالکل اسی طرح۔

عظمت اور میں بوکھلا کر اچھلے اور ایک طرف ہٹ گئے ـــ سانبھر اپنے زور میں سیدھا بھاگا چلا گیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا ـــ اس کا رخ جنوب کی جانب تھا۔

ہم دونوں کھڑے احمقوں کی طرح اس دیکھتے رہے۔ ابھی بھاگتا ہوا سانبھر کوئی پچاس گز گیا ہوگا ـــ فوراً ہی شیر کے حملے کی زبردست آواز سے جنگل لرز اُٹھا۔ ایک جھاڑی سے شیر نکلا اور چشم زدن سے بھی کم عرصے میں سانبھر زمین پر گرا نظر آیا ـــ حقیقت یہ ہے شیر کے حملے، سانبھر کو پکڑنے اور سانبھر

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)

http://updf.weebly.com

کے زمین پر گرنے تک کی جو حالت میں نے بیان کی اس کا وقوع اتنا سریع ہوا جسے چشم زدن کی مدت ہی کہا جا سکتا ہے۔

ہم نے تو صرف یہ دیکھا شیر نے سانبھر کی گردن اوپر کی طرف سے پکڑی اور اس طرح جھول گیا کہ سانبھر اپنے زور میں ہی گر کر زمین پر گھسٹتا چلا گیا۔ غالباً گردن ٹوٹ گئی ہو گی۔ اس نے جنبش بھی نہیں کی۔

سانبھر کے گرتے ہی شیر نے اس کے جسم پر دونوں پنجے رکھ کر سر اٹھایا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ ٹوٹ کر بیکار تھا۔ شانے پر جما ہوا خون اور کھلا ہوا زخم صاف نظر آتا تھا۔

میں نے اسے نظر پڑتے ہی نشانے پر لے لیا۔ اس کے شانے اور گردن کا جوڑ گولی کی زد میں آ گیا۔ اب میں آہستہ سے کھنکھارا — فوراً ہی شیر نے اس طرف دیکھا۔ اللہ اکبر۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے ان کے اثر سے مجھے جھرجھری آ گئی۔

دوسرے ہی لمحے چار سو پچاس ایکسپریس کی زبردست گولی عین ہدف پر لگی۔ اور اس کی گردن کے پرخچے اڑ گئے۔ شیر سانبھر کے پہلو میں ہی گر گیا۔ اگر ہم فوراً قریب جا سکتے تو سانبھر کو ذبح کر سکتے تھے۔ لیکن اصول کے مطابق آدھا گھنٹہ انتظار ضروری تھا۔ یہ وقت گذار کر میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

عظمت کو گاؤں بھیجا کہ لوگوں کو بلا کر لائیں اور شیر کی لاش لے چلیں انہوں نے بعد میں بتایا کہ جب وہ اکیلے گاؤں پہنچے اور لوگوں کو شیر کی ہلاکت کی اطلاع دی تو دیہاتیوں نے ان کو دیوانہ خیال کیا۔ وہ سمجھے شیر نے شکاری صاحب کو مار دیا اور عظمت میاں کو پاگل کر دیا۔ شیر کے مارے جانے کا وہ خیال ہی نہیں کر سکتے تھے۔ آخر شیر پال نے ان کو یقین دلایا تب بات بنی اور وہ لوگ جنگل میں جانے پر راضی ہوئے۔

شِکارنامہ

وہ شکار ہی کیا جس میں کوئی خطرہ کوئی جدوجہد کوئی فکر و نظر کی دقت شامل نہ ہو، انسان کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا کچھ نہ کچھ تو امتحان اور استعمال ہو — وقت کی گداز بانہوں میں سرشار حیات رہنے والوں کے لیے تھوڑا ہنگام عمل اُن کی انسانیت اور جذبۂ بشریت کے لیے تجدیدی دَور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ارتقا کا تقاضا یہی ہے کہ جمود پیدا نہ ہونے پائے، تحریک کا عمل جاری رہے اور اس عمل تحریک میں ہی بقا کا راز پوشیدہ ہے اور شکار سے بہتر ذریعۂ تحریک اور کیا ہو سکتا ہے۔

شکارنامہ ایک خوبصورت اور رنگین تصاویر سے مزین کتاب — حیرت انگیز بھیانک اور لرزہ خیز شکاری قصے •

مقبول اکیڈمی
۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی لاہور

Anees-ur-Rehman (aneesssuet@gmail.com)